زیرِ نظر

اُستادِ محقّق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۳

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حُسین نجفی رح

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ



فہرست مضامین













۹۲ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ○

ترجمہ

۹۲۔ تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

تفسیر

ایمان کی ایک نشانی

لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبون لفظ "بِرّ" عربی زبان میں وسعت کا ہم معنیٰ ہے اسی لیے وسیع صحرا کو "بَرّ" (با کی فتح کے ساتھ) کہا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے ان نیک کاموں کو بِرّ (با کی زیر کے ساتھ) کہتے ہیں جن کا ثمرہ و نتیجہ عام اور وسیع ہو اور دوسروں تک پہنچے "بِر" اور "خیر" کے درمیان لغت عرب کے لحاظ سے یہ فرق ہے کہ "بِر" وہ نیک کام ہوتا ہے جو توجہ اور قصد و اختیار کے ساتھ ہو لیکن "خیر" ہر قسم کی نیکی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی توجہ اور التفات کے بغیر ہی ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے تم لوگ اس وقت تک "بِر" اور نیکی کی حقیقت کو نہیں پا سکتے جب تک اس چیز میں سے راہ خدا میں خرچ نہ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔

اس آیت میں لفظ "بِر" کے متعلق مفسرین حضرات نے تفصیلی گفتگو کی ہے بعض نے اس کا معنی بہشت بتایا ہے اور بعض کے نزدیک یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہم معنی ہے جب کہ ایک زمرۂ مفسرین نے اس سے نیک جزا مراد لی ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے جو مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بِر ایک وسیع معنی میں ہے جس میں تمام نیکیاں خواہ ایمان ہو یا پاک عمل شامل ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ،، اسے معلوم ہوتا ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

یعنی ـــــ نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف پھیر لو۔ نیک لوگ تو وہ ہیں جو اللہ، یوم آخرت، ملائکہ، کتاب اور انبیاء پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں اور فقیروں کو (اپنا) مال دیا اور اسی طرح مسافروں کے لیے، سوال کرنے والوں کے لیے اور غلاموں کو آزاد کروانے کے لیے اپنا مال خرچ کیا، نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور جب وہ عہد کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں اور وہ فقر، بیماری اور جنگ



میں صبر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ راستباز اور پرہیزگار ہیں۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروردگارِ عالم، روزِ جزا اور انبیاء و مرسلین پر ایمان لانا، حاجتمندوں کی مدد کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، عہد پورا کرنا اور مشکلات و حوادث کا استقامت اور پامردی سے مقابلہ کرنا یہ سب بِر کے شعبے شمار ہوتے ہیں۔

بنا بریں حقیقی نیک لوگوں کا مقام حاصل کرنے کے لیے بہت سی شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط ان اموال میں سے راہ خدا میں خرچ کرنا ہے جن سے انسان کا دل لگاؤ ہو کیونکہ خدا کے ساتھ حقیقی عشق و محبت اور اصول انسانیت و اخلاق کا احترام اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب انسان ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہو جہاں ایک طرف مال و ثروت یا مقام و منصب ہو جو کہ انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس کے مقابلے میں دوسری طرف خدا، حقیقت، انسانی ہمدردی اور نیکوکاری ہو۔ اگر اس نے پہلی جانب سے صرف نظر کرتے ہوئے دوسری جانب کو اختیار کیا تو اس سے اُس کے عشق اور لگاؤ کا علم ہو سکتا ہے۔

آیات قرآنی کا مسلمانوں کے دلوں پر اثر

قرآن کریم کی آیات کا مسلمانوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر ہوتا تھا کہ آیات کے نازل ہوتے ہی ان کے اثرات ظاہر ہو جاتے تھے۔ اسی ضمن میں مذکورہ آیت کے متعلق تواریخ اور اسلامی تفسیروں میں یہ واقعات لکھے گئے ہیں:

۱۔ ایک صحابی رسول ابوطلحہ انصاری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ میں اس کا کھجوروں کا ایک بہت ہی صاف ستھرا اور خوبصورت باغ تھا۔ پورے مدینہ میں اس کا چرچا تھا۔ اس باغ میں صاف و شفاف پانی کا ایک چشمہ بھی تھا۔ جس وقت پیغمبر اکرمؐ اس باغ میں تشریف لاتے تو وہ پانی نوش فرماتے اور اس سے چلو بھرتے۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابوطلحہ اس سے بہت زیادہ آمدنی حاصل کرتا تھا۔

آیت بر کے نزول کے بعد وہ آنحضرتؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ میرے اموال میں سے میرے نزدیک زیادہ محبوب صرف یہی باغ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے راہ خدا میں خرچ کر دوں تاکہ یہ میرے لیے توشۂ آخرت بنے یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

بَخٍ بَخٍ ذٰلک مالٌ رابحٌ لک۔

آفرین۔ آفرین تجھ پر یہ ایسی ثروت ہے کہ جو تیرے لیے نفع مند ہوگی۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا میرا مشورہ ہے کہ اسے اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔ ابوطلحہ نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی اور اسے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا[1]۔

۲۔ ایک دن ابوذر کے ہاں ایک مہمان آیا ابوذر انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے مہمان سے معذرت طلب کی کہ میں اپنی ابتلاء کی وجہ سے خود تیری پذیرائی نہیں کر سکتا میرے چند اونٹ فلاں مقام پر موجود ہیں زحمت کر کے ان میں سے ایک بہترین اونٹ لے آؤ (تاکہ اسے تمہارے لیے نحر کر دوں)۔ وہ ایک کمزور اونٹ لے آیا۔ جناب ابوذر نے اس سے کہا کہ تو نے میرے ساتھ خیانت کی، یہ اونٹ کس لیے لے کر آئے ہو؟ اس نے جواب دیا میں نے یہ سوچا کہ دوسرے اونٹوں کی کبھی آپ کو ضرورت پڑے گی۔ تو ابوذر نے کہا کہ مجھے

---

[1] مجمع البیان، صحیح مسلم و بخاری۔



ان کی اس وقت کے لیے ضرورت ہے جب میری آنکھیں اس جہان فانی سے بند ہوں گی (کیا ہی اچھا ہے کہ اس دن کے لیے سامان کروں)۔

خدا فرماتا ہے کہ:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون

۳ ہارون رشید کی زوجہ زبیدہ کے پاس قرآن مجید کا ایک بہترین قیمتی نسخہ تھا جو زر و جواہرات سے مزین و مرصع تھا اور وہ اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ ایک روز وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے جب آیہ "لن تنالوا البر" پر پہنچی تو آیت پڑھتے ہی وہ ورطہ حیرت میں پڑ گئی اور اپنے دل میں خیال کرنے لگی کہ اس قرآن مجید سے میرے نزدیک کوئی چیز بہتر نہیں ہے لہٰذا اسے راہ خدا میں خرچ کرنا چاہیے اس نے جواہر فروشوں کو بلوا کر اس کی زیب و زینت کی چیزیں اور جواہرات فروخت کر دیے اور ان کی قیمت سے حجاز کے بیابانوں میں بادیہ نشینوں کے لیے پانی مہیا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ آج بھی ان میں سے کچھ کنوئیں موجود ہیں اور اسی کے نام سے منسوب ہیں۔

۹۳ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا۟ بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَآ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ○

۹۴ فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ○

۹۵ قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا۟ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○

ترجمہ

۹۳ تمام (پاک) غذائیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں سوائے ان کے جنہیں اسرائیل (یعقوب) نے تورات کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام قرار دیا تھا (مثال کے طور پر اونٹ کا گوشت جو ان کے لیے ضرر رساں تھا) ان سے کہو اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو تو لاؤ تورات اور اسے پڑھو (یہ غلط باتیں جو تم گذشتہ انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہو تمہاری تحریف شدہ تورات میں بھی نہیں ہیں)۔

۱؎ مجمع البیان، جلد ۲، صفحہ ۴۷۴۔



۹۴ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی گھڑی ہوئی جھوٹی باتیں خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں (اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں) وہی درحقیقت ظالم ہیں۔

۹۵ کہہ دو، اللہ نے سچ فرمایا (اور یہ ابراہیم کے پاک دین میں نہیں تھا) لہٰذا تم یکسو ہو کر ابراہیم کے آئین کی پیروی کرو جو حق پسند تھے اور یقیناً ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

شانِ نزول

مفسّرین کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں نے پیغمبر اکرمؐ پر خصوصیت کے ساتھ دو اعتراض کیے تھے:

۱ پیغمبر اسلامؐ نے اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام کیوں قرار نہیں دیا جبکہ یہ نہ صرف ابراہیمؑ بلکہ حضرت نوحؑ کے دین میں بھی حرام تھے اور ان کی پیروی کرتے ہوئے یہودی بھی اسے حرام سمجھتے تھے۔

۲ رسول اسلام کیونکر گذشتہ انبیاء خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کے وفادار ہو سکتے ہیں حالانکہ تمام پیغمبر بیت المقدس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ لیکن ختمی مرتبت نے اس کی بجائے کعبہ کو قبلہ بنالیا۔

مندرجہ بالا آیات میں ان کی پہلی بات کا جواب دیا گیا ہے اور آئندہ آیات ان کے دوسرے اعتراض کا جواب دیں گی۔

تفسیر

کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ

مندرجہ بالا آیت مکمل وضاحت کے ساتھ یہودیوں کے اُن خیالات کو رد کرتی ہے جو وہ کھانے کی پاک اور حلال اشیاء (مثلاً اونٹ کا دودھ اور گوشت) کے متعلق رکھتے تھے۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ابتداء میں یہ تمام اشیاء بنی اسرائیل کے لیے حلال و جائز تھیں سوائے اُن اشیاء کے جن کو اسرائیل (یہ حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام تھا) نے اپنے اُوپر حرام قرار دی تھیں۔ اس آیت میں اس بات کی نشاندہی نہیں کی گئی کہ حضرت یعقوبؑ نے کونسی غذا کس سبب سے حرام قرار دی تھی لیکن روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ اونٹ کا گوشت کھاتے تو آپ پر عرق النساء[1] کا شدید حملہ ہوتا۔ لہٰذا انہوں نے اس غذا سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کرنے کا ارادہ کرلیا اور آپ کی اتباع میں آپ کے پیروکاروں نے بھی اس سے اجتناب کیا اور یہ بات ان کے اذہان میں پختہ ہوگئی لہٰذا انہوں نے اسے حرام سمجھا اور اسے ایک دینی حکم کی طرح خدا کی طرف منسوب کیا۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیت نے اُن کے اس خیال کو غلط قرار دیا اور یہ واضح کیا کہ یہ صرف اُن کی تہمت ہے۔

---

[1] عرق النساء ایک اعصابی مرض ہے اس کی وجہ سے کمر اور پاؤں کے اعصاب میں تکلیف ہوتی ہے جس سے بعض اوقات انسان چل پھر نہیں سکتا۔



اس آیت کے دوسرے حصہ "من قبل ان تنزل التوراۃ" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ تورات سے پہلے کوئی پاکیزہ غذا بنی اسرائیل پر حرام نہ تھی۔ البتہ تورات کے نازل ہونے اور حضرت موسیٰؑ کی آمد کے بعد یہودیوں کے ظلم و ستم کے نتیجہ میں کچھ پاک چیزیں اُن پر حرام کر دی گئیں۔

قل فأتوا بالتوراة فاتلوها ان كنتم صٰدقين

اس جملے میں خداوند عالم نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ یہودیوں کو دعوت دیں کہ وہ اسی موجودہ تورات کو لے آئیں اور اسے کھول کر پڑھیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان اشیاء کی حرمت کے بارے میں ان کا دعویٰ غلط ہے۔ لیکن وہ اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ تورات میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں ہے اور یہ صرف ان کی تہمت ہے۔

فمن افترى على الله الكذب من بعد ذٰلك فاولٰئك هم الظٰلمون

جب وہ لوگ تورات کو لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور خدا پر ان کا بہتان باندھنا مسلّم ہو گیا تو اس آیت میں انہیں خبردار کیا گیا کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ظالم و ستمگر ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو خدائی سزا اور عذاب میں گرفتار کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ جھوٹ اور مکر و فریب سے اور لوگوں کو بھی سیدھی راہ سے بھٹکا کر دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔

موجودہ تورات اور گوشت کی حرمت

موجودہ تورات سفر "لاویان" گیارھویں فصل میں حلال و حرام گوشت کے بارے میں اس طرح کا حکم موجود ہے:

جگالی کرنے والے اور پھٹے ہوئے سُم والے جانوروں کو نہ کھاؤ اور اونٹ باوجود یہ کہ وہ جگالی کرتا ہے مگر اس کا سُم پھٹا ہوا نہیں ہے، وہ تمہارے لیے حرام ہے۔

مذکورہ جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اونٹ کا گوشت اور باقی پھٹے ہوئے سُم والے جانوروں کو حرام جانتے تھے۔ لیکن دین ابراہیمؑ اور نوحؑ میں ان کی حرمت پر کسی قسم کی دلیل نہیں ملتی۔ ممکن ہے یہ چیزیں اُن غذاؤں میں سے ہوں جو یہودیوں پر سزا کے طور پر حرام کی گئی ہوں۔

قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين

جب تم نے دیکھ لیا کہ میں اپنی دعوت میں سچا اور راست گو ہوں تو تم میرے دین کی پیروی کرو جو کہ ابراہیمؑ کا پاک اور بے آلائش دین ہے۔ کیونکہ وہ حنیف تھا یعنی باطل ادیان کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل تھا اور اس کے احکام میں پاک غذاؤں کے متعلق ایک حکم بھی انحرافی اور بے دلیل نہیں تھا اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہیں تھا اور یہ جو مشرکین عرب اپنے آپ کو دین ابراہیمؑ کا پیرو سمجھتے ہیں بالکل لغو اور بے معنیٰ ہے۔ بت پرست کہاں اور بت شکن کہاں۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر اس جملہ کو دہرایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ مشرکین میں سے نہیں تھے۔ کیونکہ پہلے ہی اشارہ کیا گیا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے بت پرست اپنے آپ کو دین ابراہیمؑ کا پیرو سمجھتے تھے اور وہ اس دعویٰ میں اتنے سخت تھے کہ دوسرے لوگ حنفاء (ابراہیمؑ کے پیروکار) کے طور پر ان کا تعارف کراتے تھے۔ اس لیے قرآن بار بار اس بات کی نفی کرتا ہے۔



۹۶ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعٰلَمِينَ ۝

۹۷ فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ ۚ وَمَن دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ ۝

ترجمہ

۹۶ پہلا گھر جو لوگوں (اور خدا سے تضرع وخضوع) کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ سرزمین مکہ میں ہے جو بابرکت ہے اور دنیا کے لیے ہدایت و رہبری کا سبب ہے۔

۹۷ اس میں واضح و آشکار نشانیاں ہیں۔ ان میں سے مقام ابراہیم ہے اور جو شخص اس میں داخل ہو وہ امان میں ہے اور جو لوگ اس کی طرف جانے کی قدرت رکھتے ہیں ان پر واجب ہے کہ وہ خدا کے لیے (اس کے) گھر کی زیارت کریں اور جو کوئی کفر کرے (حج ترک کرے۔ اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا، تو پھر) خدا تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

تفسیر

لوگوں کے لیے پہلا گھر

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا۔

جیسا کہ گذشتہ آیات کے ضمن میں کہا جا چکا ہے کہ یہودیوں کو پیغمبر اسلامؐ پر دو اعتراض تھے جن میں سے پہلے کا جواب اُن آیات میں دیا گیا ہے۔ دوسرا اعتراض اُن کو یہ تھا کہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ پر برتری حاصل ہے۔ اس کا جواب مندرجہ بالا آیات میں دیا جا رہا ہے آیت بتلا رہی ہے کہ اگر کعبہ کو مسلمانوں کے قبلہ کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ چونکہ روئے زمین پر وجود میں آنے والا یہ خدا کا پہلا گھر اور سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔ اس سے قبل دعا اور پروردگارِ عالم کی عبادت کا کوئی مرکز نہیں تھا۔ صرف یہی ایسا گھر ہے جو انسانی معاشرہ کے لیے ایسے نقطہ پر وجود میں لایا گیا ہے جو اجتماعیت کا مرکز ہے اور پُر برکت مقام ہے۔
اسلامی تاریخ کے مصادر بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ حضرت آدمؑ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ جب طوفانِ نوحؑ



میں اسے کچھ نقصان پہنچا تو حضرت ابراہیمؑ نے اسے از سرِ نو تعمیر کیا۔ بنا بریں قبلہ کی حیثیت سے اس پہلے خانۂ توحید کا انتخاب دوسرے ہر مقام سے زیادہ مناسب ہے۔ البتہ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں خانۂ کعبہ جس کا دوسرا نام بیت اللہ ہے کا تعارف لوگوں کے گھر کے طور پر کرایا گیا ہے۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جو کچھ خدا کے نام پر ہے اور اس کے لیے ہے اسے لوگوں اور اس کے بندوں کی خدمت کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور جو کچھ بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے ہے وہ خدا کے لیے ہے۔

اس آیت سے ضمنی طور پر خدا کے اصلاحی پروگراموں میں سبقت کرنے کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو آیتِ بالا میں خانۂ کعبہ کی پہلی فضیلت اس کا سب سے پہلا ہونے کو قرار دیا گیا ہے۔ یہیں سے حجرِ اسود کے احترام کے بارے میں ہونے والے اعتراض کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس پتھر کے ٹکڑے کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے کہ سارا سال کئی لاکھ انسان اس کا بوسہ لینے اور اسے مس کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کام کو ایک تاکیدی مستحب کے طور پر کیوں خانۂ کعبہ کی زیارت کے پروگرام میں شامل کیا گیا؛ لیکن اس پتھر کی مختصر تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو پوری دنیا کے کسی پتھر میں پیدا نہیں ہو سکتی اور وہ یہ کہ یہ ایک انتہائی سابق ترین چیز ہے جو عمارتی مصالح کے طور مرکزِ عبادت میں نصب کی گئی ہے۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ صفحۂ ہستی کی تمام عبادت گاہوں یہاں تک کہ خانۂ کعبہ کی بھی بارہا از سرِ نو تعمیر ہوئی ہے اور جو مصالح ان کی تعمیر میں لگائے گئے وہ تبدیل ہو گئے صرف یہی پتھر کا ٹکڑا ہے جو ہزارہا سالوں کے گذرنے کے باوجود ابھی تک اس قدیم ترین عبادت گاہ میں اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس لیے دراصل اس کی اہمیت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ خدا کی راہ میں اور لوگوں کی خدمت میں سب سے قدیم ہے۔

علاوہ ازیں یہ پتھر مختلف زبانوں کے مؤمنین کی بے شمار نسلوں کی ایک خاموش تاریخ ہے۔ یہ پتھر عظیم انبیاءؑ اور خدا کے خاص بندوں سے وابستگی کی یاد کو زندہ کرتا ہے جنہوں نے اس کے پاس کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں دعا اور تضرع و زاری کی ———

اس مقام پر ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ گذشتہ آیت یہ بتلا رہی ہے کہ کعبہ سب سے پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بنایا گیا۔ یہ واضح ہے کہ اس سے مقصود عبادت و پرستش کا پہلا گھر ہے۔ لہٰذا اس آیت سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے رہائش کے کچھ گھر زمین میں موجود ہوں اور یہ تعبیر ان لوگوں کا واضح جواب ہے جو (تفسیر المنار کے مؤلف کی طرح) کہتے ہیں کہ خانۂ کعبہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں بنا ہے اور وہ حضرت آدمؑ کے ہاتھ سے بننے کو ایک افسانہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسلّم ہے کہ ابراہیمؑ سے قبل بھی عبادت گاہ اور پرستش کی جگہ موجود تھی اور ان سے پہلے حضرت نوحؑ کی طرح دیگر انبیاء اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس بنا پر یہ کیسے ممکن ہے کہ خانۂ کعبہ جو کہ دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سب سے پہلے بنا ہو۔

"بکّہ" سے کیا مراد ہے؟

"بکہ" اصل میں "بک" (بروزن "فک") کے مادہ سے ازدحام اور اجتماع کے معنیٰ میں ہے اور خانۂ کعبہ یا وہ زمین جس میں خانۂ کعبہ موجود ہے اسے "بکہ" یہاں لوگوں کے ازدحام اور اجتماع کی وجہ سے کہا جاتا ہے یہ بھی بعید نہیں کہ پہلے اس کا یہ نام نہ ہو لیکن جب یہ عبادت کے لیے قائم ہو چکا ہوا سے یہ نام دیا گیا ہو۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں منقول ہے کہ مکہ پورے شہر کا نام ہے اور بکہ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں خانۂ کعبہ بنا ہوا ہے۔



بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ بکہ دراصل مکہ ہی ہے اور اس کی "میم" یہاں "باء" سے بدل گئی ہے جیسے "لازم" اور "لازب" دونوں عربی زبان میں ایک ہی معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں۔

خانہ کعبہ اور اس کی زمین کو بکہ کے ساتھ موسوم کرنے کے سلسلہ میں ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس لفظ کا معنیٰ ہے نخوت وغرور کو دور کرنا۔ چونکہ اس عظیم مرکز میں ہر قسم کے امتیازات یکسر ختم ہو جاتے ہیں اور سرکش ومغرور لوگوں کو بھی یہاں عام لوگوں کی طرح تضرع وزاری کے لیے کھڑا ہونا چاہیے اس طرح ان کا تکبر وغرور ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو بکہ کہا جاتا ہے۔

مسجد الحرام کی توسیع

پیغمبر اسلامؐ کے زمانے سے لے کر جس قدر مسلمان بڑھتے گئے تو فطری طور پر خانہ کعبہ کے زائرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لہٰذا حکامِ وقت کی طرف سے مسجد الحرام کی بھی توسیع ہوتی رہی۔

تفسیر عیاشی میں منقول ہے کہ عباسی خلیفہ منصور کے زمانے میں حجاج کی کثرت کی بنا پر پروگرام بنایا گیا کہ ایک دفعہ پھر مسجد الحرام کو وسیع کیا جائے۔ خلیفہ نے ان لوگوں کو بلایا جن کے گھر مسجد کے اردگرد تھے تاکہ ان کے گھر خرید لیے جائیں لیکن وہ کسی قیمت پر بھی انہیں بیچنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ منصور بڑی مشکل میں گرفتار ہوا کیونکہ ایک طرف وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ طاقت کے زور سے ان کے گھر خراب کرے کیونکہ اس کا اچھا اثر نہ ہوتا اور دوسری طرف وہ لوگ اپنے گھر دینے کے لیے تیار بھی نہ تھے۔ اس سلسلے میں اس نے حضرت امام صادقؑ سے استفسار کیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اس بارے میں چنداں فکر کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں واضح دلیل موجود ہے جس سے تم استدلال کر سکتے ہو۔ اس نے پوچھا وہ کونسی دلیل ہے۔ فرمایا کلامِ خدا۔ پوچھنے لگا کلامِ الٰہی میں کہاں سے استدلال لایا جا سکتا ہے؟ آپؑ نے فرمایا کہ آیت "ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکا" سے استدلال کیا جا سکتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ خانہ کعبہ ہے۔ اس لیے اگر خانہ کعبہ سے پہلے ان کے گھر یہاں موجود ہوتے تو خانہ کعبہ کے اطراف ان کی ملکیت میں ہوتے لیکن اگر خانہ کعبہ ان سے پہلے ہے تو یہ حریم (جہاں تک خانہ کعبہ کے زائرین کی ضرورت ہے) کعبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ منصور نے ان لوگوں کو بلوا کر ان کے سامنے اسی انداز سے استدلال کیا وہ یہ سن کر لاجواب ہو گئے اور کہنے لگے جس طرح آپ کی مرضی ہو ہم آپ کی موافقت کریں گے۔

اسی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ اس قسم کا واقعہ مہدی عباسی کے دور میں پیش آیا۔ اس نے اس دور کے فقہاء سے رجوع کیا۔ ان سب نے کہا کہ اگر گھروں کے مالک اس پر راضی نہ ہوں تو غصب شدہ جگہ کو مسجد الحرام میں داخل کرنا مناسب نہیں۔ علی ابن یقطین نے اس مسئلہ کو حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ سے حل کرانے کے لیے اجازت چاہی۔ مہدی نے والی مدینہ کو لکھا کہ وہ اس مشکل کا حل امام موسیٰ کاظمؑ سے طلب کرے۔ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا لکھو۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اگر خانہ کعبہ پہلے بنا ہے اور لوگ بعد میں اس کے اطراف وکنار میں سکونت پذیر ہوئے ہیں تو اس کے اطراف کی فضا کا تعلق خانہ کعبہ سے ہے اور اگر لوگوں کی سکونت وہاں خانہ کعبہ سے پہلے تھی تو وہ اس کے زیادہ حقدار ہیں۔"

جب یہ جواب مہدی عباسی کو موصول ہوا تو اس کو اتنی مسرت ہوئی کہ اس نے وہ پروانہ لے کر اُسے بوسہ دیا اور حکم دیا کہ ان گھروں



کو مسمار کیا جائے۔ گھروں کے مالک برافروختہ ہو کر امام موسیٰ بن جعفرؑ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ مہدی کو خط لکھیں کہ وہ گھروں کی قیمت انہیں واپس کر دے۔ حضرتؑ نے ان کی خواہش پوری کر دی اور مہدی نے بھی انہیں راضی کیا۔

یہ دو روایات ایک باریک استدلال پر مشتمل ہیں جو حقوق کے بارے میں مروجہ قوانین سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ خانہ کعبہ جیسا عبادت خانہ جب ایک نئی زمین میں بنا تو اس کی ضروریات کے پھیلاؤ تک وہ اس سرزمین پر اولیت رکھتا ہے البتہ جب تک یہ احتیاج ضرورت کا پہلو پیدا نہیں کرتی دوسرے لوگ بھی اس کے جوار سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن جب ضرورت ہو تو اس کے حق اولیت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

خانہ کعبہ کی خصوصیات

ان دو آیات میں پہلی عبادت گاہ ہونے کے علاوہ خانہ کعبہ کی چار اور خصوصیات بیان ہوئی ہیں:

مبارکاً

مبارک کا معنیٰ بابرکت اور فائدہ مند ہے۔ کعبہ اس لحاظ سے مبارک ہے کہ وہ مادی اور روحانی دونوں طرح سے بہت ہی برکت والی زمین پر واقع ہے۔ اس مقدس سرزمین کی روحانی برکتیں، خدائی جذبات حرکت و جنبش اور خصوصاً حج کے موقع پر وحدت و اتحاد کی فضا کے آثار کسی سے پوشیدہ نہیں اور اگر صرف حج کی ظاہری رسومات اور شکل و صورت کے پہلو پر اکتفاء نہ کی جائے بلکہ اس کی روح اور فلسفہ زندہ ہو تو اس کی حقیقی برکت مزید واضح اور روشن ہوگی۔ اگرچہ یہ سرزمین مادی لحاظ سے خشک اور بے آب و گیاہ ہے اور طبعی طور سے وہ کسی طرح بھی کوائف زندگی سے مناسبت نہیں رکھتی پھر بھی طویل عرصے سے یہ ایک آباد اور متحرک شہر رہا ہے۔ خصوصاً تجارت کے لیے شروع سے اس کی مرکزیت قائم ہے۔

ھدی للعالمین

کعبہ عالمین کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے اور لوگ دُور افتادہ علاقوں سے خشکی کے اور دریائی راستوں کو روندتے ہوئے اس عظیم عبادت گاہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور شان و شوکت سے اُن مراسم حج میں شریک ہوتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے مروج ہیں۔ حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت کے عرب بھی خانہ کعبہ کا احترام کرتے تھے اور مراسم حج کو دین ابراہیمؑ سمجھ کر بجا لاتے تھے اگرچہ اس میں انہوں نے اپنی طرف سے کچھ خرافات بھی شامل کر لی تھیں اور اپنے ان ناقص مراسم کے باوجود کافی حد تک اپنے غلط کاموں سے وقتی طور پر ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔ اس طرح سب لوگ حتیٰ کہ بت پرست بھی اس عظیم گھر کی ہدایت سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ اس مقدس گھر کی روحانی اور معنوی کشش سب کو مجبوراً متاثر کر لیتی ہے۔

فیہ اٰیات بیّنات مقام ابراھیم

اس گھر میں خدا پرستی، توحید اور روحانیت و معنویت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک اس کا دوام اور بقاء ہے اُن طاقتور دشمنوں کے مقابلہ میں جو اس کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ دوسری نشانی حضرت ابراہیمؑ جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کے وہ آثار ہیں جو اس کے قرب و جوار میں باقی رہ گئے ہیں۔ مثال کے طور سے زمزم، صفا و مروہ، رکنؑ، حطیمؑ، حجرِ اسود اور حجرِ اسماعیلؑ۔ ان میں سے ہر ایک

حاشیہ بر صفحہ آئندہ



گذشتہ زمانوں کی ایک مجسّم تاریخ ہے جو ان کی عظیم اور دائمی یادوں کو زندہ رکھتی ہے۔

ان نشانیوں میں سے مقامِ ابراہیمؑ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ اور مراسمِ حج کی انجام دہی یا عام لوگوں کو ان عظیم مراسم کے پورا کرنے کی دعوت دینے کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ بہرحال یہ ان اہم ترین قدیم نشانیوں میں سے ہے جو بے نظیر قربانیوں کی یادوں اور ان کے اخلاص و جامعیت کو زندہ کرتی ہیں۔ مقامِ ابراہیمؑ سے مراد خاص وہی جگہ ہے جہاں اس وقت وہ مخصوص پتھر ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کے قدم کا نقش مبارک موجود ہے یا اس سے تمام حرمِ مکہ مراد ہے اور یا تمام مواقفِ حج ہیں۔ اس سلسلہ میں مفسّرین حضرات کے نظریات مختلف ہیں۔ لیکن اصولِ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت منقول ہے جو پہلے احتمال کی تائید کرتی ہے۔

ومن دخلہ کان امنًا

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے بعد شہرِ مکہ کے لیے جائے امن ہونے کی خداوندِ عالم سے درخواست کی تھی اور یہ دعا مانگی تھی:

خدایا! اس سرزمین کو جائے امن و امان قرار دے (ابراہیم۔ ۳۵)۔ خداوندِ عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو مستجاب کیا اور اسے ایک مرکزِ امن قرار دیا۔ یہ جگہ روح کے آرام و اطمینان اور ان لوگوں کے امن و امان کا سبب ہے جو وہاں آتے ہیں اور اس سے روحانی تقویت حاصل کرتے ہیں اور مذہبی قوانین کے لحاظ سے اس کی اہمیت اس طرح محترم شمار ہوتی ہے کہ وہاں ہر قسم کی جنگ و جدال اور مقابلہ و مبارزہ ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

بالخصوص اسلامی نقطۂ نظر سے کعبہ ایک جائے امن اور پناہ گاہ کے حوالہ سے پہچانا جاتا ہے یہاں تک حکم ہے کہ اس خطۂ ارض میں رہنے والے جانور بھی امن و امان میں ہونے چاہئیں اور کسی کو ان سے سروکار نہیں ہونا چاہیے اور جو انسان اس میں جا کر پناہ حاصل کریں وہ بھی امان میں ہیں۔ حتیٰ کہ قاتل اور جارح ہی کیوں نہ ہوں ان سے بھی یہاں تعرض نہیں کیا جا سکتا مگر خانہ کعبہ کے احترام سے غلط فائدہ نہ اٹھایا جائے اور مظلوم لوگوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔ اگر مجرم افراد وہاں جا کر پناہ لیں تو حکم یہ دیا گیا ہے کہ ان پر کھانے پینے میں سختی کی جائے تاکہ وہ مجبور ہو کر وہاں سے باہر نکلیں اور انہیں حدودِ حرم سے باہر کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔

وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلًا

اس جملے میں تمام لوگوں کو حج کی انجام دہی کا حکم دیا گیا ہے اور اسے لوگوں کے ذمہ خدائی قرض قرار دیا گیا ہے، چنانچہ "لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے لوگوں کے ذمہ ہے۔ لفظ "حج" کے لغوی معنیٰ "قصد و ارادہ" ہیں، اسی مناسبت سے راستہ کو "محجۃ" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو اپنے مقصد تک پہنچا دیتا ہے اور دلیل و برہان کو حجت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مقصود کو روشن کر دیتی ہے۔ باقی یہ بات کہ ان مخصوص رسومات کو حج سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مراسم میں شرکت کے لیے چلتے وقت خانہ خدا کی زیارت کا قصد

حاشیہ صفحہ سابقہ۔ ۱؎ کعبہ کے چاروں کونوں کو رکن کہتے ہیں۔

۲؎ حجرِ اسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے درمیان کی جگہ کو حطیم کہتے ہیں، حطیم اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں اژدہام بہت ہوتا ہے اور یہ حضرت آدمؑ کی توبہ کی جگہ بھی ہے۔

۳؎ حجرِ اسماعیل ایک مخصوص جگہ ہے جو شمال مغرب میں قوس کی شکل میں ہے۔



کیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر آیت مذکورہ میں حج کی اضافت بیت کی طرف ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حج کے مراسم پہلی دفعہ حضرت ابراہیمؑ کے دور میں رائج ہوئے اور اس کے بعد ایک سنت کی شکل اختیار کی۔ یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کا سلسلہ جاری و ساری رہا۔ بعد ازاں اسلام نے اس سے جاہلیت کے خرافات کو دور کر کے اسے خالص اور مکمل حج کی شکل دی۔ [1]

البتہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ اور دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ فریضۂ حج حضرت آدمؑ کے زمانے سے شروع ہوا تھا لیکن اس نے حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں مزید دستوری شکل اختیار کی۔

ہر وہ شخص جو استطاعت حاصل کر لیتا ہے اس پر زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ حج واجب ہے اور مندرجہ بالا آیت بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ اس میں حکم مطلق ہے اور اس سے ایک دفعہ کی انجام دہی سے اطاعت ہو جاتی ہے۔ حج کے وجوب کے لیے صرف ایک شرط لگائی گئی ہے اور وہ ہے استطاعت و قدرت۔ جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے: من استطاع الیہ سبیلاً جو خانہ کعبہ کی طرف جانے کی قدرت رکھتا ہو ــــ البتہ اسلامی روایات اور فقہی کتب میں استطاعت کی تفسیر میں یہ چیزیں شامل کی گئی ہیں زادِ راہ، سواری، جسمانی توانائی، راستے میں امن اور حج سے واپسی کے بعد گزر اوقات کی طاقت لیکن دراصل یہ سب چیزیں اس آیت میں مندرج ہیں کیونکہ اصل میں استطاعت کے معنی ہیں توانائی اور قدرت اور اس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ قانون دیگر اسلامی قوانین کی طرح صرف مسلمانوں کے لیے مختص نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اسے انجام دیں اور مشہور اصول "الکفار مکلفون بالفروع کما انھم مکلفون بالاصول (کفار فروعات کے بھی اسی طرح مکلف ہیں جس طرح اصول کے) کی تائید مذکورہ آیت اور دیگر دلیلوں سے بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ ان اعمال و عبادات کی صحت کی شرط یہ ہے کہ پہلے وہ اسلام قبول کریں اور اس کے بعد انہیں انجام دیں لیکن یہ مخفی نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنا ان ذمہ داریوں کی جوابدہی کو نہیں روکتا۔ ان عظیم مراسم کی اہمیت، فلسفۂ حج اور اس کے انفرادی و اجتماعی آثار پر سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۶ سے لے کر ۲۰۳ تک تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ [2]

حج کی اہمیت

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین

آیت کے آخری حصہ میں حج کی تاکید و اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ارشاد ہو رہا ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کر کے اس خدائی حکم کی پرواہ نہ کریں اور اس کی مخالفت کریں تو وہ خود اپنے تئیں نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ خدا تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

---

[1] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حج پہلی دفعہ دس ہجری میں فرض ہوا۔ اسی سال پیغمبر اکرمؐ نے کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ تمام جگہ کے لوگوں کو اطلاع دیں اور انہیں خانۂ کعبہ کی زیارت کے لیے آمادہ کریں۔ مراسم عمرہ اس سے پہلے بھی پیغمبر اکرمؐ اور کچھ مسلمان ادا کر چکے تھے۔

[2] متعلقہ آیات کے ضمن میں تفسیر نمونہ کی دوسری اور پہلی جلد کا مطالعہ فرمائیں۔

لفظ کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور دینی اصطلاح میں اس کا ایک وسیع معنی ہے کیونکہ حق سے ہر طرح کی مخالفت اس میں شامل ہے چاہے مرحلا اصول میں ہو یا فروعی احکام میں۔ اب اگرچہ اس کا استعمال اصول کی مخالفت میں ہونے لگا ہے مگر یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ اسی میں منحصر ہے چنانچہ آیت مذکورہ میں ترک حج کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسی بنا پر حضرت امام جعفر صادقؑ نے ایک روایت میں اس آیت میں کفر کا مفہوم ترک حج بیان فرمایا ہے۔[1]

دوسرے لفظوں میں ایمان کی طرح کفر کے بھی کئی مدارج و مراحل ہوتے ہیں جن میں ہر ایک مخصوص احکام کا حامل ہے۔ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہونے سے کفر و ایمان سے مربوط آیات و روایات کے بہت سے اشتباہات دور ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر سود کھانے والوں کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ میں اور جادوگروں کے متعلق سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں کفر کا لفظ آیا ہے تو اس سے بھی یہی مقصود ہے ——— بہرصورت اس آیت سے دو مطلب نکل سکتے ہیں:

پہلا یہ کہ حج بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس کے ترک کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مرحوم صدوقؒ نے کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں رسالتمآبؐ سے روایت بیان کی ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

یاعلی تارک الحج وھو مستطیع کافر یقول اللہ تبارک و تعالٰی و للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللہ غنی عن العلمین یاعلی! من سوف الحج حتی یموت بعثہ اللہ یوم القیمۃ یھودیا او نصرانیا۔

اے علی! جو شخص حج کو ترک کرے باوجودیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو تو وہ کافر شمار ہوگا۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ استطاعت رکھنے والے لوگوں پر خدا کے گھر کی طرف حج بجالانے کے لیے جانا لازمی اور ضروری ہے اور جو کفر اختیار کرے (یعنی اسے چھوڑ دے) تو اس نے اپنا نقصان کیا ہے اور خدا ان سے بے نیاز ہے۔ اے علی! جو حج میں تاخیر کرے یہاں تک کہ دنیا سے چل بسے تو خدا اسے قیامت کے دن یہودی یا نصرانی محشور کرے گا۔

دوسرا مطلب یہ کہ اس اہم خدائی فریضہ کی انجام دہی تمام دینی پروگراموں کی طرح لوگوں کی تربیت اور نفع کے لیے ہے اور خدا جو تمام سے بے نیاز ہے یہ اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہے۔

۹۸ قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ۖ وَاللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَا تَعْمَلُوْنَ ○

۹۹ قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَھَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُھَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

۱۰۰ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ ○

۱؎ تفسیر صافی، زیر نظر آیت کے ذیل میں، بحوالہ التہذیب۔



۱۰۱ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

ترجمہ

۹۸ (اے پیغمبر! ان سے) کہو: اے اہلِ کتاب! تم کیوں (دیدہ و دانستہ) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کا شاہد حال ہے۔

۹۹ کہو: اے اہلِ کتاب! کیوں ہے کہ جو کوئی اللہ پر ایمان لانا چاہتا ہے تم اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو اور اُسے ٹیڑھی چال چلانا چاہتے ہو۔ حالانکہ تم حقیقتِ حال سے بے خبر نہیں ہو۔ یاد رکھو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

۱۰۰ اے ایماندارو! اگر تم اہلِ کتاب میں کسی گروہ (کہ جن کا کام نفاق اور تمہارے درمیان کینہ و عداوت کی آگ بھڑکانا ہے) کی باتوں پر کاربند ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔

۱۰۱ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کی راہ اختیار کرو۔ جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور اس کا رسول (تعلیم و رہنمائی) کے لیے تم میں موجود ہے۔ (لہٰذا خدا سے تمسک کرو) اور یاد رکھو کہ جو کوئی مضبوطی سے اللہ کا ہو رہا تو بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی (نہ تو اس کے لیے لغزش ہے اور نہ گم گشتگی کا اندیشہ ہے)۔

شانِ نزول

ان آیات کے شانِ نزول کے سلسلے میں جو کچھ شیعہ اور سنی تصنیفات میں نقل ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاس بن قیس ایک یہودی تھا وہ ضعیف العمر، تاریک دل اور کفر و عناد میں کم نظیر تھا ایک دن وہ مسلمانوں کے ایک مجمع کے پاس سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ اوس و خزرج جو سالہا سال ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے انکے بعض افراد انتہائی صلح و آشتی اور محبت و خلوص سے ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں یہ مجلس کی فضا انس و محبت سے معطر ہے اور شدید اختلافات کی جو آگ زمانہ جاہلیت میں ان میں شعلہ زن تھی وہ یکسر بجھ چکی ہے۔

یہ حالت دیکھ کر وہ حسد کے مارے جل اٹھا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ اگر یہ لوگ حضرت محمدؐ کی پیروی کر کے اتنے آگے بڑھتے رہے تو یہودیت کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ اسی دوران اس کے ذہن میں ایک سازش آئی اور اس نے ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا کہ وہ ان کے ایک گروہ سے میل جول رکھے اور اوس و خزرج کے درمیان خونیں واقعات کی یاد تازہ کرے اور ان کی نظروں کے سامنے ان واقعات کی تصویر کشی کرے۔



یاایھا الذین امنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین

اس کے بعد روئے سخن غافل مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے ان کو متنبہ کیا گیا کہ اگر وہ دشمن کی زہر آلود باتوں میں آگئے اور انہیں اپنے درمیان رخنہ اندازی کرنے کی اجازت دی اور ان کے وسوسوں سے متاثر ہوئے تو بعید نہیں کہ ان سے ایمان کا رشتہ ختم ہو جائے اور وہ کفر کی طرف پلٹ جائیں۔ کیونکہ دشمن اول تو یہ کوشش کرتا ہے کہ ان کے درمیان دشمنی و عداوت کی آگ بھڑکائے اور انہیں ایک دوسرے سے لڑوائے۔ لیکن یہ مسلّم ہے کہ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے وسوسوں کو جاری و ساری رکھتا ہے تاکہ انہیں اسلام سے مکمل طور پر بیگانہ کر دے۔

گذشتہ بیان سے عیاں ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں کفر کی طرف پلٹ جانے سے مراد "حقیقی کفر اور اسلام سے مطلق بیگانگی" ہے اور ممکن ہے کہ کفر سے مراد زمانہ جاہلیت کی دشمنیاں اور عداوتیں ہوں جو کفر ہی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ ایمان محبت اور اخوت کا سرچشمہ ہے اور کفر پراگندگی اور عداوت کا منبع ہے۔

وکیف تکفرون و انتم تتلی علیکم اٰیٰت اللہ و فیکم رسولہ۔

اس کے بعد مومنین سے ایک تعجب خیز انداز میں سوال ہوتا ہے کہ کس طرح ممکن ہے کہ تم کفر کی راہ اختیار کرو حالانکہ پیغمبر بھی تمہارے درمیان موجود ہیں اور آیاتِ خدا کی بھی مسلسل تلاوت ہوتی ہے اور بارانِ وحی کے حیات بخش قطرات تمہارے دلوں پر پڑتے ہیں۔ حقیقت میں یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر دوسرے لوگ گمراہ ہوں تو زیادہ تعجب نہیں۔ باعثِ تعجب تو یہ ہے کہ جو افراد پیغمبرؐ کی صحبت میں بیٹھتے ہیں اور ہمیشہ عالمِ وحی سے ان کا تعلق رہتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ گمراہ ہو جائیں اور اگر ایسے لوگ گمراہ ہوں تو یہ خود ہی کوتاہی کرنے والے ہیں اور اس کا عذاب بہت دردناک ہوگا ——

ان آیات کے آخر میں مسلمانوں کو وصیت کی گئی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے وسوسوں سے چھٹکارہ حاصل کریں اور صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لیے پروردگارِ عالم کے لطف کا دامن تھام لیں اور اس کی پاک ذات اور قرآن مجید کی مقدس آیات سے تمسک رکھیں اور انہیں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ جو شخص خدا سے تمسک رکھے اسے راہِ راست کی ہدایت حاصل ہو جائے گی۔

یہ آیات کئی لطیف نکات سے معمور ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ پہلی آیات جہاں روئے سخن یہودیوں کی طرف ہے میں بالواسطہ خطاب کیا گیا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان سے کہیں، جس پر لفظ "قُل" (کہہ دو) دلالت کرتا ہے لیکن آخری دو آیات جہاں خطاب مومنین سے ہے، میں خطاب بلاواسطہ ہے اسی وجہ سے اس کی ابتداء لفظ قُل سے نہیں کی گئی اور اس سے صاحبِ ایمان لوگوں پر خدا کا لطف و کرم ظاہر ہوتا ہے۔

۱۰۲- يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ○

۱۰۳- وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○



تفسیر

تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت

یٰاَیُّھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ

اس آیت میں پہلے تقویٰ کی دعوت دی گئی ہے تاکہ وہ اتحاد کی دعوت کے لیے تمہید بنے۔ درحقیقت تقویٰ کی دعوت کسی اخلاقی اور عقیدہ کی مدد کے بغیر بے اثر یا کم اثر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اس آیت میں کوشش کی گئی ہے کہ اختلاف اور پراگندگی کے عوامل ایمان اور تقویٰ کے ذریعے کمزور کیے جائیں اور اسی لیے ایماندار افراد کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ سب کے سب خدا سے ڈرو اور تقویٰ اور پرہیزگاری کا حق ادا کرو ـــــــ

"حقِ تقویٰ" سے کیا مراد ہے؟ اس ضمن میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ حقِ تقویٰ پرہیزگاری کا آخری درجہ ہے جس میں ہر قسم کے گناہ و عصیان اور حق سے انحراف کرنے سے پرہیز کرنا شامل ہے۔ اسی لیے تفسیر "درِ منثور" میں پیغمبر اکرمؐ اور تفسیر عیاشی" اور "معانی الاخبار" میں امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؑ نے حقِ تقویٰ کی تفسیر میں فرمایا:

(ان یطاع فلا یعصی و یذکر فلا ینسی و یشکر فلا یکفر)

یعنی حقِ تقویٰ یہ ہے کہ ہمیشہ اس کے فرامین کی اطاعت کی جائے اور کبھی اس کی نافرمانی نہ کی جائے اور ہمیشہ اسے یاد رکھو اور کبھی بھی اسے فراموش نہ کرو اور اس کی نعمتوں پر شکرگزار رہو اور کفرانِ نعمت نہ کرو۔ ـــــــ

ظاہر اور واضح ہے کہ یہ حکم باقی احکامِ الٰہی کی طرح انسان کی ہمت و طاقت سے وابستہ ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت اور سورہ تغابن کی آیت ۱۶ (فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (جتنا ہو سکے پرہیزگاری اختیار کرو) ان دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے ان دو آیات کے تضاد کے بارے میں اور یہ کہ ان میں سے ایک دوسری کی ناسخ ہے، گفتگو بے بنیاد ہے۔ البتہ دوسری آیت حقیقت میں اصطلاحی لحاظ سے پہلی آیت کی تخصیص ہے اور اسے انسان کی توانائی کی مقدار سے مقید کرتی ہے۔ چونکہ ظاہراً قدماء کے ہاں لفظ نسخ تخصیص پر بھی بولا جاتا تھا۔ لہٰذا ممکن ہے ان لوگوں کی نسخ سے مراد تخصیص ہی ہو۔

ولا تموتن الا و انتم مسلمون۔

حقیقت میں یہ جملہ اوس و خزرج اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ ہوشمندی سے رہیں۔ صرف اسلام قبول کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس سے اہم بات یہ ہے کہ ایمان و اسلام کو زندگی کے آخری لمحات تک محفوظ رکھیں اور زمانہ جاہلیت کے کینہ کی بجھی ہوئی آگ اور بیہودہ غیر معقول تعصبات کی پیروی میں اپنے ایمان اور پاک اعمال کو بربادی کی بھینٹ نہ چڑھا دیں تاکہ آخرت میں انجام بدبختی سے ہمکنار نہ ہو لہٰذا اس بات کی تاکید کی گئی کہ خیال رکھنا کہ دنیا سے ایمان و اسلام کے بغیر نہ جانا۔

اتحاد کی دعوت

و اعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا۔



اس آیت میں مسئلہ اتحاد اور ہر قسم کے اختلاف اور تفرقہ بازی سے اجتناب کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے سبھی اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور ایک دوسرے سے جُدا نہ ہو جاؤ۔

حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے مراد کیا ہے؟ مفسّرین نے اس کے متعلق کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد قرآن ہے اور بعض اس سے مراد اسلام لیتے ہیں۔ کچھ حضرات کے نزدیک خاندانِ رسالت اور ائمہ معصومینؑ مراد ہیں۔ جو روایات پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہلِ بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں اُن میں بھی کئی تعبیرات نظر آتی ہیں جیسا کہ تفسیر درِّ منثور میں پیغمبر اکرمؐ اور معانی الاخبار میں حضرت امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ حبل اللہ قرآن کریم ہے اور تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ اللہ کی رسّی سے مراد آل محمدؐ ہیں اور لوگوں کو ان سے تمسک کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ لیکن ان احادیث اور اُن تفاسیر میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ اللہ کی رسّی سے مراد ہر قسم کا ذریعہ ہے جو ذات پاک کے ساتھ ربط رکھتا ہے۔ چاہے وہ وسیلہ اسلام ہو یا قرآن یا پیغمبرؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ۔ بالفاظ دیگر تمام وہ چیزیں جو ذکر ہو چکی ہیں ارتباطِ خدا کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

"حبل اللہ" کی تعبیر کا مقصد

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ان امور کو حبل اللہ سے تعبیر کرنے سے ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ انسان عام حالات میں جب کہ کوئی مربی اور رہنما نہ ہو، طبیعت کے دُرّے، سرکش سرشت کی گہرائیوں اور جہل و نادانی کے تاریک کنوئیں میں پڑا رہتا ہے۔ اس پستی سے نجات حاصل کرنے اور اس تاریک کنوئیں سے باہر نکلنے کے لیے ایک مضبوط رسّی کی ضرورت ہے جسے وہ پکڑ سکے اور اس سے باہر آسکے۔ یہ مضبوط رسّی وہ خدائی رابطہ ہے جو قرآن، اس کے لانے والے اور ان کے حقیقی جانشینوں تک پہنچتا ہے اور یہ لوگوں کو مادیت کی پستی سے نکال کر معنویت اور روحانیت کے عروج تک پہنچا دیتا ہے۔

کل کے دشمن اور آج کے دوست

اس کے بعد قرآن کریم اتحاد و اخوت کی عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مسلمانوں کو گذشتہ افسوس ناک حالت پر غور و فکر کرنے اور اُس پراگندگی کا اس اتحاد اور وحدت کے ساتھ تقابل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: انہیں نہیں بھولنا چاہیے کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن خداوند عالم نے اسلام و ایمان کی برکت سے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے انس پیدا کیا اور تم آج بھائی بھائی بن گئے۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ اس آیت میں لفظ نعمت کو مکرر لایا گیا ہے اور اس طرح سے اتفاق و اخوت کی نعمت کی اہمیت ان کے گوش گذار کی گئی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا نے مومنین کی تالیفِ قلوب کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے کہا کہ خدا نے تمہارے دلوں میں اُلفت و محبت پیدا کر دی۔ اس تعبیر سے اسلام کے ایک اجتماعی معجزہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اگر عربوں کی سابقہ عداوت پر غور کیا جائے کہ کس طرح سالہا سال سے ان کے دلوں میں گہرے کینے بھرے ہوئے تھے اور کس طرح ایک معمولی سے مسئلے پر ان کے درمیان خونیں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تھی، خصوصاً اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ عموماً نادان، اَن پڑھ اور نیم وحشی افراد ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور آسانی سے گذشتہ چھوٹے



مسئلے کو طاق نسیاں پر رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس صورت میں عظیم اسلام کے اجتماعی معجزہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عام اور روزمرہ کے طور طریقوں سے یہ ممکن نہیں تھا کہ اس قسم کی کینہ پرور نادان قوموں کی ایک ملت بنائی جائے اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا جائے۔

مندرجہ بالا امر (کینہ پرور عرب قبائل کے درمیان وحدت اور بھائی چارہ) کی اہمیت علماء اور مؤرخین حتیٰ کہ غیر مسلم مورخین کی نظر سے مخفی نہیں رہی اور سب نے بڑے تعجب خیز انداز سے اس کا ذکر کیا ہے۔

جان ڈیون پورٹ، مشہور انگریز عالم رقمطراز ہے:

"..... محمد جیسے ایک عالم عرب نے اپنے ایک چھوٹے منتشر، برہنہ اور افلاس زدہ ملک کو ایک متحرک اور منظم معاشرے میں تبدیل کر دیا اور روئے زمین کی اقوام کے درمیان انہیں نئے صفات اور تازہ اخلاق کے ساتھ متعارف کرایا اور تیس سال سے کم عرصے میں اس طرز روش نے حاکم قسطنطنیہ کو مغلوب کر دیا اور سلاطین ایران کو نیست و نابود کر دیا، شام، بین النہرین اور مصر کو مسخر کیا اور ان کی فتوحات اوقیانوس اطلس سے لے کر دریائے خزر اور سیحون تک جا پہنچیں۔[1]

توماس کارل لکھتا ہے:

"خداوند عالم نے اسلام کے ذریعے عربوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف ہدایت کی۔ ایک بے حرکت اور منجمد قوم کہ جس کی نہ کوئی آواز تھی اور نہ حرکت محسوس ہوتی تھی سے ایک ایسی ملت پیدا کی جسے گمنامی سے شہرت، سستی سے بیداری، پستی سے بلندی اور عجز و ناتوانی سے قوت و توانائی کی طرف لے گیا۔ ان کی روشنی چار دانگ عالم میں ضیاء پاشی کرنے لگی۔ اعلان اسلام کو ابھی ایک صدی نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں نے ایک قدم ہندوستان اور دوسرا سرزمین اندلس میں رکھا اور آخر کار اس مختصر سی مدت میں اسلام نصف کرۂ ارض پر ضوافشانی کرنے لگا۔[2]

"**ڈاکٹر گوستاولوبون**" نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"اس حیرت انگیز حادثہ یعنی اسلام سے قبل کہ جس نے عرب قوم کو جہانگیری اور نئے معانی کے اخلاق کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کیا عربستان کا علاقہ نہ تاریخ و تمدن کی جزء سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی وہاں علم یا مذہب کا نام و نشان تھا۔[3]

ایک ہندو دانشمند اور سیاستدان نہرو اس بارے میں لکھتا ہے:

"عربوں کی سرگزشت اور داستان کہ وہ کس تیز رفتاری سے ایشیاء، یورپ اور افریقہ پر چھا گئے اور عالی شان و عظیم تمدن اور ثقافت کو انہوں نے جنم دیا، انسانی تاریخ میں ایک عجیب و غریب چیز ہے ——— نئی توانائی اور جدید فکر کہ جس نے

---

[1] "عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد و قرآن" از جان ڈیون پورٹ، فارسی ترجمہ از سید غلام رضا سعیدی، صفحہ ۰۰۔

[2] "نقشہ ہائی استعمار" از محمد محمود صواف، صفحہ ۳۸۔

[3] تاریخ تمدن اسلام و عرب از گوستاولوبون۔



اُن کو بیدار کیا اور انہیں اطمینان نفس اور قدرت سے نوازا وہ دین اسلام تھا۔[1]

وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها

شفا کے لغوی معنیٰ خندق یا کنوئیں کا کنارہ ہے اور شاید لب پر بھی "شفہ" کا ـــــــ اطلاق اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اس لفظ کا استعمال بیماری سے تندرست ہونے کے لیے بھی اسی مناسبت سے ہے کہ انسان سلامتی اور تندرستی کے کنارے پر آپہنچتا ہے۔

مندرجہ بالا جملے میں خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: تم گذشتہ زمانے میں آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ ہر آن ممکن تھا کہ تم اس میں گر جاؤ اور تمہارا سب کچھ خاکستر ہو جائے لیکن خداوند عالم نے تمہیں نجات بخشی اور ہلاکت کے اس گڑھے سے امن و امان کے نقطہ کی طرف تمہاری رہنمائی کی جو اخوت و محبت کا نقطہ تھا۔

آیت میں آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے یا اس دنیا کی، اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن پوری آیت پر توجہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑوں سے کنایہ ہے جو ہر لحظہ زمانہ جاہلیت میں کسی نہ کسی بہانہ عربوں میں بھڑک اٹھتی تھی۔ قرآن مجید اس جملے میں زمانہ جاہلیت کے خطرناک حالات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہر لحظہ جنگ اور خونریزی کا خطرہ ان کے سروں پر منڈلا تا رہتا تھا اور خداوند عالم نے نور اسلام کی برکت سے انہیں اس حالت سے نجات دی۔ یہ مسلم ہے کہ انہوں نے اس خطرناک حالت سے خلاصی پا کر جہنم کی جلانے والی آگ سے بھی نجات پائی۔

کذلک یبین الله لکم ایاته لعلکم تهتدون۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کی گئی ہے کہ خدا اسی طرح اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تمہاری ہدایت ہو جائے۔ اس بناء پر آخری مقصد اور غرض تمہاری ہدایت و نجات ہے اور چونکہ یہ تمہارے منافع اور سرنوشت کا معاملہ ہے لہٰذا جو کچھ کہا گیا اسے زیادہ سے زیادہ اہمیت دو۔

قوموں کی بقاء کے لیے اتحاد کی اہمیت

ان تمام باتوں کے باوجود کہ جو اتحاد کے اعجاز آمیز اثر کے بارے میں اجتماعی مقاصد اور معاشروں کی بلندی کی طرف پیش رفت کے سلسلے میں کہی گئی ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک اس کا واقعی اثر نہیں پہچانا گیا۔

عصر حاضر میں دنیا کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے بند باندھے گئے ہیں جو زیادہ منفعت توانائیوں کی بدولت ہیں اور وہ وسیع و عریض زمینوں کی آبیاری اور روشنی کا سبب بنے ہیں۔ اگر صحیح طور سے غور و فکر کیا جائے تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ اتنی بڑی قدرت صرف ناچیز بارش کے قطرات کے ایک دوسرے سے وابستہ ہونے کی قدرت کے نتیجے کے علاوہ اور کچھ نہیں، یہیں سے ہم انسانوں کے اتحاد اور مل کر کوشش کرنے کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ اور دیگر بزرگ اسلامی رہنماؤں سے اکثر احادیث میں مختلف عبارات کے ذریعے اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

---

[1] نگاہی بتاریخ جہان، جلد ۱، صفحہ ۳۱۷۔



چنانچہ ایک مقام پر رسول اللہؐ فرماتے ہیں:

"المؤمن للمؤمن کالبنیان یشید بعضہ بعضا"

مومنین ایک دوسرے کے لیے ایک عمارت کے اجزاء کی مانند ہیں کہ جن میں ہر ایک جزء دوسرے کی مضبوطی سے نگہبانی کرتا ہے۔

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"المؤمنون کالنفس الواحدۃ"

مومنین ایک نفس وروح کی طرح ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا:

مثل المؤمنین فی توادھم و تراحمھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی بعضہ تداعی سائرہ بالسھر والحمی۔

صاحبان ایمان افراد دوستی اور ایک دوسرے پر رحم کرنے اور نیکی کرنے میں ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں کہ جب ان میں ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی اعضاء وجوارح کو قرار وآرام نہیں آتا۔[1]

۱۰۴ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○

۱۰۵ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

ترجمہ

۱۰۴ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو۔ وہ نیکی کا حکم دے برائی سے روکے، اور بلاشبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

۱۰۵ اور دیکھو! ان لوگوں کی سی چال نہ چلنا جو (خدا کے ایک ہی دین پر اکٹھے رہنے کی بجائے) الگ الگ ہو گئے اور باوجود یہ کہ (کتاب اللہ) کی روشن دلیلیں اُن کے سامنے آچکی ہیں۔ باہم دگر اختلافات میں پڑ گئے۔ پس ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۲، صفحہ ۴۵۔



تفسیر

حق کی دعوت اور فساد کا مقابلہ

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون

اُمّت اصل میں مادہ "ام" سے ہے جس کا معنیٰ ہے ہر وہ چیز جس کا دوسری چیزیں ضمیمہ ہوں۔ اسی بنا پر اُمّت ایسے گروہ کو کہا جاتا ہے جن کے درمیان وحدت کا پہلو ہو۔ اس میں فرق نہیں کہ وحدت زمانی ہو یا مکانی یا مقصد میں وحدت ہو۔ لہٰذا متفرق اور پراگندہ اشخاص کو اُمّت نہیں کہا جا سکتا۔

گذشتہ آیات اخوت و وحدت کے بارے میں ہیں۔ اب اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو حقیقت میں ایک اجتماعی زرہ کے مانند ہے اور جو جمعیت کی حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو تو مختلف عوامل جو "اجتماعی وحدت" کی بقا کے دشمن ہیں دیمک کی طرح اندر سے معاشرے کی جڑوں کو کھاتے رہتے ہیں اور لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے وحدتِ اجتماعی کی حفاظت عوام کی نگرانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

آیت بالا میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا گروہ ہونا چاہیے جو ان دو اجتماعی عظیم ذمہ داریوں کو انجام دے لوگوں کو نیکی کی دعوت دے اور برائیوں سے منع کرے اور آیت کے آخری حصے میں باقاعدہ تصریح ہوئی ہے کہ فلاح و نجات صرف اسی راستے سے ممکن ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "منکم اُمّة" کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ یہ اُمّت بعض مسلمانوں میں سے تشکیل پاتی ہے نہ کہ سب کے سب یہ کام کریں۔ تو اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری عمومی پہلو کھو بیٹھے گی۔ بلکہ وہ صرف ایک خاص گروہ کی ذمہ داری ہوگی اگرچہ انتخاب اور جمعیت کو ترتیب دینا تمام لوگوں کا فرض ہے بالفاظ دیگر یہ واجب کفائی ہے نہ کہ واجب عینی۔ حالانکہ قرآن مجید کی دیگر آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ذمہ داریاں عمومی پہلو رکھتی ہیں۔ یعنی واجب عینی ہیں نہ کہ کفائی، مثلاً بعد میں آنے والی آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر

تم بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں کے نفع کے لیے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ تم انہیں اچھی چیزوں کا حکم دیتے ہو اور بری چیزوں سے روکتے ہو۔

اسی طرح سورہ عصر میں ارشاد ہوتا ہے:

تمام لوگ خسارے میں ہیں سوائے ان کے جو ایمان رکھنے کے ساتھ صالح عمل کرتے ہیں اور حق و صبر کی وصیت کرتے ہیں۔



ان جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ذمہ داریاں کسی خاص گروہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتیں بلکہ یہ عام ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے:

ان جیسی تمام آیات میں غور و خوض کرکے اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ کیونکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مرحلے ہیں، ایک انفرادی مرحلہ ہے، اس میں ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ تنہا دوسروں کے اعمال کی نگہداشت کرے اور دوسرا مرحلہ اجتماعی ہے اس کے لیے ایک گروہ کا فریضہ ہے کہ وہ معاشرتی خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے متحد ہو کر مشترکہ طور پر کوشش کرے۔

پہلی قسم میں ہر شخص پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس طرح تمام لوگ ذمہ دار ہوں گے اور چونکہ اس میں انفرادی پہلو ہے لہٰذا اس کی وسعت فرد کی توانائی تک محدود ہے لیکن دوسری قسم واجب کفائی ہے۔ یہ چونکہ ایک گروہ کی ذمہ داری ہے لہٰذا اس کا دائرہ اثر بھی وسیع ہے اور اس لیے فطری طور پر یہ کام حکومت اسلامی کی ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ دو صورتیں (خرابی اور فساد کا مقابلہ کرنا اور حق کی طرف دعوت دینا) اسلامی قوانین کا شاہکار شمار ہوتی ہیں۔ حکومت اسلامی کے نظام میں تقسیم کار کا معاملہ، اجتماعی حالت اور حکومتی اداروں کی صورت حال ایک نگران گروہ کے وجود کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

گذشتہ ادوار میں اسلامی ممالک میں اس آیت کی روشنی میں برائیوں کو روکنے اور اجتماعی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے ایسے ادارے تشکیل پاتے رہے ہیں۔ آج کل بھی حجاز وغیرہ میں ایسے ادارے موجود ہیں[1]۔ ایسے اداروں کو حسبہ اور ان کے مامورین کو محتسب یا "آمرین بمعروف" کہتے ہیں۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں میں ہونے والے ہر قسم کے برے کام کو روکیں اور حکومتی اداروں میں ہونے والے ہر قسم کے ظلم و فساد کی روک تھام کریں اور اسی طرح لوگوں میں نیک اور پسندیدہ کاموں کا شوق پیدا کریں۔

وسیع اختیارات کے حامل ان اداروں کا وجود محدود قدرت کے حامل فرد کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرنے سے کوئی تضاد نہیں رکھتا۔

چونکہ یہ بحث قرآن مجید کی اہم مباحث میں سے ہے اور بہت سی آیات میں اس کا تذکرہ ہے لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

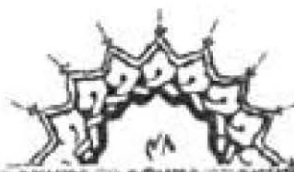
چند اہم نکات

(۱) **معروف اور منکر:** معروف کے اصلی حروف ع، ر، ف (عرف) ہیں اور اس کے لغوی معنیٰ ہیں "پہچانے ہوئے" اور منکر کے معنیٰ ہیں "نہ پہچانے ہوئے" یہ لفظ انکار سے ہے۔ گویا اس مناسبت سے نیک کاموں کا پہچانے ہوئے امور اور ناپسندیدہ کاموں کا نہ پہچانے ہوئے کاموں سے تعارف کرایا گیا ہے کیونکہ انسان کی پاک فطرت پہلی قسم سے آشنا و آگاہ ہے اور دوسری قسم سے ناآشنا ہے۔

(۲) **کیا امر بالمعروف ایک عقلی حکم ہے:** بعض علماء اسلام کا خیال ہے کہ ان دو ذمہ داریوں کا وجوب نقلی دلیل سے ثابت ہے اور عقل سے

---

[1] ایسے ادارے عموماً برائے نام شرعی ہیں اور اکثر ان کی حالت حکومت کے عام اداروں سے بھی بدتر ہے (مترجم)



اس کا کوئی سروکار نہیں اور عقل اس بات کا حکم نہیں دیتی کہ انسان کسی دوسرے کو ایسے کام سے روکے جس کا نقصان صرف کرنے والے کو پہنچتا ہو۔ لیکن اجتماعی معاشرتی تعلقات اور اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ کوئی بُرا کام انسانی معاشرے میں کسی خاص نقطہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ آگ کے شعلوں کی طرح پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے یہ عقل کا فیصلہ ہے کہ ان دو ذمہ داریوں کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

بالفاظِ دیگر سوسائٹی میں کوئی چیز انفرادی ضرر کی حامل نہیں۔ ہر انفرادی ضرر میں یہ امکان ہے کہ وہ اجتماعی نقصان کی صورت اختیار کرلے۔ اسی بناء پر عقل ومنطق معاشرے کے افراد کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے گردو پیش کی فضا کو پاک وصاف رکھنے کے لیے ہر قسم کی جستجو اور کوشش کریں۔

اتفاق سے بعض احادیث بھی اس بات کی غمازی کرتی ہیں جیسا کہ رسول اسلامؐ نے ارشاد فرمایا:

ایک گناہگار دوسرے لوگوں کے درمیان اس شخص کی مانند ہے جو ایک کشتی میں کچھ لوگوں کے ساتھ سوار ہو جب وہ کشتی سمندر کے بیچ میں پہنچے تو وہ کلہاڑی سے اس جگہ سوراخ کرنے لگے جہاں وہ بیٹھا ہوا ہے اور جب دوسرے لوگ اس کے اس فعل پر اعتراض کریں تو وہ یہ جواب دے کہ میں تو صرف اپنی جگہ پر یہ کام کر رہا ہوں۔ اس وقت اگر دوسرے لوگ اس کو اس خطرناک کام سے نہ روکیں تو چند لمحوں میں سمندر کا پانی کشتی میں داخل ہو جائے گا اور یک دم سب کے سب غرق ہو جائیں گے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس واضح مثال کے ذریعے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے منطقی ہونے کی تصویر کشی کی ہے اور معاشرے کے لیے ہر فرد کی نگرانی کے حق کو ایک فطری حق قرار دیا ہے۔

(۴) **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت:** قرآن مجید کی آیات کے علاوہ بہت سی معتبر احادیث اور اسلامی مصادر میں بھی ان دو عظیم اجتماعی وظائف کی اہمیت بیان کی گئی ہے کہ جن میں ان خطرات اور بُرے نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے جو ان دو ذمہ داریوں کے ترک کرنے کی صورت میں جنم لیتے ہیں۔ جیسا کہ امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ:

ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فریضۃ عظیمۃ بھا تقام الفرائض وتأمن المذاھب وتحل المکاسب وترد المظالم وتعمر الارض وینتصف من الاعداء ویستقیم الامر.

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عظیم خدائی فریضہ ہے۔ باقی فرائض انہی کی بدولت قائم ہوتے ہیں۔ اُن کی وجہ سے راستے محفوظ رہتے ہیں، لوگوں کا کسب وکار حلال ہوتا ہے اور لوگوں کے حقوق انہی کی وجہ سے واپس ملتے ہیں اور ان کے سبب زمین آباد رہتی ہے، دشمنوں سے انتقام لیا جاتا ہے اور انہی کے طفیل تمام کام چلتے رہتے ہیں[1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ اَمَرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ فَهُوَ خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ وَخَلِيْفَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَخَلِيْفَةُ كِتَابِهٖ

---

[1] وسائل، کتاب امر بالمعروف ونہی عن المنکر، باب ۱، حدیث ۶، جلد ۱۱، صفحہ ۳۹۵۔



جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے وہ زمین پر خدا، اس کے رسول اور اس کی کتاب کا جانشین ہے۔[1]

اس حدیث سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہ عظیم فریضہ ہر چیز سے پہلے ایک خدائی پروگرام ہے۔ انبیاء کی بعثت اور آسمانی کتب کا نزول سب کے سب اسی پروگرام کا حصہ ہیں۔

ایک شخص پیغمبرؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور آپؐ منبر پر جلوہ افروز تھے اس نے پوچھا: مَنْ خَيْرُ النَّاسِ تمام لوگوں میں سے بہتر کون ہے۔ آپ نے فرمایا:

آمرهم بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهَاهُمْ عن المنكر و اتقاهم لله وارضاهم

جو سب سے زیادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتا ہو اور جو زیادہ پرہیزگار ہو اور جو خوشنودئی خدا کی راہ میں زیادہ قدم بڑھانے والا ہو۔[2]

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو ورنہ خدا کسی ستم گر اور ظالم کو تم پر مسلط کرے گا۔ جو نہ تمہارے بوڑھوں کا احترام کرے گا اور نہ بچوں پر رحم کرے گا۔ تمہارے نیک اور صالح لوگ دعا کریں گے لیکن مستجاب نہیں ہوگی۔ وہ خدا سے مدد طلب کریں گے لیکن خدا ان کی مدد نہیں کرے گا یہاں تک کہ اگر وہ لوگ توبہ کریں گے تو خدا ان کے گناہ معاف نہیں کرے گا۔[3]

یہ سب کچھ اس گروہ کے اعمال کی عکاسی ہے جو اس عظیم معاشرتی ذمہ داری کو پورا نہیں کریں گے کیونکہ جب عمومی نگرانی کے بغیر معاملات کی باگ ڈور نیک لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو برے اور نا اہل لوگ معاشرے کے ہر میدان پر قابض ہو جائیں گے مندرجہ بالا حدیث میں ان کی توبہ کی عدم قبولیت کا مطلب یہ ہے کہ برائیوں کے مقابلہ میں مسلسل خاموشی کی وجہ سے دعا کوئی اثر نہیں رکھتی مگر یہ کہ وہ اپنے عمل میں تجدید نظر کریں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"و ما اعمال البر كلها و الجهاد فى سبيل الله عند الامر بالمعروف والنهى عن المنكر الا كنفثة فى بحر لجى"

تمام نیک کام یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں جہاد بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایک گہرے سمندر میں تھوکنے اور پھونکنے کی مانند ہے۔[4]

اس قدر تاکید کا سبب یہی ہے کہ یہ دو عظیم ذمہ داریاں باقی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داریوں کے اجراء کی ضامن ہیں اور ان کی روح شمار

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔
[2] ایضاً
[3] ایضاً
[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، صفحہ ۴۷۰۔



ہوتی ہیں۔

(۴) **کیا امر بالمعروف سلب آزادی کا سبب ہے؟**: اس سوال کے جواب میں یہ کہنا مناسب ہے کہ اگرچہ یہ بات مسلّم ہے کہ افرادِ بشر کے لیے مل جل کر رہنا ان گنت فوائد و برکات کا حامل ہے حتیٰ کہ اس قسم کی خوبیوں نے انسان کو اجتماعی زندگی پر مجبور کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی انسان کو چند امور کا پابند کیا گیا ہے لیکن چونکہ اجتماعی زندگی کے بے شمار فوائد کے مقابلے میں اس قسم کی پابندیاں معمولی ہیں لہٰذا انسان روزِ اول سے ان پابندیوں کو قبول کر کے اجتماعی زندگی کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ چونکہ اجتماعی زندگی میں حیاتِ انسانی کا نظام ایک دوسرے سے مربوط ہے اور اصطلاحی طور سے معاشرے کے افراد ایک دوسرے کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا دوسروں کے اعمال پر نظارت و نگرانی کا حق فطری اور اجتماعی زندگی کی خصوصیت کا حق ہے جیسا کہ اس مفہوم کو رسالتمآبؐ کی سابقہ ایک حدیث میں عمدہ طور سے بیان کیا گیا ہے لہٰذا اس فریضہ کی انجام دہی سے نہ صرف انفرادی آزادی سلب نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر فردِ بشر کا ایک فطری حق ہے جو اسے دوسروں کے مقابلے میں حاصل ہے۔

(۵) **کیا امر بالمعروف سے کوئی حرج تو پیدا نہیں ہوتا؟**: اس مقام پر ایک اور سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب تمام لوگ اجتماعی امور میں دخیل و شریک ہیں اور ایک دوسرے کے اعمال کے نگران و محافظ ہیں تو کیا اس سے معاشرے میں گوناگوں مسائل کھڑے نہ ہو جائیں گے اور کیا یہ چیز ذمہ داریوں کی تقسیم اور معاشرے میں الگ الگ جوابدہی کے برخلاف نہیں ہے؟ اس سوال کے جواب کے متعلق گذشتہ بیان سے بھی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ جو کہ عمومی پہلو رکھتا ہے۔ اس کا دائرہ محدود ہے اور یہ صرف یاددھانی، پند و نصیحت، نقد و تنقید اور اس قسم کی چیزوں تک محدود ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ ایک زندہ معاشرے کے تمام افراد برائیوں کے بارے میں اس قسم کی جوابدہی رکھتے ہیں۔

لیکن دوسرا مرحلہ جو ایک خاص گروہ سے متعلق ہے اور وہ حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری شمار ہوتا ہے، اس کا دائرہ بہت وسیع ہے بایں معنی کہ اگر اس میں سختی کی ضرورت پڑے یہاں تک کہ قصاص و حدود تک معاملہ پہنچ جائے تو بھی یہ گروہ حاکم شرعی اور کارپردازان حکومتِ اسلامی کی نگرانی میں اپنا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ بنا بریں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف مراحل اور ہر ایک کی حدود کو مدِنظر رکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ ان سے معاشرے میں حرج و مرج اور فسادات پیدا نہیں ہوتے بلکہ مردہ معاشرے میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔

(۶) **امر بالمعروف تلخی اور سختی نہیں**: بحث کے آخر میں اس نکتہ کی یاددھانی ضروری ہے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے، فریضۂ خدائی کی طرف دعوت دینے اور فتنہ و فساد کا مقابلہ کرنے میں حسنِ نیّت اور پاکیزگی مقصد کو نہیں بھولنا چاہیے اور سوائے ضرورت کے ہر موقع پر صلح و صفائی کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے اور اس فریضہ کی انجام دہی میں خشونت اور سختی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ———

لیکن افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ اس کی انجام دہی میں خشونت آمیز انداز اپناتے ہیں اور بعض اوقات وہ بُرے اور چبھنے والے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کا امر بالمعروف نہ یہ کہ اچھے اثرات نہیں چھوڑتا بلکہ بعض اوقات یہ اُلٹا اثر دکھاتا ہے۔ حالانکہ پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کی سیرتِ طیبہ نشاندہی کرتی ہے کہ وہ ان دو فرائض کی انجام دہی میں انتہائی محبت و پیار اور لطف و کرم سے کام لیتے تھے۔ اسی بنا پر بڑے بڑے سخت مزاج افراد بھی بہت جلد ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے تھے۔

تفسیر منار میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں لکھا گیا ہے کہ:



"ایک نوجوان خدمت رسولؐ میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا کہ اے رسول خداؐ کیا اجازت ہے کہ میں زنا کروں اس بات پر وہاں کے لوگ برافروختہ ہوگئے اور اِدھر اُدھر سے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی لیکن آپؐ نے بڑے تحمل اور نرمی سے فرمایا میرے قریب آؤ! وہ اُن کے قریب آیا اور آنحضرتؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضرتؐ نے محبت اور پیار کے لہجے میں اس سے پوچھا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تیری ماں کے ساتھ یہ کام کیا جائے۔ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس طرح دوسرے لوگ بھی اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کی ماں کے ساتھ یہ کام کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تو اپنی بیٹی کے ساتھ اس عمل پر راضی ہے کہا نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس طرح دوسرے لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے ساتھ اس فعل پر راضی نہیں ہیں۔ آپؐ نے پھر پوچھا کہ اپنی بہن کے ساتھ اس کام کو پسند کرتے ہو۔ نوجوان نے انکار کیا اور اپنے سوال پر کلی طور پر نادم ہوا۔ بعد ازاں آپؐ نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اس کے لیے دعا کی اور فرمایا خدایا اس کے دل کو پاک کر اور اس کے گناہ کو معاف کر اور اس کے دامن کو معصیت کی آلودگی سے صاف رکھ۔ اس واقعہ کے بعد اس نوجوان کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت کام زنا تھا۔ یہ نہی عن المنکر میں ملائمت اور محبت کا ثمرہ تھا۔

ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجآءھم البینٰت

اس آیت میں از سرِ نو مسئلہ اتحاد اور تفرقہ بازی سے اجتناب کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کو گذشتہ اقوام مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح تفرقہ اور اختلاف کی راہ اختیار کرنے اور اپنے لیے عظیم عذاب مول لینے سے ڈراتی ہے اور درحقیقت انہیں اختلاف و تفرقہ بازی کے بعد کی گذشتہ لوگوں کی تاریخ کے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔

ان آیات میں اتحاد پر اصرار کرنے اور تفرقہ و نفاق سے اجتناب کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے معاشرے میں بھی ایسا ہونے والا ہے کیونکہ جہاں کہیں کسی چیز سے ڈرانے میں اصرار کیا جاتا ہے وہ اس کے وقوع کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے یہ پیشین گوئی کی تھی اور صراحت سے مسلمانوں کو یہ خبر دی تھی کہ یہودی قوم حضرت موسیٰؑ کے بعد ۷۱، اور عیسائی ۷۲ بہتر فرقوں میں بٹ گئی تھی اور میری اُمت میرے بعد تہتر ۷۳، فرقوں میں بٹ جائے گی[1]

ظاہری طور سے ستر کا عدد کثرت کی طرف اشارہ ہے اور اصطلاح کے مطابق اس سے صرف کسی چیز کی کثرت سمجھی جاتی ہے نہ کہ صحیح تعداد یعنی یہودیوں میں ایک فرقہ حق پر تھا اور بہت سے گروہ باطل پرست تھے۔ عیسائیوں کے درمیان باطل پرست فرقوں کی کثرت ہوگئی اور مسلمانوں میں ان سے بھی زیادہ فرقے بن جائیں گے۔

قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ کی اس پیشین گوئی کے مطابق مسلمان آنحضرتؐ کی وفات کے بعد صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے اور مذہبی عقائد بلکہ اصل دین کے معاملے میں پراگندہ ہوگئے یہاں تک کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے۔ نوبت بایں جا رسید کہ بعض اوقات تلوار زنی، سب و شتم اور ایک دوسرے پر لعنت سے دریغ نہ کیا گیا۔ معاملہ اتنا سنگین ہوتا گیا کہ بعض مسلمان ایک دوسرے کی جان و مال کو حلال سمجھنے

---

[1] یہ روایت مختلف شیعہ سنی طریقوں سے مروی ہے۔ شیعہ طریقوں سے یہ روایت خصال، معانی، احتجاج، امالی صدوق، اصل سلیم بن قیس اور تفسیر عیاشی میں منقول ہے اور سنی طریقوں سے یہ روایت درمنثور، جامع الاصول اور ملل و نحل میں نقل ہوئی ہے۔



گئے اور مسلمانوں کے درمیان آتشِ عداوت اور دشمنی پھیل گئی کہ کچھ مسلمان کفار سے جا ملے اور اپنے دینی بھائیوں سے جنگ وجدال کرنے پر تل گئے۔ یوں اتحاد و وحدت جس میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز مضمر تھا، اختلاف و انتشار میں بدل گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شقاوت و بدبختی میں مبتلا ہو گئے اور اپنی عظمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اولئك لهم عذاب عظيم

جو لوگ واضح دلیلوں کے بعد بھی دین میں اختلاف کرتے ہیں، وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ اختلاف و انتشار کا فوری نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں اور ہر قوم کی ذلت و خواری کے راز کو ان کے اختلاف و نفاق میں تلاش کرنا چاہیے۔

وہ معاشرہ جس کی قدرت و توانائی کی بنیاد اس کے ارکان کی تفرقہ بازی کے تیشہ سے پاش پاش ہو جائے، ان کی سرزمین ہمیشہ غیروں کی جولانگاہ بن جاتی ہے اور کسی سامراجی حکومت کے قلمرو میں داخل ہو جاتی ہے۔ واقعاً یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔ ——

باقی رہا آخرت کا عذاب تو جیسا قرآن نے بھی بیان کیا ہے وہ اس عذاب سے کہیں زیادہ سخت ہے اور وہ تفرقہ ڈالنے والوں کے انتظار میں ہے۔ ——

۱۰۶۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ○

۱۰۷۔ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

ترجمہ

۱۰۶ (نفاق ڈالنے والوں پر وہ عظیم عذاب) اس دن ہو گا جب کچھ چہرے سفید اور کچھ سیاہ ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) کیا تم ایمان (اور سایۂ اخوت میں آنے) کے بعد کافر ہو گئے تھے تو (اب) اپنے کئے ہوئے کفر کے عذاب کا مزہ چکھو۔

۱۰۷ لیکن وہ جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

نورانی اور تاریک چہرے

یوم تبیض وجوه وتسود وجوه

اس تنبیہ کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں تفرقہ بازی، نفاق اور کفر و جاہلیت کے زمانے کے آثار کی طرف پلٹ جانے کے بارے میں



کی گئی تھی، ان دو آیات میں ان کے آخری نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح کفر، تفرقہ بازی، نفاق وجاہلیت کی طرف پلٹ جانا روسیاہی کا سبب ہے اور کس طرح اسلام وایمان اور اتحاد وخلوص سفید روئی کا سبب ہیں۔

مندرجہ بالا آیات تصریح کر رہی ہیں کہ روزِ قیامت کچھ چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ تاریک۔ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیوں اختیار کیا اور اسلام کے زیر سایہ اتحاد واخوت کی راہ اپنانے کے بعد نفاق و جاہلیت کی راہ کیوں اختیار کی۔ ان کے مقابلے میں وہ مومنین جو متحد ومتفق رہے ہوں گے دریائے رحمتِ الٰہی میں ڈوب جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے وہاں راحت وآرام کی زندگی بسر کریں گے۔

کئی دفعہ یہ یاددہانی کرائی جا چکی ہے کہ دوسرے جہان میں انسان کی زندگی کے حالات وکیفیات اور جزا وسزا اس جہان کے اعمال اور افکار کے مجسمے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس جہان میں جو کام بھی انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ روح کی گہرائیوں میں وسیع اثرات مرتب کرتا ہے ممکن ہے اس دنیا میں اسے نہ سمجھا جا سکے، لیکن قیامت میں یہ حقیقی صورت میں جلوہ گر ہوں گے اور چونکہ وہاں روح کی حاکمیت وتجلی زیادہ ہوگی اس لیے اس کے آثار جسم پر بھی مرتب ہوں گے۔ جیسا کہ اس جہان کا ایمان واتحاد سفید روئی کا سبب ہے اور اس کے برعکس بے ایمان لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اگلے جہان میں یہ مجازی سفیدی اور سیاہی حقیقی شکل اختیار کرے گی اور لوگ روشن یا سیاہ چہروں کے ساتھ محشور ہوں گے۔

قرآن کی دیگر آیات بھی اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ مثلاً جو لوگ بار بار گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا (یونس: ۲۷)

گویا ان کے چہروں کو اندھیری رات کے تاریک ٹکڑوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔

جو لوگ خدا پر جھوٹ اور افترا باندھتے ہیں ان کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے:

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ (زمر: ۶۰)

قیامت کے دن تو ان لوگوں کو دیکھے گا جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں کہ ان کے چہرے سیاہ ہیں اور یہ سب کچھ ان کے کئے ہوئے اعمال کی پاداش ہے۔

۱۰۸۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ○

۱۰۹ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○

ترجمہ

۱۰۸ کتاب کی یہ برحق آیات ہیں جنہیں ہم تیرے سامنے پڑھ کر سناتے ہیں اور خدا ہرگز عالمین کے لیے ظلم وستم کا ارادہ نہیں رکھتا



۱۰۹ اور (کس طرح ممکن ہے کہ خدا ظلم چاہے جبکہ) جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اس کی ملکیت میں ہے اور تمام کاموں کی بازگشت اسی کی طرف ہے (اور اس کے حکم سے ہے)۔

تفسیر

تلك آيات الله نتلوها عليك بالحق وما الله يريد ظلما للعالمين۔

مندرجہ بالا آیت گذشتہ مطالب اتحاد و اتفاق، ایمان و کفر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ان کے نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ خدا کی برحق آیات ہیں جو ہم تیرے سامنے پڑھتے ہیں اور ان احکامات کی خلاف ورزی کی وجہ سے جو کچھ لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے ان کے اعمال کی پاداش ہے اور خداوند تعالیٰ کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ وہی بُرے اثرات ہیں جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے فراہم کئے ہیں۔

ولله ما في السماوات وما في الارض والى الله ترجع الامور

یہ آیت خدا کے ظالم نہ ہونے پر دو دلیلیں پیش کرتی ہے:

پہلی یہ کہ وہ خدا جو ان تمام کا خالق و مالک ہے، اس کے بارے میں ظلم کا تصور نہیں ہو سکتا کیونکہ ظلم و زیادتی تو وہ کرتا ہے جس کے پاس وہ چیز نہ ہو جو دوسروں کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اسے حاصل کرنے کے لیے وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔

دوسری دلیل یہ کہ ظلم و ستم کا تصور اس کے بارے میں ہو سکتا ہے جس کی خوشنودی حاصل کئے بغیر کوئی کام وقوع پذیر ہو سکتا ہو لیکن اس ذات کے بارے میں ظلم و ستم بے معنی کہ جس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام پذیر نہیں ہو سکتا اور تمام امور کائنات کا آغاز و انجام اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔

۱۱۰۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ○

ترجمہ

۱۱۰ تم وہ بہترین قوم تھے جسے لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور خدا پر ایمان لے آؤ اور اگر دیگر اہل کتاب (اس پروگرام اور واضح آئین پر) ایمان لے آئیں تو ان کے لیے فائدہ ہے لیکن اُن میں سے تھوڑے ہی صاحبِ ایمان ہیں ورنہ اکثر فاسق (اور پروردگار کی اطاعت سے خارج) ہیں۔



تفسیر

فتنہ وفساد کا مقابلہ کرنے اور دعوتِ حق کی یاد دھانی

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف۔

اس آیت میں امر بالمعروف نہی عن المنکر اور خدا پر ایمان رکھنے کی دعوت کا اعادہ کیا گیا ہے اور جیسا کہ آیہ ۱ کے ذیل میں کہا گیا ہے یہ آیت بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک اجتماعی فریضہ کے طور پر بیان کرتی ہے، جبکہ گذشتہ آیت نے اس کے ایک خاص مرحلہ کو بیان کیا تھا جو خصوصی اور واجب کفائی ہے اور اس کی تفصیلی تشریح بیان کی جا چکی ہے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین اُمت کہا گیا ہے جسے انسانی معاشرہ کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اصلاح ایمان، دعوتِ حق اور فتنہ وفساد کا مقابلہ کیے بغیر ممکن نہیں۔

ضمنی طور پر اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دو عظیم فرائض دین اسلام میں جو وسعت رکھتے ہیں وہ گذشتہ ادیان میں نہ تھی اور اس اُمت کا بہترین ہونا واضح ہے کیونکہ یہ آخری آسمانی دین کی حامل ہے اور آخری دین تکامل کی اساس پر کامل ترین دین ہے۔ مندرجہ بالا دو آیات میں مزید دو نکات کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے:

پہلا نکتہ یہ ہے کہ "کنتم" (تم تھے) فعل ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے یعنی تم گذشتہ زمانے میں بہترین اُمت تھے۔ اس لفظ کے بارے میں اگرچہ مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، لیکن اکثریت کا نظریہ یہ ہے کہ فعل ماضی کی تعبیر تاکید کے لیے ہے اور قرآن مجید میں اس قسم کی تعبیرات کثرت سے موجود ہیں۔ ———

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس مقام پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایمانِ خدا پر مقدم کیا گیا ہے جس سے ان دو عظیم خدائی فرائض کی اہمیت و عظمت مترشح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان دو عظیم فرائض کی انجام دہی دائرہ ایمان پھیلانے اور تمام انفرادی و اجتماعی قوانین کے اجراء کی ضمانت ہے اور عملی طور پر اجراء قانون کا ضامن خود قانون پر مقدم ہوتا ہے۔ تمام باتوں کو چھوڑ کر اگر ان دو فرائض کو انجام نہ دیا جائے تو دلوں میں ایمان کی جڑیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں اور اس کے ستون بھی گر جاتے ہیں۔ اسی سبب سے انہیں ایمان پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اس بیان سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مسلمان اس وقت تک ایک ممتاز اُمت شمار ہوتے رہیں گے جب تک نیکی کی دعوت دینے اور فتنہ وفساد کا مقابلہ کرنے کو فراموش نہیں کریں گے اور جب انہوں نے اس سے صرفِ نظر کر لیا نہ یہ بہترین اُمت رہیں گے اور نہ انسانی معاشرے کے لیے فائدہ مند۔

اس بات کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیے کہ اس آیت میں تمام مسلمانوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جیسا کہ قرآن میں کئی مقامات پر یہی انداز و روش ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سے مہاجرین یا سابق مسلمان مراد لیے ہیں لیکن اس پر کوئی دلیل موجود نہیں۔

ولو امن اھل الکتاب لکان خیرا لھم منھم المومنون واکثرھم الفاسقون

بعدازاں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ مذہب جو اس طرح روشن ہے اور وہ قوانین جو اس قدر باعظمت ہیں ان کے فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بنا بریں اگر اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ان باتوں پر ایمان لے آئیں تو ان کا اپنا ہی فائدہ ہے، لیکن بہت افسوس کا مقام ہے کہ ان کی اقلیت نے جاہلانہ تعصب پر ٹھوکر مار کر کھلے دل سے اسلام قبول کیا ہے جب کہ ان کی اکثریت فرمانِ خداوندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے متعلق اپنی کتب میں موجود بشارتوں کی بھی پرواہ نہیں کی اور وہ اپنے کفر و تعصب پر اسی طرح ڈٹے رہے۔

١١١۔ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ○

١١٢۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○

ترجمہ

١١١۔ اور وہ (اہل کتاب خصوصاً یہودی) تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار و اذیت کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔

١١٢۔ وہ جہاں کہیں ہوں گے ان پر ذلت و رسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ وہ خدا سے رابطہ قائم کریں (اور اپنی ناپسندیدہ روش پر تجدیدِ نظر کریں) یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے (ادھر ادھر سے مدد حاصل کر لیں)۔

اور وہ خدا کے غضب میں گھرے ہوئے ہیں اور بیچارگی کی مہر ان پر ثبت ہو چکی ہے۔ کیونکہ وہ آیاتِ خداوندی کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ سب کچھ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے اور وہ (دوسروں کے حقوق پر) تجاوز کرتے ہیں۔

شانِ نزول

جب بعض روشن ضمیر سردارانِ یہود مثلاً عبداللہ بن سلام اپنے رفقاء کے ہمراہ دینِ اسلام میں داخل ہو گئے تو یہودیوں کے بعض سرداران کے پاس آئے اور انہیں سرزنش و ملامت کی یہاں تک کہ انہیں دھمکی دی اور کہا کہ تم اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑ کر اسلام کیوں لے آئے ہو۔ اس پر مندرجہ بالا آیات انہیں اور باقی مسلمانوں کو مژدہ سنانے کے لیے نازل ہوئیں۔



تفسیر

لن یضروکم الا اذی وان یقاتلوکم یولوکم الادبار ثم لا ینصرون

بعض مسلمان اپنی سابقہ کافر قوم کے ہاتھوں مصیبت میں مبتلا تھے وہ انہیں قبولِ اسلام پر سرزنش و ملامت کرتے تھے اور بعض اوقات انہیں دھمکیاں دیتے تھے یہ آیت انہیں بشارت دیتی ہے کہ مخالفین تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور بہت کم ضرر پہنچا سکتے ہیں اور بد کلامی سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتے۔

ان دونوں آیات میں درحقیقت مسلمانوں کے لیے چند پیشین گوئیاں اور خوشخبریاں ہیں جو تمام کی تمام حضورؐ کے دور میں ظاہر ہوئیں:

۱ اہلِ کتاب کبھی مسلمانوں کو کوئی قابلِ اعتنا ضرر نہیں پہنچا سکیں گے اور ان کے معمولی نقصانات دیرپا نہیں ہوں گے (لن یضروکم الا اذی)۔

۲ جب وہ مسلمانوں کے ساتھ میدانِ کارزار میں برسرِ آزما ہوں گے تو انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخری فتح و کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوگی اور یہودیوں کی حمایت کے لیے کوئی بھی نہیں کھڑا ہوگا (و ان یقاتلوکم یولوکم الادبار ثم لا ینصرون)۔

۳ یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوں گے اور ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں گے مگر یہ کہ اپنے پروگرام کو تبدیل کریں اور خدا کی راہ پر چلیں یا دوسرے لوگوں سے مل جائیں اور وقتی طور پر ان کی طاقت سے فائدہ اٹھائیں (ضربت علیھم الذلۃ این ما ثقفوا)۔

بہت جلد یہ تینوں وعدے نبی اکرمؐ کے زمانے میں پورے ہو گئے خصوصاً حجاز کے یہودی (بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع، بنی مصطلق اور خیبر کے یہودی) کئی مرتبہ مسلمانوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ہوئے اور بالآخر سب شکست سے دوچار ہو کر روپوش ہو گئے۔

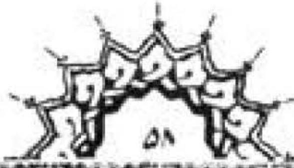
ضربت علیھم الذلۃ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔

ثقفوا کا مادہ ثقف (بروزن سقف) ہے۔ اور ثقافت کے لغوی معنی کسی چیز کو مہارت کے ساتھ پالینے کے ہیں اور جس چیز کو انسان باریک بینی اور مہارت کے ساتھ حاصل کرے اسے ثقافت کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے اس جملے میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جہاں کہیں ہوں ذلت کی مہر ان کی پیشانی پر ثبت ہو چکی ہے۔

اگرچہ ان آیات میں یہودیوں کا نام لے کر ان کو نہیں پکارا گیا، تاہم سورۂ بقرہ کی آیت ۶۱ اور ان آیات کے قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بھی یہودیوں کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد اس جملے کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ صرف دو صورتیں ہیں جن کی وجہ سے وہ اس ذلت کی مہر کو مٹا سکتے ہیں پہلی صورت خدا کی طرف بازگشت اور اس سے رشتہ جوڑنا ہے اور اس کے سچے دین پر ایمان لانا ہے (الا بحبل من اللہ) یا لوگوں سے وابستگی اور ان کا سہارا لینا ہے (وحبل من الناس)۔

اگرچہ ان دو تعبیرات (حبل من اللہ وحبل من الناس) کے بارے میں مفسرین نے کئی احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن جو کچھ کہا گیا



ہے وہ آیت کے معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ جس وقت "حبل من الله" (خدا سے ارتباط) "حبل من الناس" (لوگوں سے ارتباط) کے مقابلے میں ہو تو اس سے دو مختلف معانی مراد ہوں گے نہ یہ کہ ان میں سے ایک ایمان لانے کے معنی میں ہے اور دوسرا مسلمانوں کی طرف سے امن و امان ہونے کے معنی میں۔

بنا برایں آیت کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ اپنی زندگی کے پروگرام پر تجدید نظر کریں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں اور اپنے انکار سے شیطنت و کینہ پروری کو مٹا دیں اور یا لوگوں سے وابستگی پیدا کر کے اپنی نفاق آلود زندگی کو جاری رکھیں۔

وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۔

"باؤ" لغت میں رجوع کرنے اور سکونت کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ خلاف ورزیوں کی بنا پر خدا کی سزا کی مستحق ہوگئی ہے اور وہ غضب خداوندی کو اپنی منزل مقصود قرار دے چکی ہے۔

"مسکنت" کے معنی ہیں "بیچارگی" بالخصوص ایسی سخت بیچارگی جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو اور یہ "سکونت" کے مادہ سے ہے۔ کیونکہ مسکین افراد کمزوری اور احتیاج کی وجہ سے اپنی جگہ سے حرکت کی قدرت نہیں رکھتے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ مسکین کا معنی صرف مال و دولت کی وجہ سے محتاج نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی کمزوری و ناتوانی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ مسکنت و ذلت میں یہ فرق ہے کہ "ذلت" دوسروں کی طرف سے وارد ہوتی ہے جبکہ "مسکنت" کسی شخص کی ذاتی اور اندرونی کم مائیگی و کم بینی کا معنی دیتی ہے۔

اس لحاظ سے اس جملے کا معنی یہ ہے کہ یہودی اول تو اپنی کارستانیوں کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے دھتکارے گئے ہیں اور غضب خدا میں گرفتار ہوئے ہیں پھر آہستہ آہستہ یہ ان کے لیے ایک ذاتی صفت بن گیا ہے حتیٰ کہ وہ تمام امکانات کے باوجود احساس حقارت میں مبتلا ہیں۔ اس لیے اس جملے میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۔

آیت کے آخری حصے میں یہودیوں کی بدبختی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اگر وہ ایسی بدبختی میں گرفتار ہیں تو اس کی وجہ نسلی و خاندانی ہے نہ کہ دوسری خصوصیات بلکہ یہ ان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اول تو یہ خدا کی آیات کا انکار کرتے تھے اور ثانیاً یہ کہ پیشوایان خلق اور نجات دہندگانِ بشر کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف نوعیت کے گناہوں، ظلم و ستم کرنا، دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنا اور باقی لوگوں کے منافع پر تجاوز کرنا میں مبتلا تھے اور مسلّم ہے کہ جو قوم اس قسم کے اعمال کا ارتکاب کرے گی، اس کی حالت بھی ان سے مشابہ ہوگی۔

یہودیوں کی عبرت ناک داستان

یہودیوں کی تاریخ گذشتہ آیات کے مطالب و مفاہیم کی مکمل تائید کرتی ہے اور ان کی موجودہ حالت بھی اس کی بشارت دیتی ہے۔
ان آیات میں ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ (ان پر مہر ذلت لگ چکی ہے) تشریعی حکم نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین اس کے قائل ہیں بلکہ یہ تکوینی ہے اور تاریخ کا اٹل فیصلہ ہے کہ جو قوم گناہوں میں ڈوبی ہوئی ہو اور جن کا پروگرام دوسروں کے حقوق پر ہاتھ ڈالنا اور بشریت کے رہنماؤں کو قتل کرنے پر مشتمل ہو ان کا انجام کار یہی ہوگا مگر یہ کہ وہ اپنی طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کریں اور اس راستے سے پلٹ آئیں اور یا دوسرے لوگوں



سے رابطہ قائم کرکے چند روزہ زندگی گذاریں۔ جو واقعات اس دور میں اسلامی ممالک میں رونما ہورہے ہیں یعنی مسلمانوں کے مقابلے میں صہیونیت کا ایک خاص مقام حاصل کرنا، انہیں دوسروں کی حمایت حاصل ہونا اور بہت سے دیگر عوامل جن کی وجہ سے انہیں مقام حاصل ہے، یہ سب امور اس حقیقت کے شاہد ہیں جو ان آیات سے معلوم ہوتی ہے۔

شاید گذشتہ تلخ تجربات اور ان حوادث سے جنہوں نے ان کی تاریخ کی راہ کو بدل دیا ہے یہ باعث نہیں کہ وہ اپنے پروگرام میں تجدید نظر کریں اور وہ دیگر اقوام کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ پیش آئیں اور دوسروں کے حقوق کا احترام کرکے ان کے ساتھ صلح آمیز زندگی گذاریں۔

۱۱۳۔ لَيْسُوا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○

۱۱۴۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

۱۱۵۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ○

ترجمہ

۱۱۳ وہ سب برابر نہیں ہیں۔ اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو (حق و ایمان کے ساتھ) قائم ہے اور وہ اوقات شب میں مسلسل حالتِ سجدہ میں آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں۔

۱۱۴ وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیک کاموں کی انجام دہی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں اور وہ نیک لوگوں میں سے ہیں۔

۱۱۵ جو نیک اعمال وہ سرانجام دیتے ہیں انہیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جائے گا (اور وہ اچھی جزا پائیں گے) اور خدا پرہیزگاروں کو جانتا ہے۔

شانِ نزول

کہا جاتا ہے کہ جب عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھا۔ کچھ لوگوں کے ہمراہ مسلمان ہوا تو یہودیوں کے سرداروں کو بہت رنج پہنچا اور وہ اس بات کے درپے ہوگئے کہ انہیں شرارت کا الزام دیں تاکہ یہ لوگوں کی نگاہ میں گر جائیں تاکہ ان کا عمل دوسروں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید نہ بنے لہٰذا علمائے یہود نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم سے صرف شریر لوگ مسلمان ہوئے ہیں اگر وہ صحیح لوگ ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کا دین نہ چھوڑتے اور ملت یہود کے ساتھ خیانت نہ کرتے۔ خداوند عالم نے ان آیات کو نازل کرکے ان کا دفاع کیا ہے۔



تفسیر

"لیسوا سواء من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون اٰیات اللہ اٰنآء اللیل"

گذشتہ آیات میں یہودیوں کے بُرے افراد کی شدید مذمت کے بعد قرآن کریم اس آیت میں عدالت کے پیش نظر اور ان کے اچھے افراد کے حقوق کے احترام کی وجہ سے اور یہ حقیقت بتانے کے لیے، کہ ان سب کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا، کہتا ہے کہ اہل کتاب تمام کے تمام ایک جیسے نہیں بلکہ تباہ کار افراد کے مقابلے میں ایسے نیک طینت افراد بھی موجود ہیں جو خدا کی اطاعت اور ایمان پر ثابت قدم ہیں وہ ہمیشہ نیم شب کو آیاتِ خدا کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور عظمت پروردگار کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں اور خدا و روز جزاء پر ایمان رکھتے ہیں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ وہ صالح اور باایمان افراد ہیں۔

اسی طرح بجائے اس کے کہ خدا یہودی نسل کی کلی طور پر مذمت کرے اور ان کی مخالفت کرے یا ان کے خون کو بُرا کہے، صرف ان کے بُرے اعمال کی نشاندہی کرتا ہے اور ان افراد کی تعظیم و تکریم کرتا ہے اور اچھائی سے یاد کرتا ہے جنہوں نے فاسد اکثریت سے جدا ہو کر حق و ایمان کے سامنے سرِتسلیم خم کیا ہے اور یہی اسلام کی روش ہے کہ کبھی رنگ یا نسل وقبیلہ کو مدنظر نہیں رکھتا بلکہ وہ صرف لوگوں کے عقائد اور ان کے اعمال کو نظر میں رکھتا ہے۔

ضمناً چند ایک روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیات صرف عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھیوں کے لیے منحصر نہیں بلکہ ان کے علاوہ نجران کے چالیس عیسائی، حبشہ کے بائیس افراد اور آٹھ رومی بھی اس آیت کے مصداق ہیں اور اہلِ کتاب کی وسیع تعبیر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"وما یفعلوا من خیر فلن یکفروہ"

یہ آیت دراصل پہلی آیات کی تکمیل کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے اس گروہ کے نیک اعمال کی بہترین جزا ہوگی یعنی گذشتہ عمر میں اگرچہ غلطیوں کے مرتکب رہے ہوں، جب انہوں نے اپنی روش بدلی اور پرہیزگاروں کی صف میں شامل ہوگئے تو یہ اپنے نیک اعمال کا ثمرہ دیکھ لیں گے اور خدا کی طرف سے ہرگز ناقدری نہیں پائیں گے۔

"واللہ علیم بالمتقین"

باوجودیکہ خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے، اس جملے میں خصوصیت سے کہتا ہے کہ خداوند عالم پرہیزگاروں سے آگاہ ہے اور یہ تعبیر پرہیزگار لوگوں کی اقلیت کی غمازی کرتی ہے۔ خصوصاً پیغمبرؐ کے زمانے کے یہودیوں میں سے تو یہ راستہ اختیار کرنے والے بہت ہی اقلیت میں تھے اور یہ فطری بات ہے کہ اس قسم کے کم تعداد افراد نظر میں نہیں رہتے لیکن پروردگار عالم کے وسیع علم کی تیز نگاہ سے یہ لوگ ہرگز مخفی نہیں رہیں گے اور خدا اُن سے آگاہ ہے۔ ان کے نیک اعمال کم ہوں یا زیادہ ہرگز رائیگاں نہیں ہوں گے۔

لہ "آناء" دراصل "انا" (بروزن "دنا") کی جمع ہے اور "انا" (بروزن "فنا") کا معنی ہے اوقات۔



۱۱۶۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ○

۱۱۷۔ مَثَلُ مَا يُنۡفِقُوۡنَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُ‌ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰـكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۱۶ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ ہرگز اپنے اموال اور اولاد کے ذریعے اللہ کے عذاب وسزا سے نہیں بچ سکتے۔ وہ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے۔

۱۱۷ جو کچھ وہ اس دنیاوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں وہ جلانے والی (گرم) ہوا کی مانند ہے جو اس قوم کی زراعت پر چل پڑے جس نے اپنے اوپر ظلم کیا (اور نامناسب وقت پر زراعت کی) پس وہ اسے نیست و نابود کردے۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

تفسیر

"ان الذین کفروا لن تغنی عنھم اموالھم ولا اولادھم من اللہ شیئا"

گذشتہ آیت میں حق جو اور باایمان افراد کی ستائش کی گئی ہے۔ ان کے مقابلے میں بے ایمان اور ستمگر لوگ ہیں ان کی حالت ان دو آیات میں بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، وہ لوگ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہرگز اپنے مال و دولت اور اولاد کی کثرت کے گھمنڈ میں خدا کی سزا سے چھٹکارہ نہیں پا سکتے کیونکہ روز جزا صرف نیک عمل، صدق ایمان اور خلوص نیت ہی انسان کے کام آئے گا نہ کہ اس جہان کے مادی امتیازات۔

"یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم"

اس دن مال و اولاد ذرہ برابر فائدہ نہیں دیں گے مگر یہ کہ وہ پاک و صاف دل لے کر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو۔

(الشعراء، آیہ ۸۸-۸۹)

مادی وسائل میں سے صرف دولت اور اولاد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے ہوا ہے کہ اہم ترین مادی سرمایہ ایک تو افرادی قوت ہے جس

کی طرف اولاد سے اشارہ کیا گیا ہے اور دوسرا اقتصادی سرمایہ ہے اور دیگر مادی وسائل کا سرچشمہ یہی دونوں چیزیں ہیں۔

قرآن واضح طور پر اعلان کر رہا ہے کہ صرف مال ومتاع اور افرادی قوت کے بل بوتے پر خدا کے ہاں امتیاز حاصل نہیں کیا جا سکتا اور انہی پر بھروسہ کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے مگر یہ کہ انہیں ایمان اور خلوص نیت کے ساتھ صحیح راستوں میں خرچ کیا جائے، ورنہ بصورت دیگر ان کے مالکوں کا انجام کار دائمی عذاب ہے (اولٰئِک اصحاب النار ھم فیھا خٰلدون)۔

"مثل ماینفقون فی ھٰذہ الحیوٰۃ الدنیا کمثل ریح فیھا صر........

صر اور اصرار ایک ہی اصل سے ہیں اور ان کے معنی شدت کے ساتھ جڑ واں چیز کو باندھنے کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد ہوا کی شدت وسختی ہے چاہے وہ ہوا جلانے والی ہو یا ٹھنڈی اور خشک کرنے والی۔

اس آیت میں ان کی ریاکارانہ سخاوت اور خرچ کرنے کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور ایک بہترین مثال کے ذریعے ان کے انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

قرآن کریم کفار کے خرچ کرنے کو سخت قسم کی جلانے والی یا بہت سرد اور خشک کر دینے والی ہوا سے تشبیہ دیتا ہے جو کسی زراعت پر چل پڑے اور اسے خشک کر دے۔ البتہ ہوا کی فطرت وطبیعت جلا دینے والی نہیں ہے چنانچہ نسیم بہار شگوفوں پر نوازش کرتی ہے۔ غنچوں کے دہن کھول دیتی ہے اور درختوں کے سانچوں میں روح پھونک کر انہیں بارآور کر دیتی ہے۔ اسی طرح انفاق اور خرچ کرنے کا سرچشمہ بھی ایمان وخلوص ہو تو اسی طرح ثمرآور ہے۔ وہ اجتماعی مشکلات کو بھی حل کرتا ہے اور احسان کرنے والے کے دل میں ایک دیرپا اثر بھی چھوڑ جاتا ہے اور اس کے قلب میں اچھی صفات اور فضائل کے سرچشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ لیکن اگر یہ حیات آفرین باد نسیم طوفان بن جائے یا بہت زیادہ ٹھنڈی ہوا میں تبدیل ہو جائے تو وہ جس پھول اور سبزہ پر چلے گی اسے تباہ کر دے گی۔

بے ایمان اور گناہ آلود افراد کا چونکہ انفاق میں صحیح مقصد نہیں ہوتا اس لیے خود نمائی اور ریاکاری کی روح کو جلانے والی خشک ہوا ان کے انفاق کی زراعت پر چل پڑتی ہے اور اسے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ اس قسم کے اخراجات نہ اجتماعی مشکلات کا سدباب کر سکتے ہیں (چونکہ زیادہ تر یہ بے جا صرف ہوتے ہیں) اور نہ خرچ کرنے والے کے لیے کوئی اخلاقی ثمرہ دیتے ہیں۔ توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ارشاد ہوا ہے: حرث قوم ظلموا یعنی اس جلانے اور خشک کرنے والی ہوا کا نشانہ ایسے لوگوں کی زراعت ہے جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ زراعت کے لیے وقت اور جگہ کے انتخاب میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے اور انہوں نے ایسی زمین میں تخم ریزی کی ہے کہ جو طوفانی ہواؤں کی زد میں تھی اور ایسا وقت چنا ہے جو گرم ہوا کے چلنے کا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا ہے۔ یوں ہی بے ایمان افراد انفاق کرتے وقت اور جگہ کے انتخاب میں اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور اپنا سرمایہ نامناسب مقام پر برباد کرتے ہیں گذشتہ تفصیل اور آیت کے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تشبیہ درحقیقت دو علیحدہ علیحدہ چیزوں کے درمیان ہے ایک تو ان کے انفاق کو بے موقع بے محل زراعت سے تشبیہ دی گئی ہے اور دوسری خرچ کرنے کی وجہ اور علت کو ٹھنڈی اور جلانے والی ہوا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بنا بر ایں آیت میں کچھ تقدیر ضرور ہے اور "مثل ماینفقون" کے معنی یہ ہیں کہ ان کے انفاق کے اسباب وعلل کی مثال خشک ہرا اور جلانے والی ہوا کی طرح ہے (غور کیجئے گا)۔



بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت ان اموال کی طرف اشارہ کرتی ہے جو دشمنانِ اسلام دین کو تباہ و برباد کرنے کے لیے صرف کرتے تھے اور اس کے ذریعے وہ مخالفینِ اسلام کو رسولِ اسلام کے خلاف اکساتے تھے یا وہ اموال مراد ہیں جو یہودی اپنے علماء کو کتبِ آسمانی میں تحریف کرنے کے عوض دیتے تھے لیکن واضح ہے کہ آیت کے مفہوم میں عمومیت ہے اور یہ ان لوگوں کے علاوہ اس قسم کے باقی افراد کے لیے بھی ہے۔

"وما ظلمهم الله ولكن انفسهم يظلمون"

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ خدا نے اس سلسلے میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور وہ اپنا سرمایہ خود برباد کرتے ہیں کیونکہ فاسد اور بُرے کام کا نتیجہ فاسد اثر کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

۱۱۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ○

۱۱۹۔ هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

۱۲۰۔ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ○

ترجمہ

۱۱۸۔ اے ایمان والو! اپنوں کے علاوہ کسی کو رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں کوتاہی نہیں کریں گے وہ تمہاری تکلیف اور رنج پر خوش ہوتے ہیں۔ ان کے دل کی دشمنی اور عداوت ان کے منہ سے نکل پڑتی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید تر ہے۔ ہم نے آیات (اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر) تمہارے لیے واضح کر دی ہیں بشرطیکہ تم عقل و خرد سے کام لو۔

۱۱۹۔ تم عجیب لوگ ہو کہ انہیں دوست رکھتے ہو لیکن وہ تمہیں دوست نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو (لیکن



وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے) اور جس وقت وہ تم سے ملتے ہیں تو (جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ و غضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں (ان سے) کہہ دو کہ تم اپنے غصہ میں جل مرو خدا سینوں میں چھپے ہوئے (اسرار) سے آگاہ ہے۔

۱۲۰ اگر تمہیں کوئی راحت ملتی ہے تو انہیں بُرا لگتا ہے اور اگر تمہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آجائے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں لیکن تم اگر (ان کے مقابلے میں) ثابت قدمی اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو ان کی (خائن) سازشیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ خدا اس چیز پر احاطہ رکھتا ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب کچھ مسلمان یہودیوں سے قرابت داری و ہمسائگی رشتہ رضاعت یا قبل اسلام کے عہد و پیمان کی وجہ سے دوستی رکھتے تھے اور ان کے ساتھ اس خلوص و محبت سے پیش آتے تھے یہاں تک مسلمانوں کے بھید اُن پر ظاہر کر دیتے تھے۔ اس طریقے سے یہودی مسلمانوں کے رازوں سے آگاہ ہو جاتے تھے حالانکہ وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اگرچہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو ان کے دوست ظاہر کرتے تھے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ چونکہ وہ لوگ تمہارے دین میں نہیں آئے اس لیے انہیں اپنا رازدار نہ بناؤ کیونکہ وہ تمہارے بارے میں کسی برائی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ مصیبت میں رہو۔

تفسیر

اغیار کو رازداں نہ بناؤ

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ ......"

"بطانت" کے لغوی معنیٰ ہیں نچلا لباس اور اس کے مقابلے میں "ظھارہ" (اوپر کا لباس) ہے یہاں یہ رازداں سے کنایہ ہے اور "خبال" اصل میں کسی چیز کے نیست و نابود ہونے کے معنیٰ میں ہے اور زیادہ تر ان نقصانات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو عقل انسانی پر اثر انداز ہوں۔

گذشتہ آیات میں مسلمانوں اور کفار کا تقابل کیا گیا۔ اس آیت میں ایک حساس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور ایک حسین و لطیف تشبیہ کے ذریعے تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے ہم مسلک افراد کے علاوہ کسی کو اپنا دوست اور ہمراز نہ بناؤ اور اغیار کو اپنے اندرونی راز نہ بتاؤ یعنی کفار تمہاری دوستی کے لائق نہیں اور نہ ہی انہیں تمہارا دوست اور ہمراز ہونا چاہیے کیونکہ وہ مسلمانوں کو گزند پہنچانے میں



کوتاہی نہیں کرتے (لا یالونکم خبالا)۔ سابقہ دوستی ہرگز ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی کہ وہ مذہب و مسلک کی بنا پر تمہاری تکلیف و نقصان کا نہ سوچیں بلکہ ان کی ہمیشہ خواہش یہ ہے کہ تم غم و اندوہ میں مبتلا رہو (ودوا ما عنتم)۔

وہ عموماً اپنی رفتار و گفتار میں احتیاط برتتے ہیں اور سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں تاکہ تم پر ان کے راز فاش نہ ہوں اور نہ ان کی مخفی باتوں کا تمہیں علم ہو۔ لیکن اس کے باوجود دشمنی و عداوت کے آثار ان کی باتوں سے چھلکتے ہیں اور کبھی کبھار لاشعوری طور پر کچھ باتیں ان کی زبان پر آ جاتی ہیں جو ان کے دلوں میں آگ کی چنگاریوں کی مانند ہیں اور ان کی وجہ سے ان کے باطن کو سمجھا جا سکتا ہے (قد بدت البغضاء من افواههم)۔

آیت وہ حقیقت بیان کر رہی ہے جس کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبے میں اشارہ فرمایا ہے کہ:

"ما اضمر احد شيئا الا ظهر في صفحات وجهه او فلتات لسانه"

کوئی شخص اپنے باطن میں کسی راز کو نہیں چھپا سکتا مگر یہ کہ وہ اس کے چہرے کے رنگ اور اکھڑی اکھڑی، توجہ سے خالی باتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس سے خداوند عالم نے دشمنوں کے باطن کو پہچاننے کے طریقہ کی نشاندہی کی ہے اور ان کی اندرونی باتوں کے متعلق فرمایا ہے کہ جو کچھ عداوت اور دشمنی وہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے کئی درجے زیادہ ہے جس کا وہ زبان سے اظہار کرتے ہیں (وما تخفی صدورهم)۔

اس کے بعد مزید کہا گیا کہ ہم نے یہ آیات اس لیے بیان کی ہیں کہ ان میں تدبر کرنے سے تم دوست، دشمن کو بآسانی سمجھ سکو گے اور دشمنوں کے شر سے خلاصی حاصل کرو گے (قد بينا لكم الايات ان كنتم تعقلون)۔

ها انتم اولاء تحبونهم ولا يحبونكم وتومنون بالكتاب كله ....

اے گروہ مسلمین! تم ان سے قرابت، ہمسائیگی یا کسی اور سبب سے دوستی کا رشتہ قائم کرتے ہو مگر اس سے غافل ہو کہ وہ تمہیں ہرگز دوست نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم اللہ کی طرف سے نازل کردہ تمام آسمانی کتب پر ایمان رکھتے ہو (چاہے وہ تمہاری کتاب ہو یا ان کی آسمانی کتب) لیکن وہ تمہاری آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

"واذا لقوكم قالوا امنا واذا خلوا عضوا عليكم الانامل من الغيظ"

اہل کتاب کا یہ گروہ دوغلا پن کرتا ہے جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ہم تمہارے دین کی تصدیق کرتے ہیں لیکن جب علیحدگی میں ہوتے ہیں تو کینہ و عداوت اور غصے سے اپنی انگلیوں کی پوریں کاٹتے ہیں (قل موتوا بغيظكم)۔ کہہ دو! اپنے غصے میں جل مرو اور یہ غیظ و غضب مرتے دم تک تم سے جدا نہیں ہو گا۔

"ان الله عليم بذات الصدور"

تم ان کی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو لیکن خدا ان کی خبر رکھتا ہے کیونکہ وہ دلوں میں چھپے ہوئے بھیدوں سے واقف ہے۔

ان تمسسكم حسنة تسؤهم وان تصبكم سيئة يفرحوا بها ....

اس آیت میں ان کے بغض و کینہ کی ایک علامت بیان کی گئی ہے کہ اگر تمہیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو وہ ناخوش ہوتے ہیں اور تمہیں



کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آئے تو وہ مسرور ہوتے ہیں۔

"وان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئًا ان اللہ بما یعملون محیط "

لیکن اگر تم ان کی کینہ پروریوں کے مقابلے میں صبر سے کام لو اور خوددار و پرہیزگار ہو جاؤ تو وہ اپنی خائن سازشوں کے ذریعے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس پر خدا مکمل کنٹرول رکھتا ہے۔ بنابرایں آیت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے دشمنوں کی بُری سازشوں سے بچنے کے لیے استقامت، ہوشیاری اور تقویٰ شرط ہے اور اسی صورت میں ان سے مامون رہنے کی ضمانت دی گئی ہے۔

مسلمانوں کے لیے تنبیہ

خداوند عالم اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو اپنا عزیز نہ سمجھیں اور مسلمانوں کی راز کی باتیں اُن کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ یہ خطرے کی نشاندہی عمومی شکل میں ہے، ہر زمانے اور ہر حالت میں مسلمانوں کو اس تنبیہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے لیکن تأسف ہے کہ قرآن کے بہت سے ماننے والے اس تنبیہ سے غفلت برتتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت سی مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

عصر حاضر میں بھی مسلمانوں کے گرد و پیش ایسے خفیہ دشمن ہیں جو اپنے آپ کو اُن کا دوست ظاہر کرتے ہیں اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی حمایت کا دم بھرتے ہیں لیکن ان کی کارستانیاں ان کا جھوٹ ظاہر کرتی ہیں۔ مسلمان ان کے ظاہر سے دھوکا کھا کر ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ مسلمانوں کے لیے پریشانی اور روسیاہی کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے اور ان کی راہ میں کانٹے بچھا کر ان کی مشکلات میں اضافہ کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں گذشتہ چند سالوں میں مسلمان دو بڑی جنگوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ پہلی جنگ میں انہیں دردناک شکست کا سامنا کرنا پڑا جب کہ دوسری جنگ میں وہ واضح کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئے اور دشمنوں کا دہشت ناک رعب اور ناقابل شکست ہونے کا افسانہ صحرائے سینا اور جولان کی پہاڑیوں کے معرکے میں پہلے دن دفن ہو گیا اور مسلمانوں نے پہلی مرتبہ کامیابی کا ذائقہ چکھا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ اس مختصر سی مدت میں حالات دگرگوں ہو گئے۔

اس سوال کے لیے ایک طویل و عریض جواب کی ضرورت ہے لیکن اس شکست و کامیابی کا ایک مؤثر عامل یہ تھا کہ پہلی جنگ میں اغیار جن میں سے بعض ظاہراً دوستی کا دم بھرتے تھے، مسلمانوں کے جنگی منصوبوں سے آگاہ تھے لیکن دوسری جنگ میں سوائے دو تین اسلامی سربراہوں کے کوئی ان کے منصوبوں سے واقف نہیں تھا اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا اور یہ اس حکم قرآنی کی عظمت کی بیّن دلیل تھی۔

۱۲۱۔ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

۱۲۲۔ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝



ترجمہ

۱۲۱ اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم صبح کے وقت اپنے گھر والوں سے مومنین کے لیے لشکر جنگ انتخاب کرنے باہر نکلے۔ خدا سننے اور جاننے والا ہے (جنگ کے بارے میں جو بات چیت کی گئی اور جو افکار بعضوں کے دماغ میں پرورش پا رہے ہیں خدا انہیں جانتا ہے)۔

۱۲۲ اور (یاد کرو) وہ وقت جب تم میں سے دو گروہوں نے سستی کا مظاہرہ کرنے کا مصمم ارادہ کیا (اور چاہا کہ وہ راستے سے پلٹ جائیں) اور خدا اُن کا مددگار تھا (کہ وہ اس فکر سے باز آجائیں) اور اہل ایمان کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر

"واذ غدوت من اهلك تبوئ المؤمنين مقاعد للقتال والله سميع عليم"

یہاں سے ایک اہم اور وسیع اسلامی واقعہ یعنی جنگ احد کے بارے میں آیات شروع ہوتی ہیں۔ گذشتہ آیات کے قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں اور اس وحشتناک جنگ کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بہت سے مفسرین کا بھی یہی نظریہ ہے۔

سب سے پہلے یہ پیغمبرؐ کے مدینہ سے کوہ اُحد کے دامن میں لشکر گاہ کے انتخاب کے لیے باہر آنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبرؐ یاد کرو! اس دن کو کہ صبح کے وقت تم اپنے عزیزو اقارب کو چھوڑ کر مدینہ سے باہر آئے تاکہ دشمن سے جنگ کرنے کے لیے مومنین کے لیے کوئی لشکر گاہ تیار کر سکو۔ اس روز مسلمانوں کے درمیان چہ میگوئیاں ہوئیں اس کی طرف ہم واقعہ اُحد کی تفصیل میں اشارہ کریں گے۔ مقام جنگ کے انتخاب کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف تھا کہ آیا مدینہ میں ہو یا باہر اور رسالتمآبؐ نے اکثریت کے نظریہ کو قبول کر لیا اور لشکر گاہ شہر سے باہر کوہِ اُحد کے دامن میں منتقل کر دی۔ فطری طور پر ان میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے کچھ باتیں دل میں چھپا رکھی تھیں اور کئی وجوہات کی بنا پر انہیں ظاہر کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے "والله سميع عليم" کا جملہ گویا ان سب کی حالت کی غمازی کرتا ہے کہ خدا تمہاری باتوں کو بھی سنتا ہے اور تمہارے مخفی بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔

"اذ همت طائفتان منكم ان تفشلا ......"

اس جملے کا روئے سخن اس ماجرے کے ایک اور پہلو کی طرف ہے اور وہ یہ کہ اس وقت مسلمانوں کے دو گروہ (تاریخ کے مطابق قبیلہ اوس میں سے بنو سلمہ اور خزرج میں سے بنو حارثہ) نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ جنگ سے پہلو تہی کرتے ہوئے ایک راستے سے مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ مدینہ کے اندر جنگ کرنے کے حق میں تھے لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس بات کو قبول نہ کیا علاوہ ازیں جیسا کہ واقعہ کی تفصیل سے معلوم ہو جائے گا کہ عبداللہ ابن سلول تین سو یہودیوں کے ہمراہ لشکر اسلام میں آیا تھا اور اس صورتحال کی وجہ سے وہ لوگ بھی مدینہ کی طرف واپس آگئے۔ اس بات نے دو مسلمان گروہوں کے لوٹ جانے کے پختہ ارادوں کو متزلزل اور کمزور کر دیا لیکن جیسا کہ آیت کے



ذیل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں گروہ اپنے ارادے سے پلٹ آئے اور دیگر مسلمانوں سے آملے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ "واللہ ولیھما وعلی اللہ فلیتوکل المومنون" یعنی خدا ان دو گروہوں کا مددگار و معاون ہے اور اہلِ ایمان کو خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

ضمنی طور پر اس بات کی طرف بھی متوجہ رہنا چاہیے کہ واقعہ اُحد کا ذکر ان آیات کے بعد جو کفار پر اعتماد نہ کرنے کے بارے میں تھیں، اس زندہ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے بھی گذر چکا ہے اور بعد میں بھی تفصیل کے ساتھ بتائیں گے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ان یہودیوں کو اجازت نہ دی جو بظاہر مسلمانوں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور وہ اسلامی لشکر گاہ میں ٹھہرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ پھر بھی بیگانے تھے اور ان نازک حالات میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ ہونا مناسب نہ تھا۔

جنگِ اُحد

اسبابِ جنگ

اس مقام پر ضروری ہے کہ پہلے جنگ اُحد کے مجموعی واقعات کا تذکرہ کیا جائے۔ روایات اور اسلامی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب کفارِ مکہ جنگ بدر میں شکست خوردہ ہوئے اور ستر مقتول ستر قیدی چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ گئے تو ابوسفیان نے لوگوں کو خبردار کیا کہ وہ اپنی عورتوں کو مقتولین بدر پر گریہ وزاری نہ کرنے دیں کیونکہ آنسو غم واندوہ کو دور کر دیتے ہیں اور اس طرح محمدؐ کی دشمنی اور عداوت ان کے دلوں سے زائل ہو جائے گی۔ ابوسفیان نے خود یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک جنگ بدر کے قاتلوں سے انتقام نہ لے اس وقت تک وہ اپنی بیوی سے ہمبستری نہیں کرے گا۔ بہرحال قریش ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے تھے اور انتقام کی صدا شہر مکہ میں بلند ہو رہی تھی۔

ہجرت کے تیسرے سال قریش تین ہزار سوار اور دو ہزار پیدل فوج کے ساتھ بہت سا سامانِ جنگ لے کر آپ سے جنگ کرنے کے لیے مکہ سے نکلے اور میدان جنگ میں ثابت قدمی سے لڑنے کے لیے اپنے بڑے بڑے بت اور اپنی عورتیں بھی ہمراہ لے آئے۔

جناب عباس کی بروقت اطلاع

حضرت رسول خداؐ کے چچا حضرت عباس جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے[1] اور قریش کے درمیان ان کے ہم مشرب و ہم مذہب تھے۔ لیکن اپنے بھتیجے سے فطری محبت کی بنا پر جب انہوں نے دیکھا کہ قریش کا ایک طاقتور لشکر پیغمبرؐ سے جنگ کرنے کے لیے مکہ سے نکلا ہے تو فوراً ایک خط لکھا اور قبیلہ بنی غفار کے ایک آدمی کے ہاتھ مدینہ بھیجا۔ عباس کا قاصد بڑی تیزی سے مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب آپؐ کو اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے سعد بن ابی کو عباس کا پیغام پہنچایا اور حتی الامکان اس واقعہ کو پردہ راز میں رکھنے کی کوشش کی گئی پیغمبرؐ نے مسلمانوں سے مشورہ کیا۔ جس دن عباس کا قاصد آپؐ کو موصول ہوا آپؐ نے چند مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مکہ و مدینہ کے راستے پر جائیں اور لشکر کفار کے کوائف معلوم کریں۔ آپؐ کے دو نمائندے اُن کے حالات معلوم کر کے بہت جلدی واپس آئے اور قریش کی قوت و طاقت سے آنحضرتؐ کو مطلع کیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ یہ طاقتور لشکر خود ابوسفیان کی کمان میں ہے۔

---

[1] ابھی ظاہراً مسلمان نہیں ہوئے تھے (مترجم)



پیغمبر اکرمؐ نے چند روز کے بعد تمام اصحاب اور اہلِ مدینہ کو بُلایا اور ان درپیش حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے میٹنگ کی۔ اس میں عباسؓ کے خط کو بھی پیش کیا گیا اور اس کے بعد مقامِ جنگ کے بارے میں رائے لی گئی۔ اس میٹنگ میں ایک گروہ نے رائے دی کہ جنگ دشمن سے مدینہ کی تنگ گلیوں میں کی جائے کیونکہ اس صورت میں کمزور مرد، عورتیں بلکہ کنیزیں بھی مددگار ثابت ہو سکیں گی۔ عبداللہ بن ابی نے تائیداً کہا یا رسول اللہ! آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ہم اپنے قلعوں اور گھروں میں ہوں اور دشمن ہم پر کامیاب ہو گیا ہو۔ اس رائے کو آپؐ بھی اس وقت کی مدینہ کی پوزیشن کے مطابق بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ کیونکہ آپؐ بھی مدینہ ہی میں ٹھہرنا چاہتے تھے لیکن نوجوانوں اور جنگجوؤں کا ایک گروپ اس کا مخالف تھا۔ چنانچہ سعد بن معاذ اور قبیلہ اوس کے چند افراد نے کھڑے ہو کر کہا اے رسولؐ خدا! گذشتہ زمانے میں عربوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ ہماری طرف نظر کرے جبکہ ہم مشرک اور بُت پرست تھے، اب جبکہ ہمارے درمیان آپؐ کی ذات ستودہ صفات موجود ہے۔ کس طرح وہ ہمیں دبا سکتے ہیں اس لیے شہر سے باہر جنگ کرنی چاہیے۔ اگر ہم میں سے کوئی مارا گیا تو وہ جامِ شہادت نوش کرے گا اور اگر کوئی بچ گیا تو اُسے جہاد کا اعزاز و افتخار نصیب ہو گا۔ اس قسم کی باتوں اور جوشِ شجاعت نے مدینے سے باہر جنگ کے حامیوں کی تعداد کو بڑھا دیا یہاں تک کہ عبداللہ بن ابی کی پیشکش سردخانے میں جا پڑی۔ خود پیغمبرؐ نے بھی اس مشورے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے طرفداروں کی رائے کو قبول فرمالیا اور ایک صحابی کے ساتھ مقامِ جنگ کا انتخاب کرنے کے لیے شہر سے باہر تشریف لے گئے آپؐ نے کوہِ اُحد کا دامن لشکر گاہ کے لیے منتخب کیا کیونکہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام زیادہ مناسب تھا۔

مسلمانوں کی دفاعی تیاریاں

جمعہ کے دن آپؐ نے یہ مشورہ لیا اور نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے آپؐ نے حمد و ثناء کے بعد مسلمانوں کو لشکر قریش کی آمد کی اطلاع دی اور فرمایا کہ تہ دل سے جنگ کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور پورے جذبے سے دشمن سے لڑو تو خداوند قدوس تمہیں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرے گا اور اسی دن آپؐ ایک ہزار افراد کے ساتھ لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپؐ خود لشکر کی کمان کر رہے تھے۔ مدینہ سے نکلنے سے قبل آپؐ نے حکم دیا کہ لشکر کے تین علم بنائے جائیں جن میں ایک مہاجرین اور دو انصار کے ہوں پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ اور اُحد کے درمیانی فاصلے کو پاپیادہ طے کیا اور سارے راستے لشکر کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ خود لشکر کی صفوں کو منظم و مرتب رکھا تاکہ وہ ایک ہی سیدھی صف میں مارچ کریں۔

ان میں سے کچھ ایسے افراد کو دیکھا جو پہلی دفعہ آپؐ کو نظر پڑے۔ پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں، بتایا گیا کہ یہ عبداللہ بن ابی کے ساتھی کچھ یہودی ہیں اور اس مناسبت سے مسلمانوں کی مدد کے لیے آئے ہیں آپؐ نے فرمایا کہ مشرکین سے جنگ کرنے میں مشرکین سے مدد نہیں لی جا سکتی مگر یہ کہ یہ اسلام قبول کریں۔ یہودیوں نے اس شرط کو قبول نہ کیا اور سب مدینہ کی طرف پلٹ آئے۔ یوں ایک ہزار میں سے تین سو افراد کم ہو گئے[1]

لیکن مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ عبداللہ بن ابی کی رائے کو رد کیا گیا تھا اس لیے وہ اثنائے راہ میں تین سو سے زیادہ افراد کو لے

---

[1] سیرت حلبی، جلد ۲، واقعہ جنگ اُحد۔



مدینہ کی طرف پلٹ آیا۔ بہر صورت پیغمبر اکرمؐ لشکر کی ضروری چھان پھٹک (یہودیوں یا ابن ابی کے ساتھیوں کو نکالنے) کے بعد سات سو افراد کو ہمراہ لے کر کوہِ اُحد کے دامن میں پہنچ گئے اور نماز فجر کے بعد مسلمانوں کی صفوں کو آراستہ کیا۔ عبداللہ بن جبیر کو پچاس ماہر تیر اندازوں کے ساتھ پہاڑ کے درہ پر تعینات کیا اور انہیں تاکید کی کہ وہ کسی صورت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں اور فوج کے پچھلے حصے کی حفاظت کریں اور اس حد تک تاکید کی کہ اگر ہم دشمن کا مکہ تک پیچھا کریں یا ہم شکست کھا جائیں اور دشمن ہمیں مدینہ تک جانے پر مجبور کر دے پھر بھی تم اپنا مورچہ نہ چھوڑنا۔
دوسری طرف سے ابوسفیان نے خالد بن ولید کو منتخب سپاہیوں کے ساتھ اس درہ کی نگرانی پر مقرر کیا اور انہیں ہر حالت میں وہیں رہنے کا حکم دیا اور کہا کہ جب اسلامی لشکر اس درہ سے ہٹ جائے تو فوراً لشکر اسلام پر پیچھے سے حملہ کر دو۔

آغازِ جنگ

دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے صف بستہ ہو کر جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے اور یہ دونوں لشکر اپنے نوجوانوں کو ایک خاص انداز سے برانگیختہ کرتے تھے۔ ابوسفیان کعبے کے بتوں کے نام لے کر اور خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے جنگی نوجوانوں کی توجہ مبذول کرا کے اُن کو ذوق و شوق دلاتا تھا جب کہ پیغمبر اسلام خدا کے اسم مبارک اور انعامات اعلیٰ کے حوالے سے مسلمانوں کو جنگ کی ترغیب دیتے تھے۔
اچانک مسلمانوں کی صدائے اللہ اکبر سے میدان اور دامن کوہ کی فضا گونج اٹھی جب کہ میدان کی دوسری طرف قریش کی لڑکیوں نے دف اور سارنگی پر اشعار گا گا کر قریش کے جنگجو افراد کے احساسات کو ابھارا۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی مسلمانوں نے ایک شدید حملے سے لشکر قریش کے پرخچے اُڑا دیئے اور وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور لشکر اسلام نے اُن کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ خالد بن ولید نے جب قریش کی یقینی شکست دیکھی تو اس نے چاہا کہ درہ کے راستے نکل کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کیا جائے لیکن تیر اندازوں نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ قریش کے قدم اُکھڑتے دیکھ کر تازہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے دشمن کو شکست خوردہ سمجھ کر مال غنیمت جمع کرنے کے لیے اچانک اپنی پوزیشن چھوڑ دی۔ ان کی دیکھا دیکھی درّے پر تعینات تیر اندازوں نے بھی اپنا مورچہ چھوڑ دیا۔ ان کے کمانڈر عبداللہ بن جبیر نے انہیں آپؐ کا حکم یاد دلایا مگر سوائے چند (تقریباً دس افراد) کے کوئی اس اہم جگہ پر نہ ٹھہرا۔
حکم پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ خالد بن ولید نے درّہ خالی دیکھ کر بڑی تیزی سے عبداللہ بن جبیر پر حملہ کیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پیچھے سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اچانک مسلمانوں نے ہر طرف چمکیلی تلواروں کی تیز دھار ول کو اپنے سروں پر دیکھا تو حواس باختہ ہو گئے اور اپنے آپ کو منظم نہ رکھ سکے۔ قریش کے بھگوڑوں نے جب یہ صورتحال دیکھی تو وہ بھی پلٹ آئے اور مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسی موقع پر لشکر اسلام کے بہادر افسر سید الشہداء حضرت حمزہؓ نے دوسرں مسلمانوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ سوائے چند شمع رسالت کے پروانوں کے باقی مسلمانوں نے دہشت زدہ ہو کر میدان کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس خطرناک جنگ میں جس نے سب سے زیادہ فداکاری کا مظاہرہ کیا اور پیغمبر اکرمؐ پر ہونے والے دشمن کے ہر حملے کا دفاع کیا وہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔ حضرت علیؑ بڑی جرأت اور بے جگری سے جنگ کر رہے تھے یہاں تک کہ آپ کی تلوار ٹوٹ گئی اور پیغمبر اکرمؐ نے اپنی تلوار آپؑ کو عنایت فرمائی جو ذوالفقار کے نام سے مشہور ہے۔ بالآخر آپؐ ایک مورچہ میں ٹھہر گئے اور حضرت علیؑ مسلسل آپ کا دفاع کرتے رہے یہاں تک کہ بعض مورخین کی تحقیق کے مطابق حضرت علیؑ کے جسم کو ساٹھ زخم آئے اور اسی موقع پر قاصد وحی نے پیغمبرؐ سے



عرض کیا: اے محمدؐ! یہ ہے مواسات و معاونت کا حق۔ تو آپؐ نے فرمایا (ایسا کیوں نہ ہو کر) علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ تو جبرئیل نے اضافہ کیا: میں تم دونوں سے ہوں۔ امام صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے قاصدِ وحی کو آسمان میں یہ کہتے ہوئے دیکھا کہ لاسیف الاذوالفقار وَلَا فَتٰی اِلَّا عَلِی " (ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علی کے سوا کوئی جوانمرد نہیں)۔

اس اثناء میں یہ آواز بلند ہوئی کہ محمدؐ قتل ہو گئے۔

کون پکارا کہ محمدؐ قتل ہو گئے ہیں

بعض سیرت نگار رقمطراز ہیں کہ ابن قمعہ نے اسلامی سپاہی مصعب کو پیغمبرؐ سمجھ کر اس پر کاری ضرب لگائی اور با آواز بلند کہا:

لات وعزیٰ کی قسم محمدؐ قتل ہو گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ افواہ چاہے مسلمانوں نے اڑائی یا دشمن نے لیکن مسلمانوں کے لیے نفع رساں ثابت ہوئی اس لیے کہ جب آواز بلند ہوئی تو دشمن میدان چھوڑ کر مکہ کی طرف چل پڑے ورنہ قریش کا فاتح لشکر جو حضورؐ کے لیے دلوں میں کینہ رکھتا تھا اور انتقام لینے کی نیت سے آیا تھا کبھی میدان نہ چھوڑتا قریش کے پانچ ہزار افراد پر مشتمل لشکر نے میدان جنگ میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد ایک رات بھی صبح تک وہاں نہ گذاری اور اسی وقت مکہ کی طرف چل پڑے۔

پیغمبرؐ کی شہادت کی خبر نے بعض مسلمانوں میں زیادہ اضطراب و پریشانی پیدا کر دی۔ جو مسلمان اب تک میدانِ کارزار میں موجود تھے، انہوں نے اس خیال سے کہ دوسرے مسلمان پراگندہ نہ ہوں آنحضرتؐ کو پہاڑ کے اوپر لے گئے تاکہ مسلمانوں کو پتہ چل جائے کہ آپؐ بقیدِ حیات ہیں۔ یہ دیکھ کر بھگوڑے واپس آگئے اور آنحضرتؐ کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے۔ آپؐ نے اُن کو ملامت و سرزنش کی کہ تم نے ان خطرناک حالات میں کیوں فرار کیا؟ مسلمان شرمندہ تھے انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: اے رسول خدا! ہم نے آپؐ کی شہادت کی خبر سنی تو خوف کی شدت سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یوں مسلمانوں کو جنگِ اُحد میں بہت زیادہ جانی و مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑا مسلمانوں کے ستر افراد شہید ہوئے اور بہت سے زخمی ہو گئے لیکن مسلمانوں کو اس شکست سے بہت بڑا درس ملا جو بعد کی جنگوں میں اُن کی کامیابی و کامرانی کا باعث بنا، آئندہ آیات میں انشاء اللہ اس کا ذکر آجائے گا۔

۱۲۳۔ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

۱۲۴۔ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ○

۱۲۵۔ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○



۱۲۶ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ○

۱۲۷ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ○

ترجمہ

۱۲۳ خدانے بدر میں تمہاری مدد کی (اور تم خطرناک دشمنوں پر فتحیاب ہوئے) جب کہ تم اُن کی نسبت ناتواں تھے پس خدا سے ڈرو (اور دشمن کے مقابلے میں حکم پیغمبرؐ کی نافرمانی نہ کرو) تاکہ تم اس کی نعمت کا شکر ادا کرنے والوں میں شمار ہو۔

۱۲۴ جس وقت تم مومنین سے کہتے تھے کہ کیا یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار ملائکہ (آسمان سے) اُتار کر تمہاری مدد کرے۔

۱۲۵ ہاں! (آج بھی) اگر تم صبر و استقامت اور پرہیزگاری اختیار کرو اور جب دشمن تم پر چڑھ آئے گا تو خدا پانچ ہزار مخصوص نشان رکھنے والے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا۔

۱۲۶ لیکن یہ سب کچھ تو صرف تمہیں بشارت دینے کے لیے اور تمہارے اطمینان کی خاطر ہے ورنہ کامیابی تو فقط خدائے توانا و حکیم کی طرف سے ہے۔

۱۲۷ (یہ وعدہ جو خدا نے تمہارے ساتھ کیا ہے) اس لیے ہے تاکہ لشکر کفار کے ایک حصے کو قطع کر دے یا انہیں ذلت کے ساتھ پلٹائے تاکہ وہ مایوس ہو کر (اپنے علاقے کو) پلٹ جائیں۔

تفسیر

جنگ کا خطرناک مرحلہ

جنگ اُحد کے اختتام پر مشرکین کا فتحیاب لشکر بڑی تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف پلٹ گیا لیکن راستے میں انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ انہوں نے اپنی کامیابی کو ناقص کیوں چھوڑ دیا۔ کیا ہی اچھا ہو کر مدینہ کی طرف پلٹ جائیں اور اسے غارت و تاراج کر دیں اور اگر محمدؐ زندہ ہوں تو انہیں قتل کر دیں تاکہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی فکر ختم ہو جائے۔ اسی بنا پر انہیں واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا اور در حقیقت جنگ اُحد کا یہ خطرناک مرحلہ تھا کیونکہ کافی مسلمان شہید اور زخمی ہو چکے تھے اور فطری طور پر وہ از سرِ نو جنگ کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے جبکہ اس کے برعکس اس مرتبہ دشمن مضبوط جذبہ کے ساتھ جنگ کر سکتا تھا اور اس کا حتمی نتیجہ حاصل کر سکتا تھا۔ اس بات کی اطلاع جلد ہی آپؐ تک پہنچ گئی۔



اگر اس موقع پر آپؐ غیر معمولی جرأت اور بے مثال ہمت کا مظاہرہ نہ کرتے تو تاریخ اسلام یہیں پر ختم ہو جاتی۔ یہ آیات اس نازک مرحلے پر نازل ہوئیں اور ان سے مسلمانوں کے جذبے کو تقویت پہنچی۔ اس کے فوراً بعد آپؐ کی طرف سے مشرکین کی طرف جانے کا ایک عمومی حکم ہوا۔ یہاں تک کہ جنگ کے زخمی (جن میں حضرت علیؑ بھی تھے جنہیں ساٹھ سے زیادہ زخم آئے تھے) بھی دشمن سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور مدینے سے چل پڑے۔ یہ خبر سردارانِ قریش تک پہنچی اور وہ مسلمانوں کے اس عجیب و غریب جذبے سے وحشت زدہ ہوئے اور سوچنے لگے کہ شاید تازہ دم فوج مدینے سے مسلمانوں کے ساتھ آملی ہے اور ہو سکتا ہے کہ نئی جنگ کا نتیجہ ان کے لیے نقصان کا باعث ہو۔ لہٰذا انہوں نے اپنی سابقہ کامیابی پر اکتفا کرنے اور مکہ کی طرف پلٹ جانے میں ہی بہتری سمجھی اور وہ تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف چل پڑے۔

"ولقد نصرکم اللہ ببدر و انتم اذلۃ"

جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ آیات مسلمانوں کے جذبے کو تقویت دینے کے لیے نازل ہوئیں اور ان میں پہلے مسلمانوں کی میدانِ بدر کی کامیابی کی طرف اشارہ کیا گیا تاکہ اس کے ذکر سے ان کے دلوں میں آئندہ کے لیے جوش و جذبہ بڑھ جائے۔ ارشاد ہوا کہ خدا نے تمہیں بدر میں کامیابی سے سرفراز فرمایا جب کہ تم دشمن کی نسبت کمزور تھے تو تعداد اور جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے تمہارا اور دشمن کا کوئی تقابل ہی نہ تھا (تمہاری تعداد ۳۱۳ اور بہت کم ساز و سامان تھا جب کہ مشرکین کے پاس بہت زیادہ ساز و سامان تھا اور ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی) ان حالات میں تم خدا سے ڈرو اور اپنے پیشوا (پیغمبر اکرمؐ) کی حکم عدولی کو نہ دہراؤ تاکہ اس طرح سے اس کی گوناگوں نعمات کا شکر بجا لاؤ (فاتقوا اللہ لعلکم تشکرون)۔

"اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ اٰلاف من الملٰئکۃ......"

بعد ازاں میدانِ بدر میں فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد کرنے کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اس دن کو فراموش نہ کرو جب پیغمبرؐ نے تم سے کہا تھا کہ کیا تمہاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے کافی نہیں ہیں۔

بلیٰ ان تصبروا و تتقوا و یاتوکم من فورھم ھٰذا یمددکم ربکم بخمسۃ اٰلاف .....

ہاں! اگر آج بھی پائیداری اور استقامت کا مظاہرہ کرو، قریش کے مقابلے میں نکلو، تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو اور گذشتہ کی طرح فرمانِ رسول کی مخالفت نہ کرو تو اس صورتحال میں اگر مشرکین تیزی کے ساتھ تمہاری طرف پلٹ آئیں تو خدا پانچ ہزار مخصوص نشانی والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔

وما جعلہ اللہ الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہ وما النصر

لہ "بدر" ایک شخص کا نام تھا۔ وہ مکہ و مدینہ کے درمیانی علاقے میں رہتا تھا۔ اس کا ایک کنواں تھا۔ اسی کے نام سے اس علاقے کا نام بھی "بدر" ہو گیا۔ لغوی لحاظ سے "بدر"، "پُر" اور "کامل" کو کہتے ہیں، اسی لیے چودھویں کے چاند کو بھی بدر کہتے ہیں۔

ٹہ "فور" کا اصل معنی ہے دیگ وغیرہ کا جوش اور اُبال۔ اسی مناسبت سے تیزی سے انجام پذیر ہونے والے کاموں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنی جیسے دیگ میں اُبال سے کھانے والی چیز تیزی سے اوپر نیچے آتی ہے یہ کام بھی اسی طرح انجام پذیر ہوا ہے۔



الا من عنـد اللہ . . . . .

لیکن یہ بات یاد رہے کہ تمہاری مدد کے لیے ملائکہ کی آمد تو صرف تمہاری تشویق ، اطمینان قلب اور تقویت جذبہ کے لیے ہے۔ ورنہ کامیابی تو صرف خدا کی طرف سے ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام کاموں میں اس کی حکمت کارفرما ہے۔ وہ کامیابی کے راستے بھی جانتا ہے اور اسے جاری کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

"لیقطع طرفا من الـذین کفروا او یکبتـهـم فینقلبوا خائبین"

اگرچہ مفسرین حضرات اس آیت کی تفسیر میں اختلافات کے شکار ہیں لیکن اگر سابقہ آیات کی طرح خود آیات اور موجودہ تاریخ سے مدد لی جائے تو اس آیت کی تفسیر بھی واضح ہوتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ یہ جو دشمن سے نئی جنگ کرنے کی صورت میں فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد کا وعدہ کیا گیا ہے یہ اس بنا پر ہے کہ لشکر مشرکین کے حصّہ کو قطع کر دے اور انہیں ذلت کے ساتھ پلٹا دے۔ آیت میں "طرف" کا معنی ٹکڑا ہے اور "یکبتهم" کبت سے ہے جس کے معنی کسی کو زبردستی اور ذلیل کر کے واپس کرنے کے ہیں۔

اس مقام پر فرشتوں کا مسلمانوں کی مدد کرنا ، اس کی کیفیت اور اس کی ضرورت کے سلسلے میں چند سوالات ہو سکتے ہیں جن کا جواب شرح و بسط کے ساتھ سورہ انفال آیت ۹ کے ذیل میں پیش کیا جائے گا۔

۱۲۸۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۸ کسی قسم کا اختیار (کفار اور جنگ سے فرار کرنے والے مسلمانوں کے فیصلے کے بارے میں) تمہیں نہیں ہے مگر یہ کہ خدا چاہے کہ انہیں درگذر کر دے یا سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔

تفسیر

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن یہ مسلّم ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اور اس کے واقعات سے متعلق ہے۔ سابقہ آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ البتہ آیت کی تفسیر میں دو باتیں توجہ طلب ہیں پہلی یہ کہ آیت مستقل ایک جملہ ہے لہٰذا "او یتوب" کا معنی "الا ان یتوب علیهـم" ہے۔

اس آیت کا مطلب یوں بنتا ہے کہ ان کے انجام کار کے بارے تم کچھ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا انہیں بخش دے یا اس ظلم کی وجہ سے انہیں سزا دے اور لفظ "انہیں" سے مراد کفار ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ حتیٰ کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے دندان مبارک کو شہید کیا اور جبین مبارک کو زخمی کر دیا یا وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے میدان کارزار سے فرار کیا ہے اور جنگ کے اختتام پر نادم و پشیماں ہوئے اور آپؐ سے معافی طلب کی۔ آیت بتلا رہی ہے کہ ان کی عفو و بخشش یا سزا و عذاب خدا کے ہاتھ میں ہے اور پیغمبر اکرمؐ حکم خدا کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیتے۔

دوسری تفسیر اس طرح کی گئی ہے "لیس لك من الامر شیء" جملہ معترضہ ہے (جس کا پہلے اور بعد والے جملوں سے



رابطہ نہ ہو) اور جملہ "او یتوب علیھم" کا عطف "او یکبتھم" پر ہے۔ اس صورت میں دونوں آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کامیابی کے اسباب تمہارے قبضہ میں دے دیگا اور کفار کے لیے چار قسم کا انجام مقرر کرے گا یا لشکر مشرکین کے ایک حصہ کو نیست و نابود کر دے گا یا انہیں کسی ذریعہ سے واپس جانے پر مجبور کر دے گا یا انہیں شائستگی اور توبہ کی صورت میں بخش دے گا اور یا انہیں ظلم کی وجہ سے سزا دے گا۔ خلاصہ یہ کہ ان کے ہر گروہ کے ساتھ عدالت و حکمت کا برتاؤ روا رکھے گا اور تم ان کے بارے میں اپنی طرف سے کسی قسم کا اقدام نہیں کر سکتے۔

اس آیت کی شانِ نزول روایات میں مختلف انداز سے پیش کی گئی ہے۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب جنگ اُحد میں آنحضرتؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور جبین مبارک زخمی ہو گئی اور مسلمانوں کو بہت سخت نقصان پہنچا تو پیغمبرؐ کفار کے امروز و فردا کے متعلق سوچنے لگے کہ یہ لوگ کس طرح راہِ ہدایت پر آئیں گے اور فرمایا:

"کیف یفلح قوم فعلوا ھذا بنبیھم وھو یدعوھم الی ربھم"

یہ گروہ کیسے فلاح پائے گا جس نے اپنے پیغمبرؐ سے یہ سلوک کیا جب کہ وہ انہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اس مقام پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور پیغمبرؐ کو تسلی و تشفی دی گئی کہ آپ ان کی ہدایت کے جوابدہ نہیں ہیں بلکہ آپ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے۔

ایک اشتباہ اور اس کا ازالہ

یہاں دو نکات توجہ طلب ہیں:

(۱) نابغۂ روزگار مفسر مؤلف "المنار" کا نظریہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کو حصول کامیابی کے لیے مادی وسائل سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں ایک ناقابلِ فراموش درس دیتی ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا انہیں کامیابی کی نوید سنا دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان مادی وسائل، سامانِ حرب و ضرب اور منصوبہ بندی کو فراموش کر دیں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور کامیابی کے لیے پیغمبرؐ کی دعا کا انتظار کریں۔ پیغمبرؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے "لیس لک من الامر من شیء" یعنی کامیابی کا معاملہ تیرے سپرد نہیں بلکہ وہ مشیت ایزدی کے تابع ہے۔ لہٰذا خدا نے ان کے لیے جو راستے مقرر کیے ہیں ان سے استفادہ کیا جائے اور پیغمبرؐ کی دعا بھی اگرچہ مؤثر ہے لیکن اس میں استثنائی پہلو موجود ہے اور وہ معیّن مواقع کے ساتھ مخصوص ہے۔ مؤلف موصوف کی یہ گفتگو اگرچہ منطق و حکمت سے لبریز ہے لیکن یہ آیت کے ان مطالب سے مناسبت نہیں رکھتی جو کفار کی سزا یا توبہ کے بارے میں ہیں۔ لہٰذا اسے اس آیت کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) یہ آیت مخالفینِ اسلام کے بارے میں عفو و بخشش یا سزا کے متعلق پیغمبرؐ سے ہر قسم کے اختیارات سلب کر رہی ہے۔ لیکن یہ اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ عفو و درگذر کے لیے دعا اور شفاعت مؤثر ہیں۔ کیونکہ آیت بالا کا مقصد یہ ہے کہ آپ خود سے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے البتہ خداوند تعالیٰ کے حکم و اذن سے معافی دے سکتے ہیں اور سزا بھی دے سکتے اور کامیابی کے عوامل بھی فراہم کر سکتے ہیں حتیٰ کہ پروردگارِ عالم کے اذن و اجازت سے حضرت عیسیٰؑ کی طرح مردوں کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔ جو لوگ جملہ "لیس لک من الامر شیء" کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کی طاقت کا انکار کرتے ہیں اور ان کے سلبِ اختیارات



پر اصرار کرتے ہیں، انہوں نے درحقیقت قرآن کی دیگر آیات کو فراموش کر دیا ہے۔ قرآن مجید سورہ نساء آیت ۶۴ میں کہتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ
وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا

اگر وہ لوگ جب اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے، تمہارے پاس آجاتے اور معافی طلب کرتے اور پیغمبر ان کے لیے طلب مغفرت کرتے تو خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

اس آیت کی رُو سے آپ کی استغفار کو گناہ کی بخشش کا ایک عامل شمار کیا گیا ہے۔

آئندہ کے مباحث میں مناسب آیات کے ذیل میں اس مطلب پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

۱۲۹۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۲۹۔ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی ملکیت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے (اور مناسب سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

درحقیقت یہ آیت گذشتہ آیت کی تاکید ہے کہ بخشنا اور سزا دینا پیغمبر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ وہ حکم خداوندی کے تابع ہے آسمانوں اور زمین کی حکومت جس کے قبضۂ قدرت میں ہے پیدا کرنا اسی خدا کا کام ہے۔

"وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"

باوجودیکہ اُس کا عذاب بہت سخت ہے وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

کوئی حرج نہیں کہ ہم یہاں ایک مسلم اسکالر کی پُر از حکمت گفتگو کی طرف اشارہ کریں جو سخت ہونے کے باوجود بعض سوالوں کا جواب ہے۔ مفسر عالی قدر (علامہ) طبرسیؒ اس آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں کہ ایک عالم سے پوچھا گیا کہ خداوند عالم کس طرح اپنے بندوں کو ان کے گناہوں کی بناء پر باوجود اپنی وسیع و بے پایاں رحمت کے عذاب دے گا تو اس عالم نے جواب دیا کہ خدا کی رحمت اس کی حکمت کو ختم نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی رحمت کا سرچشمہ ہمارے جذبہ ترحم کی طرح احساسات اور رقت قلبی نہیں ہے بلکہ اس کی رحمت ہمیشہ اس کی حکمت سے وابستہ ہوتی ہے اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ معصیت کاروں کو (سوائے خاص موارد کے) سزا دی جائے۔

۱۳۰۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا



اللہ لعلکم تفلحون ○

۱۳۱۔ واتقوا النار التی اعدت للکفرین ○

۱۳۲۔ واطیعوا اللہ والرسول لعلکم ترحمون ○

ترجمہ

۱۳۰ اے ایماندارو! (بڑھا چڑھا کر سود) نہ کھاؤ خدا سے ڈرو تاکہ فلاح پا جاؤ۔

۱۳۱ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

۱۳۲ اور خدا اور پیغمبر کی اطاعت کرو تاکہ رحمت (الٰہی) تمہارے شاملِ حال ہو۔

تفسیر

قرآنی آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط

گذشتہ آیات میں جنگ اُحد کے واقعات اور بہت سے درس موجود ہیں جو مسلمانوں نے اس عبرت آموز واقعے سے حاصل کیے لیکن زیر نظر تین اور بعد والی چھ آیات چند ایک اقتصادی، اجتماعی اور تربیتی پروگراموں پر مشتمل ہیں اور ان نو آیات کے بعد پھر از سرِ نو جنگ اُحد کا تذکرہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اندازِ بیان بعض لوگوں کے لیے باعث تعجب ہو لیکن بنیادی امر پر توجہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے:

قرآن کوئی کلاسیکی کتاب نہیں ہے جو کئی فصول و ابواب کی حامل ہو اور اس کے ابواب و فصول کے درمیان ایک خاص ربط ملحوظ رکھا گیا ہو بلکہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو تیئس سال کی مدت میں مختلف تربیتی ضروریات کے مطابق مختلف اوقات و مقامات میں قسط وار نازل ہوتی رہی۔ ایک دن واقعہ اُحد پیش آتا ہے اور مختلف جنگی پروگرام چند ایک آیات کے ضمن میں بتائے جاتے ہیں دوسرے روز ایک اقتصادی مسئلہ درپیش آتا ہے مثلاً سود یا حقوق کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے مثلاً شادی بیاہ سے متعلق مسائل یا ایک تربیتی اور اخلاقی معاملہ درپیش ہوتا ہے مثلاً توبہ اور پھر کئی ایک آیات کا نزول ہوتا ہے۔ البتہ تمام سورتیں اور آیات قرآن ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور وہ یہ کہ سب کی سب ایک انسان سازی اور اعلیٰ ترین سطح کے ایک تربیتی پروگرام کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں اور ایک پُرامن مادی اور روحانی لحاظ سے ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا اگر مندرجہ بالا آیات قبل و بعد کی آیات سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔



سودخوری کی حرمت کے چند مراحل

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کا یہ طریقہ ہے کہ وہ معاشرے کی ایسی برائیاں جن کی جڑیں گہری ہو چکی ہیں ان کی بیخ کنی کرنے کے لیے آہستہ آہستہ زمین ہموار کرتا ہے اور لوگوں کو تدریجاً ان کے مفاسد سے آگاہ کرتا ہے اور جب قرآنی احکام قبول کرنے کے لیے آمادگی حاصل ہو جائے قانون تصریحی شکل میں بیان کر دیتا ہے (خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں گناہ سے آلودگی کا امکان بہت زیادہ ہو)۔

یہ بھی واضح ہے کہ دنیائے عرب زمانہ جاہلیت میں سود خوری میں شدت سے ملوث تھی، خصوصاً مکہ کا گرد و نواح سود خوروں کا مرکز تھا اور ان کی بہت سی قبیح اجتماعی برائیوں کا سبب یہی بُرا کاروبار تھا۔ بنا بر ایں قرآن مجید نے سود خوری ختم کرنے کے لیے حرمت کا حکم چار مراحل میں بیان کیا ہے:

(۱) پہلے پہل سود کے بارے میں سورہ روم آیہ ۳۹ میں ایک اخلاقی نصیحت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَاْ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِكَ ہُمُ الْمُضْعِفُوْنَ

یعنی صرف کوتاہ نظر افراد کی نگاہ میں سود کھانے والوں کی ثروت میں سود لینے سے زیادتی ہوتی ہے لیکن خدا کے ہاں اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ اور راہِ خدا میں خرچ کرنا دولت و ثروت کی زیادتی کا باعث ہے۔

(۲) سورہ نساء آیہ ۱۶۱ میں یہودیوں کی غلط رسوم و عادات پر تنقید کرتے ہوئے ان کی سود خوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"واخذھم الربٰوا وقد نھوا عنہ"

ان کی ایک بُری عادت یہ تھی کہ وہ سود کھاتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا۔

(۳) زیرِ بحث آیت میں جیسا کہ اس کی تفسیر کے ذیل میں بتایا جائے گا، سود کی حرمت کا صریح حکم ذکر ہوا ہے لیکن سود کی صرف ایک قسم کی طرف جو بہت بُری قسم ہے۔ اشارہ ہوا ہے۔

(۴) آخر میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ سے ۲۷۹ تک ہر قسم کی سود خوری کی شدت سے ممانعت کا اعلان کیا گیا ہے اور اسے خدا سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

یایھا الذین امنوا لا تاکلوا الربٰوا اضعافا مضاعفة ....

اس آیت میں سود کی قبیح ترین قسم کی حرمت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور "اضعافا مضاعفة" (چند در چند) کی تعبیر موجود ہے۔ ربائے فاحش سے مراد یہ ہے اصل سرمایہ ہی اضافی سود کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے۔ یعنی سود پہلے مرحلے میں اصل سرمائے میں جمع ہو جائے اور آئندہ اصل سرمائے میں سود جمع ہونے پر جو سرمایہ بنا ہے اس پر سود لگے اور اسی ترتیب سے ہر مرتبہ کا سود اضافی سرمایہ بن کر



گذشتہ سرمائے میں جمع ہوتا جائے اور سرمائے کی نئی رقم تشکیل دیتا جائے۔ اس طرح تقلیل مدت میں ایک دوسرے پر سود کی زیادتی کی وجہ سے مقروض کے قرضہ کا مجموعہ اصل قرضہ سے کئی گنا زیادہ ہو جائے اور اس کی زندگی مکمل طور پر دیوالیہ ہو جائے جیسا کہ روایات و تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ اگر مقروض قرض کی مدت ختم ہونے پر قرض نہیں ادا کر سکتا تھا تو قرض خواہ سے تقاضا کرتا کہ وہ سود اور اصل قرض کا مجموعہ نئے سرمائے کی شکل میں اسے بطور قرض دیدے اور اس کا سود لے۔ ہمارے دور میں بھی اس قسم کی ظالمانہ سود خوری کثرت سے رائج ہے۔

"و اتقوا اللہ لعلکم تفلحون"

آیت کے آخر میں ارشاد رب العزت ہوتا ہے: اگر فلاح و کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہو تو تقویٰ اپناؤ اور اس گناہ سے بچو۔

"و اتقوا النار التی اعدت للکفرین"

یہ آیت از سر نو تقویٰ کی تاکید کرتی ہے اور اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ڈراتی ہے۔ لفظ "کافرین" کے ساتھ تعبیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولی طور پر سود خوری ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے اور سود خوروں کے لیے بھی اس آگ کا ایک حصہ ہے جو کفار کی منتظر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ بنیادی طور پر کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ باقی رہے گناہگار اور معصیت کار تو ان کے لیے اس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا وہ کفار سے شباہت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

"و اطیعوا اللہ و الرسول لعلکم ترحمون"

گذشتہ آیت کی دھمکی اس تشویق و ترغیب کے ساتھ تکمیل پاتی ہے جو اس آیت میں مطیع اور فرمانبرداروں کے لیے ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور سود خوری چھوڑ دو تاکہ تم پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہو۔

۱۳۳۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

۱۳۴۔ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۱۳۵۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝



۱۳۶۔ أُولَٰئِكَ جَزَاءُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝

ترجمہ

۱۳۳ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرو اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کے لیے جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

۱۳۴ وہی لوگ جو تنگی اور کشادگی میں خرچ کرتے ہیں اور اپنا غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں اور خدا نیکو کار لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۳۵ اور وہ لوگ کہ جب وہ کسی عمل بد کا ارتکاب کریں یا اپنے اوپر ظلم کریں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور خدا کے سوا گناہوں کو بخشنے والا کون ہے اور وہ گناہ پر اصرار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔

۱۳۶ ان کی جزا پروردگار کی بخشش اور وہ باغات بہشت ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے اور یہ عمل کرنے والوں کے لیے کتنا اچھا معاوضہ ہے۔

تفسیر

سعادت کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت

"وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم"

"سارعوا" سارعت سے ہے جس کے معنیٰ ہیں کسی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لیے دو یا دو سے زیادہ افراد کی کوشش۔ نیک کاموں میں یہ قابل ستائش ہے اور برے کاموں میں مذموم۔

گذشتہ آیات کے بعد کہ جو بدکاروں کو جہنم کی تہدید اور نیک لوگوں کو رحمت الٰہی کی تشویق کرتی ہیں، اس آیت میں نیک لوگوں کی کوشش اور جستجو کو معنوی مقابلے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس کا آخری مقصد خدا کی بخشش اور بہشت کی دائمی و ابدی نعمات ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ اس مقصد تک رسائی کے لیے ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرو۔

درحقیقت قرآن ایک نفسیاتی پہلو کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ انسان اگر کسی کام کی انجام دہی میں تنہا ہو تو عموماً اس کام کو وہ حسب عادت تاخیر سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے لیکن اگر اس میں مقابلے کا پہلو ہو اور مقابلہ بھی ایسا جس میں ایک بیش بہا انعام پر داؤ لگایا گیا ہو تو



وہ اپنی تمام تر قوت وتوانائی صرف کرتا ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش رفت کرتا ہے اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقابلے کا پہلا مقصد مغفرت قرار دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر معنوی مقام تک رسائی گناہوں کی آلودگی سے پاک وصاف ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اپنے آپ کو گناہ سے پاک کیا جائے اور اس کے بعد مقام تقرب الٰہی کی طرف قدم اٹھایا جائے۔

"وجنة عرضها السمٰوت والارض"

اس معنوی مقابلے کا دوسرا ہدف بہشت ہے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہے۔ (یہ مخفی نہ رہے کہ اس آیت میں عرض سے مراد علم ہندسہ کی اصطلاح نہیں ہے کہ عرض طول کے مقابلے میں ہو، بلکہ اس سے مراد وسعت اور پھیلاؤ ہے)۔ اس طرح قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت جتنی ہے اور سورۂ حدید کی آیت ۲۱ میں یہی تعبیر معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔

"سابقوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها کعرض السماء والارض"

اس آیت میں سارعت کی بجائے صراحت کے ساتھ لفظ سابقت آیا ہے اور سماء مفرد کی شکل میں ہے اور اس کے ساتھ الف لام جنس کے اعتبار سے ہے جو یہاں عموم کا مفہوم دے رہا ہے اور کاف سے تشبیہ معلوم ہوتی ہے بایں طور کہ محل بحث آیت میں تصریح کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بہشت کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے لیکن سورہ الحدید کی آیت میں ہے کہ اس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی مانند ہے لیکن دونوں تعبیروں کا معنیٰ ومفہوم ایک ہے۔ آیت کے آخر میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ بہشت اس عظمت کے ساتھ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے "اعدت للمتقین"۔

اب یہاں یہ سوال ذہن میں اٹھ سکتا ہے:

اولاً یہ کہ کیا جنت وجہنم پیدا ہو چکے ہیں اور وہ وجودِ خارجی رکھتے ہیں یا بعد میں لوگوں کے اعمال کے حساب سے ایجاد ہوں گے۔

ثانیاً یہ کہ اگر وہ خلق ہو چکے ہیں تو وہ کہاں ہیں (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن کہتا ہے کہ صرف جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے)۔

کیا جنت ودوزخ اس وقت موجود ہیں؟

اکثر علماء اسلام کا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں اس وقت وجودِ خارجی رکھتے ہیں اور قرآنی آیات کا ظاہری معنیٰ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ نمونہ کے طور پر:

(۱) محل بحث آیت اور دیگر کثیر آیات میں اعدت (تیار کی جا چکی ہے) استعمال ہوا ہے یا بعض دوسری تعبیرات جو اسی مادہ سے ہیں جو بعض مقامات پر بہشت کے بارے میں اور بعض جگہ دوزخ کے بارے آئی ہیں[۱] ان آیات سے معلوم ہوتا ہے

۱۔ سورہ توبہ آیت ۸۹ و آیت ۱۰۰، سورہ فتح آیت ۶، بقرہ آیت ۲۴، آل عمران ۱۳۱ و ۱۳۳، سورہ الحدید آیت ۲۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔



کہ بہشت و دوزخ اس وقت تیار موجود ہیں اگرچہ انسانوں کے نیک و بد اعمال کے نتیجہ میں ان میں وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے (غور کریں)۔

(۲) معراج سے متعلق سورۃ والنجم کی آیات میں یوں ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى

دوسری مرتبہ پیغمبر نے جبرئیل کو سدرۃ المنتہٰی کے پاس دیکھا جہاں دائمی جنت ہے (والنجم۔ ۱۳ تا ۱۵)۔

یہ تعبیر جنت کے وجود پر دوسری شہادت ہے۔

(۳) سورۃ تکاثر آیت ۵، ۶، ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝

اگر تمہیں علم الیقین ہوتا تو دوزخ کا مشاہدہ کرتے پھر اسے عین الیقین کے ساتھ دیکھتے۔

معراج سے مربوط اور دیگر آیات میں بھی اس مسئلہ کی واضح نشاندہی کی گئی ہے [1]

جنت اور دوزخ کہاں ہیں

اس بحث کے بعد یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر یہ دونوں موجود ہیں تو کہاں ہیں اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ جنت و جہنم اس دنیا کے باطن میں موجود ہیں ہم زمین و آسمان اور مختلف کرات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن ان کے اندر موجود جو دنیائیں ہیں انہیں ہم نہیں دیکھ پاتے کہ جہاں کثرت سے موجودات ہیں جو ہماری آنکھوں کی قوت ادراک سے ماوراء ہیں اور آیات كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چند ایک احادیث سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ بعض بندگانِ خدا اس جہاں میں اتنی قوتِ بینائی رکھتے تھے کہ وہ یہاں رہ کر جنت و جہنم کو اپنی حقیقت بین نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے۔ مزید توضیح کے لیے ایک مثال دی جا سکتی ہے۔ ایک طاقتور ریڈیائی آلہ (آواز کی لہریں بھیجنے والا آلہ) کسی خطۂ ارض میں موجود ہو جو فضائی لہروں کی مدد سے پوری دنیا میں تلاوتِ قرآن کا دل آویز زمزمہ بہت ہی دلنشین اور روح پرور آواز سے نشر کر رہا ہو۔ اسی طرح کا ایک اور آلہ زمین کے کسی خطہ میں موجود ہو جو بہت ہی پریشان کن آواز دوسری فضائی لہروں میں پھیلا دے۔ جس وقت ہم ایک مقام پر بیٹھے ہوں تو اپنے اردگرد کے لوگوں کی آواز تو ہم سن لیتے ہیں لیکن اُن دو لہروں کا احساس تک نہیں ہوتا جو فضائے عالم میں پرواز کر رہی ہیں۔ لیکن اگر ان کو گرفت میں لینے والی مشین موجود ہو تو فوراً وہ ہمارے کانوں میں پڑ جائیں گی اگرچہ عام حالت میں ہمارے کان اس کے سننے سے عاجز ہوتے ہیں۔ گذشتہ مثال اگرچہ کئی لحاظ سے ناقص ہے تاہم جنت و دوزخ جیسے باطنی امور کی تصویر کشی کے لیے کافی ہے۔

---

[1] توجہ رہے کہ عالم آخرت کی جنت اس سے مختلف ہے جس میں حضرت آدمؑ رہے تھے۔ کیونکہ وہ حضرت آدمؑ کی خلقت سے قبل موجود تھی۔



دوسرا پہلو یہ ہے کہ عالمِ آخرت اور جنّت وجہنم اس عالمِ مادی پر احاطہ کئے ہوئے ہیں اور یہ اس کے اندر اس جنین کی مانند ہیں جو اس دُنیا کے اندر ایک علیحدہ مستقل عالم میں رہتا ہے اور وہ اس عالم سے جُدا نہیں اسی طرح عالمِ دنیا بھی عالمِ آخرت کے اندر واقع ہے۔ یہاں قرآن کریم نے جو جنّت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے مساوی قرار دی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی نظر میں زمین اور آسمان سے زیادہ وسیع چیز کوئی نہیں۔ لہٰذا قرآن نے جنت کی عظمت و وسعت کی تصویر کشی زمین و آسمان کی وسعت کے حوالے سے کی، اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا جیسا کہ اگر شکمِ مادر میں ایک بچہ ہو اور ہم چاہیں کہ اس سے گفتگو کریں تو ایسی منطق میں اس سے بات کریں گے کہ جو اس کے لیے قابلِ ادراک ہو۔

گذشتہ تبصرے سے ہمارے اس سوال کا جواب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اگر جنّت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ کیونکہ پہلے جواب کی رُو سے دوزخ بھی اِس جہان کے اندر ہے اور اس جہاں میں ان دونوں کے موجود ہونے میں کوئی اشکال نہیں (جیسا کہ آواز کی لہریں بھیجنے والی مشین کی مثال میں اس کا ذکر ہو چکا ہے)، باقی رہا دوسرا جواب کہ جنّت و دوزخ اس جہاں پر محیط ہیں تو یہ کچھ زیادہ روشن ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ دوزخ اور جنّت دونوں اس جہاں پر محیط ہوں اور جنّت کچھ زیادہ وسیع ہو۔

پرہیزگاروں کی نشانیاں

"الذین ینفقون فی السراء والضراء......"

گذشتہ آیت میں پرہیزگاروں کو دائمی جنّت کی نوید سنائی گئی تھی، اس لئے اس آیت میں ان کا تعارف کرایا جا رہا ہے اور ان کی پانچ اعلیٰ امتیازی خصوصیات بیان کی گئیں ہیں:

۱ وہ ہر حالت میں خرچ کرتے ہیں چاہے وہ آرام و فراخ دستی میں ہوں یا پریشانی اور محرومیت میں مبتلا ہوں۔ وہ اس عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ دوسروں کی مدد کرنے اور نیکی کا جذبہ اُن کی رُوح کی گہرائیوں میں اُترا ہوا ہے۔ اسی بنا پر وہ ہر حالت میں اس کے لیے عملی طور پر تیار رہتے ہیں کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ آسودگی کی حالت میں خرچ کرنا سخاوت جیسی بلند صفت کی نشانہ ہی نہیں کرتا البتہ وہ لوگ جو ہر حالت میں ضرورت مندوں کو نوازتے ہیں، وہ اس کا بیّن ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ ان میں یہ صفت راسخ ہے۔ ہاں! اس مقام پر ذہنوں میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ تنگدستی کی حالت میں انسان کیونکر خرچ کر سکتا ہے؟ لیکن اس سوال کا جواب واضح ہے کہ تنگدست افراد بھی اپنی قدرت کے مطابق دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ خرچ و انفاق صرف مال و ثروت میں منحصر نہیں بلکہ خدا کے ہر عطیہ سے اس کا تعلق ہے۔ چاہے مال و ثروت ہو، نعمتِ علم و دانش ہو یا دیگر نعماتِ الٰہی۔ اس عمل سے خدا چاہتا ہے کہ صاحبانِ دولت کے علاوہ قربانی و فداکاری کی رُوح غریبوں کے دلوں میں بھی پروان چڑھ جائے تاکہ وہ بسیار اخلاقی برائیوں سے دور ہوں جو بہت زیادہ ہیں اور جن تمام کا سرچشمہ بخل ہے۔ اس مقام پر ان لوگوں کا جواب موجود ہے جو راہ خدا میں قلیل امداد کو کم سمجھتے ہیں، ان کے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر ایک امداد پر علیحدہ علیحدہ نظر رکھتے ہیں ورنہ یہی تھوڑی تھوڑی امداد کیا اگر جمع کی جائیں مثال کے طور پر ایک ملک کے تمام رہنے والے امیر و غریب تھوڑے تھوڑے پیسے بندگانِ خدا کے لیے جمع کریں تو



وہ بڑے سے بڑا کام سر انجام دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انفاق کا اخلاقی اور روحانی اثر زیادہ خرچ کرنے سے نہیں ہے بلکہ اس کے تمام اثرات انفاق کرنے والے کی نیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہاں پرہیزگاروں کی پہلی عمدہ صفت انفاق (راہ خدا میں خرچ کرنا) ذکر ہوئی ہے کیونکہ یہ آیات سود خوروں اور سامراجیوں کے مدمقابل صفات کو بیان کر رہی ہیں کہ جن کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں خوشی اور تنگدستی کی حالت میں مال و دولت کی قربانی تقویٰ کی واضح ترین علامت ہے۔

۲ والکاظمین الغیظ ــــــــ وہ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں۔

"کظم" کے لغوی معنی پانی بھری مشک کے دھانے کو باندھنے کے ہیں اور کنایہ کے طور پر ان لوگوں کی صفت بیان کی جاتی ہے کہ جو آتش غیظ و غضب سے بھرے ہوں لیکن اسے استعمال نہ کریں۔ لفظ غیظ کا معنی شدتِ غضب ہے جو ایک روحانی ہیجان ہے جو طبیعت کے خلاف چیزوں کو دیکھ کر انسان پر طاری ہو جاتا ہے اور انسان کو آپے سے باہر کر دیتا ہے۔ غصہ کی حالت خطرناک ترین حالت ہوتی ہے اور اگر اسے روکا نہ جائے تو ایک دیوانگی کا عالم ہوتا ہے اور اعصابی نظام کنٹرول سے باہر ہو جاتا ہے۔ جس سے معاشرے میں بہت سے جرائم نمودار ہوتے ہیں۔ اس لیے درج بالا آیت میں پرہیزگاروں کی دوسری صفت غصہ کو پی جانا ظاہر کی گئی ہے۔ حضرت رسول خدا فرماتے ہیں:

"من کظم غیظاً و ھو قادر علی انفاذہ ملاہ اللہ امنا و ایمانا"

جو شخص اپنے غصے کو پی جائے جبکہ اسے استعمال کرنے پر قادر ہو تو خدا اس کے دل کو امن و ایمان کی روشنی سے منور کرتا ہے۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ غصہ پی جانا انسان کی معنوی و روحانی ترقی اور ایمان کی پختگی کے لیے بہت مؤثر ہے۔

۳ و العافین عن الناس ــــــــ اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

غصہ کو پی جانا (اپنے مقام پر) بڑی اچھی خوبی ہے لیکن یہ انسان کے دل کو بغض و کینہ سے پاک نہیں کرتا لہٰذا بغض و کینہ کی برائی ختم کرنے کے لیے ان دونوں (غصے کو پی جانا اور درگذر کرنا) کو یکجا کر دیا گیا ہے البتہ ایسے افراد سے درگذر کرنا مطلوب ہے کہ جو اس کے اہل ہوں۔

۴ و اللہ یحب المحسنین ــــــــ اور وہ نیکی کرنے والے (لوگ ہونے کی وجہ سے) اللہ کو محبوب ہیں۔

اس حصے میں عفو و بخشش سے بلند تر مرحلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور زنجیر کی کڑیوں کی طرح ترقی و تکامل کے مراتب کی تصویر کشی کی گئی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان نہ صرف اپنا غصہ پی جائے اور عفو و بخشش سے کینے کے داغ دل سے دھو ڈالے بلکہ برائی کے مقابلے میں احسان اور نیکی کر کے (جہاں مناسب ہو) مدمقابل کے دل سے بھی دشمنی کی بیخ کنی کر دے اور اس کے دل میں نرمی پیدا کر دے تاکہ پھر کبھی اس قسم کا حادثہ سر نہ اٹھائے۔

خلاصہ یہ کہ پہلے غصے کے مقابلے میں اپنے اوپر قابو پانے کا حکم ہے اس کے بعد اپنے دل کو پاک و صاف کرنے کا فرمان ہے اور آخر میں مدمقابل کے دل کو پاک کرنے کا ارشاد ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے جو شیعہ اور سنی کتب میں موجود ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ



حضرت امام علی بن حسین زین العابدینؑ کی ایک کنیز آپ کے ہاتھ دُھلا رہی تھی کہ پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس سے امامؑ کا جسم اقدس زخمی ہوگیا۔ امامؑ نے غصہ میں سر اٹھایا تو کنیز نے فوراً کہا: خدا قرآن میں فرماتا ہے " والکاظمین الغیظ " امامؑ نے فرمایا: میں نے اپنا غصہ پی لیا اس نے عرض کیا " و العافین عن الناس " امامؑ نے فرمایا: میں نے تجھے معاف کیا خدا تجھے معاف کرے۔ اس نے پھر کہا: " واللہ یحب المحسنین " امامؑ نے فرمایا: میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔ یہ حدیث[1] اس بات پر واضح شاہد ہے کہ مذکورہ تین مراحل میں سے ہر ایک دوسرے سے بلند تر ہے۔

۵ والذین اذا فعلوا فاحشۃ..... وہ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔

"لفظ فاحشہ" فحش یا فحشاء سے ہے جس کا معنیٰ ہے ہر وہ عمل جو بہت ہی بُرا ہو اور یہ مفہوم عفت و پاک دامنی کے منافی اعمال میں منحصر نہیں ہے کیونکہ اصل میں یہ حد سے تجاوز کے معنی میں ہے جس میں ہر طرح کا گناہ شامل ہے۔

درج بالا آیت میں پرہیزگاروں کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ لوگ گذشتہ مثبت صفات سے متصف ہونے کے علاوہ اگر کسی گناہ کے مرتکب ہو جائیں تو فوراً یاد خدا میں پڑ جاتے ہیں اور توبہ کر کے پھر کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب تک یادِ خدا میں مشغول ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور وہ گناہ کا اس وقت مرتکب ہو جاتا ہے جب کلی طور پر اس کا دل یادِ خدا سے خالی ہو اور وہ محوِ غفلت ہو۔ لیکن پرہیزگار افراد میں یہ غفلت زیادہ عرصہ نہیں رہتی بلکہ وہ بہت جلد یادِ خدا میں مصروف ہو جاتے ہیں اور گذشتہ کمی کی تلافی کر لیتے ہیں اور اس وقت وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور صرف اسی سے گناہوں کی بخشش طلب کرنا چاہیے۔

"ومن یغفر الذنوب الا اللہ "

کون ہے خدا کے علاوہ جو گناہوں کو بخشتا ہے۔

اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ آیت میں فاحشہ کے علاوہ اپنے اوپر ظلم کرنے کا ذکر بھی ہوا ہے (او ظلموا انفسھم) ممکن ہے کہ ان دونوں میں فرق یہ ہو کہ فاحشہ سے گناہان کبیرہ اور ظلم سے گناہان صغیرہ مراد ہوں۔ آیت کے آخری حصے میں تاکید کہا گیا ہے (ولم یصروا علی ما فعلوا وھم یعلمون) اور وہ علم و آگاہی کی صورت میں گناہ پر اصرار نہیں کرتے۔

اس آیت کے ذیل میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

" الاصرار ان یذنب الذنب فلا یستغفر اللہ ولا یحدث نفسہ بتوبۃ فذٰلک الاصرار "

گناہ پر اصرار کرنا یہ ہے کہ انسان گناہ کرے اور اس کے بعد استغفار نہ کرے اور توبہ کی فکر میں نہ ہو یہ ہے گناہ پر اصرار[2]

کتاب امالی صدوق میں امام جعفر صادقؑ سے ایک پُر معنیٰ حدیث منقول ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ جب درج بالا آیت نازل ہوئی اور توبہ کرنے والوں کو خدا کی طرف سے بخشش کی خوشخبری دی گئی تو ابلیس بہت ہی پریشان ہوگیا اس نے بلند آواز سے اپنے تمام یار و انصار کو بلا کر ایک اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس دعوت کی وجہ پوچھی تو اس نے اس آیت کے نزول کی بنا پر اظہارِ پریشانی کیا تو اس کے ایک ہمنوا نے کہا کہ میں انسانوں کو اس گناہ کی دعوت دے دے کر اس آیت کو بے اثر کر دوں گا۔

---

[2] تفسیر عیاشی زیر نظر آیت کے ضمن میں۔



ابلیس نے اس کی تجویز کو قبول نہ کیا ایک دوسرے نے اس قسم کی پیشکش کی کہ وہ بھی منظور نہ ہوئی کہ اس کے دوران ایک کہنہ مشق شیطان کہ جس کا نام وسواس خناس تھا، کہنے لگا میں اس مشکل کو حل کرتا ہوں۔ ابلیس نے پوچھا کیسے؟ وہ کہنے لگا اولادِ آدم کو وعدوں اور اُمیدوں کے ساتھ گناہ میں آلودہ کروں گا اور جب وہ گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے تو ان کے دلوں سے یادِ خدا کو دور کر دوں گا۔ ابلیس نے کہا یہی راستہ درست ہے اور یہ ذمہ داری رہتی دنیا تک اس کے سپرد کر دی۔

واضح ہے کہ سہل انگاری اور شیطانی وسوسوں کا نتیجہ فراموش کاری ہے اور صرف وہ لوگ اس میں گرفتار ہوتے ہیں جو اس کے سامنے سر جھکا دیں اور اصطلاح کے مطابق وسواس خناس کے ساتھ قریبی تعلق استوار کر لیں۔ لیکن بیدار مغز اور کامل ایمان کے حامل لوگ اس بات پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ جب کبھی ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اوّلین موقع پر اس کے آثار کو توبہ و استغفار کے ذریعے دھو ڈالتے ہیں اور اپنے دل کے دریچے شیطان اور اس کے لشکر کے لیے بند کر دیتے ہیں اس طرح وہ ان میں داخل نہیں ہو پاتے۔

اولئك جزاؤهم مغفرة من ربهم وجنات تجرى من تحتها الانهار خٰلدين فيها۔

اس آیت میں ان پرہیزگاروں کی جزا اور اجر بیان کیا گیا ہے (کہ جن کی صفات گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہیں)۔ وہ پروردگار کی بخشش اور بہشت بریں ہے، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں (اور ایک لحظہ کے لیے ان سے پانی منقطع نہیں ہوتا) وہ جنت کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ درحقیقت اس مقام پر پہلے تو معنوی و روحانی نعمات مغفرت، قلب و روح کو پاکیزہ کرنے اور روحانی ترقی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس کے بعد مادی نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں کہا گیا کہ "ونعم اجر العاملین" یہ کیسی ہی اچھی جزا اور اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے جو کہ مرد میدان ہیں نہ کہ سست و بیکار افراد جو ہمیشہ اپنے وعدوں اور ذمہ داریوں میں لاپرواہی برتتے ہیں۔

۱۳۷۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○

۱۳۸۔ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○

ترجمہ

۱۳۷ تم سے پہلے کچھ سنتیں موجود تھیں (اور ہر قوم کی سرنوشت ان کے اعمال و صفات کے مطابق تھی اور تمہارا حال بھی ان کا سا ہے) زمین میں چل پھر کر دیکھو (کہ آیاتِ خدا کی) تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔

۱۳۸ یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔



تفسیر

گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ

قرآن مجید کا ایک انفرادی اسلوب ہے کہ یہ گذشتہ ادوار کو موجودہ اور زمانۂ حاضر کو گذشتہ تاریخ سے مربوط کرتا ہے اور حقائق کو سمجھنے کے لیے موجودہ نسل کا گذرے ہوئے لوگوں کے ساتھ فکری و ثقافتی ربط لازمی اور ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ ان دو زمانوں (ماضی اور حال) کے پختہ ارتباط سے آنے والوں کی ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے جیسا کہ زیر نظر آیت میں کہتا ہے کہ "قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض" خدا کی کچھ سنتیں (تعلیمات) گذشتہ اقوام میں تھیں جو ہرگز صرف اُن کے لیے مخصوص نہ تھیں اور وہ قوانینِ زندگی کے سلسلے کی ایک شکل میں تمام گذرے ہوئے اور آنے والوں کیلئے جاری ہوتی تھیں۔ ان سنتوں میں مومن و مجاہد اور متحد و بیدار مغز افراد کی پیشرفت اور بلند پروازی کی نشاندہی کی گئی ہے اور اسی طرح بے ایمان اور گناہ کی نجاست سے آلودہ اقوام کی شکست و ریخت کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے جو کہ تاریخ بشریت میں ثبت ہے۔

تاریخ ہر قوم کے لیے زندگی سے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ تاریخ کا کمال ہے کہ وہ گذشتہ لوگوں کی اخلاقی خصوصیات ان کے بُرے بھلے کام اور ان کے نظریات و افکار ہمارے سامنے دہراتی ہے اور مختلف معاشروں کی ترقی و تنزل اور کامیابی و ناکامی کے اسباب کی نشاندہی کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ انسانی معاشروں کی روحانی و معنوی زندگی کا آئینہ ہے اور آنے والوں کی بیداری کا سبب ہے۔ بنابریں قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ زمین میں چلو پھرو اور گذشتہ قوموں، سربراہوں، سرکش فرعونوں اور جبار بادشاہوں کی طاغوتیت و بربریت کے آثار میں غور و فکر کرو اور دیکھو کہ جب انہوں نے خدا کا انکار کیا اور خدا کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور زمین میں ظلم و فساد کی بنیاد رکھی تو ان کا انجام کیا ہوا۔ گذشتہ لوگوں کے آثار آنے والوں کے لیے پند و نصیحت کا سامان ہیں اور لوگ ان سے مستفید ہو کر زندگی کی راہ سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

جہاں گردی

گذشتہ لوگوں کی زندگی کے جو نشانات زمین کے مختلف خطوں میں قدیم ادوار سے باقی ہیں، وہ زندہ اسناد اور بولنے والی تاریخ ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ان کے متعلق لکھی ہوئی تاریخ کی نسبت ان سے زیادہ بہرہ ور ہو سکتے ہیں کیونکہ ان نشانات سے ہم ان اقوام کی جسمانی ساخت، اُن کا زاویۂ فکر اور ان کی قدرت و عظمت کو بآسانی جان سکتے ہیں جب کہ صفحاتِ تاریخ صرف وقوع پذیر واقعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ستمگروں کے محلات کی ویرانی، اہرام مصر کی تعجب خیز عمارتیں، بابل کے برج، کسریٰ کے محل، قوم سبا کے آثارِ تمدن اور اس طرح کی بیسیوں نشانیاں جو اس عالم کے گوشہ و کنار میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نشانی زبان حال سے ان لوگوں کی تاریخ بیان کرتی ہے اور بے زبانی کی زبان میں باتیں کرتی ہے۔ یہ حقیقت اس وقت آشکار ہو جاتی ہے جب کوئی نکتہ سنج شاعر ان محلات کے کھنڈرات میں جا کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنی روح میں ایک اضطراب محسوس کرتا ہے اور ہیجان انگیز اشعار کہتا ہے جیسا کہ خاقانی اور دوسرے عالی



شہرت یافتہ شعراء نے کسریٰ وغیرہ کے ٹوٹے پھوٹے محلات کے اندر سے یہ آوازیں دل کے کانوں سے سُنی ہیں اور انہیں ادبی شاہکاروں کی زینت بنایا ہے[1]۔

ان زندہ تاریخی آثار میں سے ایک کا مطالعہ کرنا ایک ضخیم تاریخی کتاب پڑھنے کے برابر ہے یہ مطالعہ انسان کی روحانی بیداری کے لیے ایک مؤثر چیز ہے کیونکہ جب ہم ان آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اچانک ایسا لگتا ہے کہ ان ویرانوں میں زیرِ خاک بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہوگئی ہیں اور پہلے جوش و ولولہ کا مظاہرہ کر رہی ہیں لیکن جب ہم دوبارہ ان کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو انہیں خاموش و فراموش شدہ دیکھتے ہیں۔ ان دو حالتوں کا موازنہ اس راز کو طشت ازبام کرتا ہے کہ خودسر افراد کتنے کوتاہ نظر ہیں کہ جو بہت جلدی گذر جانے والی ہوسرانیوں کے لیے ہزار ہا بد کاریاں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ مسلمان روئے زمین پر سیر و سیاحت کریں اور گذشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ کر کے ان سے عبرت حاصل کریں۔

اسلام میں بھی جہاں گردی اور سیر و تفریح کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے لیکن آج کے ہوس پرست سیاحوں کی طرح نہیں بلکہ گذشتہ لوگوں کے آثار و انجام کے مطالعہ اور عجائباتِ عالم میں عظمت خدا کے مشاہدہ کے لیے اور اسی کا نام قرآن نے "سیروا فی الارض" رکھا ہے اور کئی ایک آیات میں اس کا حکم دیا ہے مثلاً

۱۔ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ۔

یعنی ان سے کہیں کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ (نمل۔ ۶۹)

۲۔ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ

یعنی کہو کہ زمین میں گھوم پھر کر دیکھو کہ خدا نے کیسے تخلیق کی۔ (عنکبوت۔ ۲۰)

۳۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا۔۔۔ (الحج ۔ ۴۶)

کیا یہ لوگ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں تا کہ ان کے دل اس سے کچھ عقل حاصل کرتے

---

[1] خاقانی اپنے ایک مشہور قصیدے میں جبکہ وہ ایوان مدائن میں آنسو بہا رہا تھا، کہتا ہے:

بر دیدہ من خندید کاینجا ز چہ می گرید   خندند بر آن دیدہ کاینجا نشود گریان

یعنی وہ میری آنکھوں پر ہنسا کہ یہاں کیوں روتی ہیں اور وہ اُن آنکھوں پر ہنستی ہیں جو یہاں نہ روئیں۔

معروف عالم مرحوم شیخ ابیوردی تختِ جمشید کے سامنے کہے ہوئے اپنے مشہور قصیدے میں کہتے ہیں:

جم عبرت مردم شد، افسر زرش گم شد   سر خشت سرِ خم شد، ہاں ای سر باہش ہاں

یہ تختِ جمشید آج باعث عبرت ہے کہ آج اس پر بیٹھنے والا حاکم موجود نہیں ہے۔

ایں پند خموشان است گر پند زبان خواہی   رو آیہ "اورثنا" از مکتب قرآن خواں

یہ تو خاموش لوگوں کی نصیحت ہے اور اگر تو زبان کی نصیحت چاہتا ہے تو مکتبِ قرآن سے "اورثنا" کی آیت پڑھ۔



یہ آیت کہتی ہے کہ یہ معنوی و روحانی سیاحی اور زمین کی سیر انسان کے دل کو دانائی، آنکھ کو بینائی اور کان کو سماعت عطا کرتی ہے اور اسے سکوت وجمود سے خلاصی دلاتی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسلامی حکم و قانون بہت سے دیگر قوانین کی طرح طاق نسیاں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ اب مسلمان اسے بھی نظر التفات سے نہیں دیکھتے یہاں تک کہ بعض علماء نے اپنی فکر کا دائرہ صرف گردو پیش تک محدود رکھا ہے۔ وہ گویا اس عالم کے علاوہ کسی اور عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور دنیا کے اجتماعی انقلابات و وسائل سے بے خبر ہیں اور ان جزوی اور کم اثر کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کر رکھا ہے جو اصولی اور بنیادی کاموں کے مقابلے میں خاص قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ اس دنیا میں پوپ اور عیسائیوں کے بڑے بڑے پادری صدیوں کی گوشہ نشینی اور علیحدگی کے بعد زمین کی سیر و سیاحت کے لیے نکلتے ہیں تاکہ وہ ضروریات زمانہ کو سمجھیں۔ تو اس صورت میں کیا مسلمانوں کو قرآن کے اس حکم پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہیے اور اپنے محدود فکری تنگ دائرے سے نہیں نکلنا چاہیے تاکہ عالم اسلام اور مسلمانوں میں ایک انقلاب و حرکت کار فرما ہو۔

هٰذا بيان للناس وهدى و موعظة للمتقين.

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو کچھ گذشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے وہ تمام انسانوں کے لیے ایک واضح اعلان اور تمام پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت کا ایک بہترین ذریعہ ہے یعنی باوجودیکہ یہ بیانات تمام انسانوں کے لیے ہمہ گیر پہلو رکھتے ہیں لیکن ان سے ہدایت کا ثمر صرف پرہیزگار ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۳۹۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○

۱۴۰۔ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ○

۱۴۱۔ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ○

۱۴۲۔ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ○

۱۴۳۔ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ○

ترجمہ

۱۳۹ اور سست نہ ہو جاؤ اور حزن و ملال نہ کرو اور تم ہی برتر ہو اگر تم ایمان والے ہو۔

۱۴۰ اگر تمہیں (میدان اُحد میں) زخم لگے ہیں (اور تمہیں نقصان پہنچا ہے) تو اس گروہ کو بھی (میدان بدر میں) اسی طرح زخم لگ چکے ہیں اور ہم (شکست و کامیابی کے) ان دنوں کو لوگوں میں اُلٹ پھیر کرتے رہتے ہیں (کیونکہ یہ اس جہان کی زندگی کی خاصیت ہے) یہ اس لیے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ پہچانے جائیں اور خدا تم میں سے قربان ہونے والوں کو منتخب کرلے اور



خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

۱۴۱ اور اس لیے کہ خدا صاحب ایمان لوگوں کو خالص قرار دے (اور وہ الگ ہو جائیں) اور کافروں کو رفتہ رفتہ نابود کر دے۔

۱۴۲ کیا تمہارا گمان ہے کہ تم صرف دعویٰ ایمان کی بنا پر جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے جبکہ ابھی تک خدا نے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو مشخص اور جدا نہیں کیا۔

۱۴۳ اور تم موت (اور راہ خدا میں شہادت) کی تمنا کرتے تھے جبکہ ابھی تمہارا اور اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا اور پھر تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور تمہیں وہ نظر آ رہی تھی (لیکن تم اپنے تئیں اس کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھے، تمہارے گفتار و کردار میں کتنا فرق ہے)۔

شانِ نزول

ان آیات کی شان نزول کے بارے میں کئی ایک روایات ہیں مجموعی طور پر ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان آیات کا ضمیمہ ہیں جو جنگ اُحد کے بارے میں پہلے آ چکی ہیں۔ یہ آیات جنگ اُحد کے اسباب و نتائج کا بہترین تجزیہ پیش کرتی ہیں اور ضمنی طور پر مسلمانوں کی روحانی تقویت اور ان کی تسلی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ کیونکہ جیسا بیان کیا گیا ہے کہ جنگ احد کچھ مسلمانوں کی نافرمانی اور جنگی اصولوں سے انحراف کی وجہ سے شکست پر منتج ہوئی اور اس میں اسلام کی چند درخشاں شخصیات نے جام شہادت نوش فرمایا جن میں سے سرفہرست پیغمبر اکرمؐ کے چچا حضرت حمزہ کا نامِ گرامی آتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اسی رات اپنے صحابہ کے ہمراہ شہداء کی لاشوں کے قریب گئے شہداء کی ارواح مقدسہ کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ ایک ایک شہید کی لاش مبارک کے پاس بیٹھتے اور گریہ کرتے اور ان کے لیے طلب مغفرت کرتے بعد میں ان سب کی لاشوں کو کوہ احد کے دامن میں بہت ہی رنج و ملال کے ساتھ دفن کیا گیا۔ ان حساس لمحات میں درج بالا آیات کا نزول ہوا کیونکہ اس موقع پر مسلمان روحانی تقویت اور شکست کے نتائج سے معنوی فائدہ حاصل کرنے کے شدید محتاج تھے۔

تفسیر

جنگ اُحد کے نتائج

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

"تھنوا" "وہن" کے مادے سے لیا گیا ہے۔ وہن لغت میں ہر قسم کی سستی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق جسم سے ہو یا ارادہ و ایمان سے۔ اس آیت میں پہلے تو مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک جنگ میں شکست کی وجہ سے تم میں



سستی اور کمزوری پیدا ہوا ور تم محزون ہو کر آخری کامیابی سے مایوس ہو جاؤ۔ کیونکہ بیدار مغز افراد جس طرح کامیابیوں سے استفادہ کرتے ہیں اسی طرح شکست سے بھی درس حاصل کرتے ہیں اور اس کے سایہ میں کمزوری کے نقاط اور شکست کی وجوہات تلاش کرتے ہیں اور انہیں دور کرکے آخری کامیابی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین " (تم ہی برتر ہو اگر تم میں ایمان ہو) ایک بہت ہی پُر معنی جملہ ہے۔ یعنی تمہاری شکست درحقیقت روح ایمان اور اس کے آثار کھو بیٹھنے کی وجہ سے تھی۔ اگر تم فرمانِ خدا و رسولؐ کو پائے نافرمانی سے نہ روندتے تو اس قسم کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے تاہم تمہیں رنج و ملال نہیں ہونا چاہیے اگر راہ ایمان پر ثابت قدم رہے تو آخری فتح تمہاری ہوگی اور ایک میدان میں شکست سے دوچار ہونے کا معنی حتمی شکست نہیں ہے۔

ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ ۔

" قرح " کا معنیٰ ایسا غم ہے جو بدن میں کسی خارجی عامل کی وجہ سے پیدا ہو۔ اس آیت میں ایک دوسرا درس آخری کامیابی تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے کہ تمہیں دشمن سے کمتر تو نہیں ہونا چاہیے۔ وہ سخت سنگین شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ ان کے ستر آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بہت سے لوگ زخمی اور قید ہوئے تھے۔ بایں ہمہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہے بلکہ میدانِ اُحد میں تمہاری غفلت کی وجہ سے انہوں نے اپنی شکست کی تلافی کی ہے۔ اب اگر تم اس میدان میں شکست کھا گئے ہو تو تم بھی نقصان کی تلافی کیے بغیر بیٹھ نہ جاؤ۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ اگر تمہیں زخم لگے ہیں تو ان کو بھی اس طرح کے زخم لگے ہیں۔ بنا برایں تمہاری سستی اور غم و اندوہ کی وجہ کیا ہے۔ بعض مفسرین اس آیت میں زخموں سے مراد کفار کے وہ زخم لیتے ہیں جو انہیں جنگ اُحد میں لگے تھے۔ لیکن پہلے تو یہ زخم مسلمانوں کے زخموں جیسے نہیں تھے۔ لہٰذا یہ لفظ مثلہ کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے اور دوسرا یہ کہ یہ بعد کے جملہ کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتے جس کی تفسیر عنقریب آجائے گی۔

وتلک الایام نداولھا بین الناس ولیعلم اللہ الذین امنوا و یتخذ منکم شھداء

اس حصے میں پہلے ایک سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ انسانی زندگی میں تلخ و شیریں حوادث آتے رہتے ہیں کہ جن میں سے کسی کے لیے پائیداری نہیں ہے۔ فتوحات و ناکامیاں، قدرتیں اور ناتوانیاں سب کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا ایک میدان کی شکست اور اس کے آثار کو پائیدار نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ شکست کے عوامل اور اسباب کا مطالعہ کرکے ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے استفادہ کیا جائے اور اسے کامیابی سے بدلا جائے۔ دنیا میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں اور زندگی اپنے اصول کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے اور خدا ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش دیتا رہتا ہے تاکہ ان حوادث و واقعات میں سے سنت تکامل آشکار ہو جائے[ل] بعد ازاں ان ناگوار واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ " ولیعلم اللہ الذین امنوا " یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ صاحبان ایمان افراد، ایمان کے دعویداروں سے الگ ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں جب تک دردناک واقعات

ل " ایام " " یوم " کی جمع ہے۔ " یوم " کا معنی ہے " دن "۔ لوگوں کی کامیابی کے زمانے کو بھی ایام کہا جاتا ہے۔ " نداولہا " " مداولہ " سے ہے اس کا معنی ہے ایک چیز کو مختلف لوگوں کے درمیان گردش دینا۔



کسی قوم میں واقع نہ ہوں تو ان کی صفیں ایک دوسرے سے مشخص نہیں ہوں گی کیونکہ کامیابیاں لوگوں کو غفلت کی نیند سلا دیتی ہیں جب کہ شکستیں تیار افراد کے لیے بیدار کرنے والی ہوتی ہیں اور ان کی قدر و قیمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔

"ویتخذ منکم شہداء" میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس شکست کے نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ تم راہ اسلام میں شہادتیں اور قربانیاں پیش کرو اور جان لو کہ یہ پاک دین و آئین تمہیں مفت میں نہیں مل گیا مبادا آئندہ اسے تھوڑی سی قیمت پر ہاتھ سے دے بیٹھو۔ جو قوم مقدس مقاصد اور اہداف کے لیے قربانی نہ دے، وہ انہیں کم تر سمجھتی ہے لیکن جب ان کے لیے قربانیاں دے تو پھر خود اور آئندہ نسلیں بھی انہیں عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ لفظ شہداء سے مراد یہاں گواہ ہوں یعنی خدا چاہتا ہے کہ اس حادثہ سے تم میں سے کچھ گواہ لے لے کہ کس طرح نافرمانیوں کا انجام شکست ہوا کرتا ہے اور آئندہ جب کبھی انہیں اس قسم کے حادثوں کا سامنا ہو یہ گواہ ان کے لیے علم کا کردار ادا کریں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اس لیے ان کی حمایت بھی نہیں کرے گا۔

پرورش و تربیت کا میدان

ولیمحص اللہ الذین آمنوا....

"لیمحص" تمحیص کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو ہر قسم کے نقص وعیب سے پاک و صاف کرنا "یمحق" مادہ محق (بروزن مرد) سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کا آہستہ آہستہ کم ہونا۔ اسی مناسبت سے مہینے کی آخری رات کو "محاق" کہا جاتا ہے کیونکہ آہستہ آہستہ چاند کی روشنی کم اور ختم ہو جاتی ہے۔

اس آیت میں جنگ احد کے ایک اور فطری نتیجہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی شکستیں جماعتوں کی کمزوری اور عیوب کے پہلو واضح کرتی ہیں اور ان عیوب کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا چاہتا تھا کہ اس معرکہ حق و باطل میں با ایمان افراد کو خالص قرار دے اور انہیں کمزوری کے نقاط کی نشاندہی کرے تاکہ وہ آئندہ کی اس قسم کی آزمائش کی کٹھالی سے گزر کر اپنی ہوشیاری کا اندازہ لگالیں جیسا کہ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

"فی تقلب الاحوال یعلم جواھر الرجال"

حالات کی دگرگونی اور زندگی کے کٹھن حوادث میں لوگوں کے جوہر کا پتہ چلتا ہے اور وہ اپنی صلاحیتوں سے باخبر ہوتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے جہاں بعض شکستیں ایسی اصلاح پرور ہوتی ہیں کہ جن کے اثرات انسانی معاشروں میں ظاہری خواب آور کامیابیوں سے کئی درجے زیادہ ہوتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تفسیر "المنار" کا مؤلف اپنے استاد مصر کے عظیم مفتی محمد عبدہ سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کو خواب میں دیکھا اور آپ نے اس سے فرمایا کہ اگر مجھے میدان احد میں فتح و شکست کا مختار قرار دیا جاتا تو میں اس میدان میں شکست کو ترجیح دیتا کیونکہ یہ شکست تاریخ اسلام میں ایک اصلاح کنندہ عامل بن گئی۔

ویمحق الکافرین

یہ جملہ درحقیقت پہلے جملہ کا نتیجہ ہے کیونکہ جب مومنین حوادث کی کٹھالی میں مضبوط اور پاک ہو گئے تو ان میں کفر و شرک کی برائی کو دور کرنے



اور اپنے معاشرہ کو ان گندگیوں سے پاک کرنے کی کافی آمادگی پیدا ہوگی یعنی پہلے خود پاک ہونا چاہیے اور پھر دوسروں کو پاک کرنا چاہیے۔ حقیقت میں جس طرح کہ چاند اپنی جلوہ گری کے ساتھ آہستہ آہستہ کم روشن ہو جاتا ہے اور وہ حالت محاق میں چلا جاتا ہے، اسی طرح کفر و شرک اور ان کے حامیوں کی عظمت مسلمانوں کی مضبوطی اور پاکیزگی سے زوال پذیر ہوگی۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و لما یعلم الله الذین جاھدوا منکم و یعلم الصٰبرین

قرآن مجید واقعہ اُحد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک فکری اشتباہ کی تصحیح کرتا ہے کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ جہاد میں استقامت کا مظاہرہ کیے بغیر بہشت بریں میں قیام پذیر ہو جاؤ گے کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس معنوی سعادت کے اندر داخل ہونا صرف مسلمان کہلوانے یا عمل کے بغیر صرف عقیدہ سے ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو معاملہ نہایت سہل ہوتا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے اور جب تک حقیقی عقائد کی میدانِ عمل میں منعکس نہ ہو کوئی شخص بھی ان سعادتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ آزمائش کی منزل پر (حق و باطل کی) صفیں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتی ہیں اور مجاہد و مہاجر بے قیمت و بے ارزش افراد سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

کھوکھلی باتیں

و لقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقوہ فقد رایتموہ و انتم تنظرون۔

جنگ بدر میں بعض مسلمانوں کی پر افتخار شہادت کے بعد بعض مسلمان جب باہم مل بیٹھتے تو ہمیشہ شہادت کی آرزو کرتے اور کہتے کاش یہ اعزاز میدان بدر میں ہمیں بھی نصیب ہوتا۔ یقیناً ان میں کچھ لوگ سچے بھی تھے لیکن ان میں ایک چھوٹا گروہ بھی تھا جس نے اپنے آپ کو سمجھنے میں اشتباہ کیا بہرحال زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ جنگ احد کا وحشتناک معرکہ درپیش ہوا تو ان سچے مجاہدین نے بہادری سے جنگ کی اور جام شہادت نوش کیا اور اپنی آرزو کو پالیا لیکن جھوٹوں کے گروہ نے جب لشکر اسلام میں شکست کے آثار دیکھے تو وہ قتل ہونے کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ آیت انہیں سرزنش کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تم ایسے لوگ تھے کہ جو دلوں میں آرزو اور تمنائے شہادت کے دعویدار تھے، پھر جب تم نے اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تو کیوں بھاگ کھڑے ہوئے۔

جنگ اُحد میں شکست کے اسباب کا مختصر جائزہ

اوپر کی آیات میں بعض ایسی قابل توجہ تعبیرات نظر آتی ہیں جن میں سے ہر ایک جنگ اُحد کی شکست کے کسی نہ کسی راز سے پردہ اٹھاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ چند ایک ایسے عوامل موجود تھے کہ جن کی بنا پر یہ دلخراش اور عبرت آموز حادثہ رونما ہوا۔

۱ بعض نومسلموں میں معانئ اسلام کے ادراک میں اشتباہ پیدا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ صرف ایمان کا اظہار ہی کامیابی کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا تمام جنگوں میں غیبی امداد کے ذریعے خدا ان کی حمایت کرے گا۔ اس طرح انہوں نے کامیابی کے فطری عوامل صحیح منصوبہ سازی اور ضروری وسائل فراہم کرنے کے سلسلے میں سنت الٰہی کو پس پشت ڈال دیا۔

۲ فوجی نظم و ضبط کی پابندی نہ کرنا۔ پیغمبر اکرمؐ کا تاکیدی فرمان تھا کہ تیر انداز اپنے حساس مورچے پر ڈٹے رہیں۔ اس فرمان کی مخالفت اس شکست کا ایک موثر عامل بنی۔



۳ توسلوں کی دنیا پرستی کہ جنہوں نے جنگی غنائم کی جمع آوری کو دشمن کا پیچھا کرنے پر ترجیح دی اور اسلحہ اُتار کر غنیمت حاصل کرنے کے لیے چل پڑے حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ راہِ خدا میں جہاد کرتے وقت ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔

۴ تکبر و غرور جو جنگ بدر کی کامیابی سے پیدا ہوا تھا یہاں تک کہ وہ دشمن کی طاقت کو اپنے اذہان سے نکال بیٹھے تھے اور اس کے ساز و سامان کو معمولی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ اس شکست کا چوتھا اہم عامل تھا۔ یہ وہ کمزور پہلو تھے جنہیں اس شکست کے کھولتے ہوئے پانی سے دھونے کی ضرورت تھی۔

۱۴۴۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ‌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ‌ ؕ اَفَا۟ٮِٕنْ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انْقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ‌ ؕ وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـــًٔا‌ ؕ وَسَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ ○

۱۴۵۔ وَمَا كَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ‌ؕ وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا‌ ؕ وَسَنَجۡزِى الشّٰكِرِيۡنَ ○

ترجمہ

۱۴۴ محمدؐ صرف خدا کے رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا انہیں قتل کر دیا جائے تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے (اور ان کے فوت ہونے سے اسلام کو چھوڑ کر کفر و بت پرستی کے زمانہ کی طرف پلٹ جاؤ گے) اور جو شخص پلٹ جائے گا وہ ہرگز خدا کو کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا اور خدا تعالیٰ عنقریب شکر گزاروں (اور استقامت رکھنے والوں) کو جزا دے گا۔

۱۴۵ اور کوئی شخص حکم خدا کے بغیر نہیں مرتا یہ معیّن شدہ سرنوشت ہے (اس بنا پر پیغمبر اور دوسرے لوگوں کی وفات سنت الٰہی ہے) تو جو شخص بھی دنیا کا ثواب اور جزا چاہتا ہے (اور اپنی زندگی میں اس کے لیے کوشش کرتا ہے) تو اس میں کچھ نہ کچھ ہم اسے دیں گے اور جو آخرت کا ثواب اور جزا چاہتا ہے تو اس میں اسے عطا کریں گے اور عنقریب شکر گزاروں کو جزا دیں گے۔



شانِ نزول

یہ آیت بھی جنگ اُحد کے ایک حادثہ کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ جس وقت جنگ کی آگ مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان شعلہ زن تھی، اچانک ایک آواز بلند ہوئی اور کسی نے کہا: "میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا" "میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا"۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے جب ایک شخص عمرو بن قمیئہ حارثی نے ایک پتھر آنحضرتؐ کی طرف پھینکا اور پیغمبرؐ کی پیشانی اور دندان مبارک شہید ہو گئے، نچلا لب پھٹ گیا اور آپ کا رخسار مبارک لہولہان ہو گیا[1] اس موقع پر ہر ایک دشمن چاہتا تھا کہ آپ کو قتل کر دے۔ اس دوران میں لشکرِ اسلام کے ایک علمدار مصعب بن عمیر نے ان کے حملوں کو تو روک دیا لیکن خود شہید ہو گیا۔ اس کی شکل چونکہ پیغمبرؐ سے ملتی جلتی تھی تو دشمن نے یہی گمان کیا کہ پیغمبرؐ خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں۔ یہ آواز فضائے عالم میں گونج اٹھی اس آواز سے جتنا بت پرستوں کے جذبات پر مثبت اثر پیدا ہوا اتنا ہی مسلمانوں میں عجیب اضطراب پیدا ہو گیا چنانچہ ایک کثیر گروہ کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور وہ بڑی تیزی سے میدان جنگ سے نکل گئے یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے سوچا کہ پیغمبرؐ تو شہید ہو گئے ہیں لہٰذا اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے اور بت پرستوں کے سرداروں سے امان طلب کر لی جائے لیکن ان کے مقابلے میں فداکاروں اور جانثاروں کی بھی ایک قلیل جماعت تھی جن میں حضرت علیؑ، ابودجانہ اور طلحہ جیسے بہادر لوگ موجود تھے جو باقی لوگوں کو پامردی اور استقامت کی دعوت دے رہے تھے۔ ان میں سے انس بن نضر لوگوں کے درمیان آیا اور کہنے لگا: اے لوگو! اگر محمدؐ شہید ہو گئے ہیں تو محمدؐ کا خدا تو قتل نہیں ہوا۔ چلو اور جنگ کرو اسی نیک اور مقدس ہدف کے حصول کے لیے درجہ شہادت پر فائز ہو جاؤ۔ یہ گفتگو تمام کرتے ہی انہوں نے دشمن پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ تاہم جلد ہی معلوم ہو گیا کہ پیغمبر اکرمؐ سلامت ہیں اور اطلاع اشتباہاً دی گئی تھی۔ مندرجہ بالا آیت اسی مقام پر نازل ہوئی اور اس نے پہلے گروہ کی مذمت کی۔

تفسیر

شخصیت پرستی کی ممانعت

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم؛

جنگ اُحد کے واقعات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ آیت مسلمانوں پر ایک اور حقیقت واضح کرتی ہے وہ یہ کہ اسلام شخصیت پرستی کا دین نہیں ہے اور فرض کر لیں کہ اگر پیغمبر اس میدان جنگ میں جام شہادت نوش فرماتے تب بھی مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ لڑائی کو جاری رکھتے کیونکہ پیغمبر کی (طبعی) وفات یا شہادت سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ابد تک باقی رہنے والا دین حق ہے۔ شخصیت پرستی ایک خطرناک مسئلہ ہے جو بامقصد لڑائی کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی خاص شخص چاہے وہ پیغمبر خاتم ہی کیوں نہ

---

[1] بعض تواریخ میں ہے کہ چند آدمیوں نے مل کر آنحضرتؐ پر حملہ کیا تھا جس کے نتیجے میں آپ کو یہ زخم آئے۔



ہوں سے بے مقصد کی وابستگی کا معنی یہ ہے کہ جب وہ شخص اس دنیا سے چلا جائے تو پیشرفت کی کوشش اور اس کی تلاش ختم ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی اجتماعی رشد و ترقی کے نہ ہونے کی ایک واضح نشانی ہے۔ شخصیت پرستی سے مقابلہ آپ کی حقانیت اور عظمت کی ایک اور نشانی ہے کیونکہ آپ نے اگر اپنی ذات کے لیے قیام کیا ہوتا تو آپ اس فکر کو لوگوں میں فروغ دیتے کہ تمام چیزیں ان کے وجود سے وابستہ ہیں اور اگر وہ درمیان سے چلے جائیں تو تمام چیزیں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ لیکن آپ جیسے صحیح اور سچے رہبر کبھی اس قسم کے افکار لوگوں میں پنپنے نہیں دیتے بلکہ سختی کے ساتھ ان کی بیخ کنی کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ ہمارا مقصد ہماری ذات سے بلند ہے اور وہ ہمارے چلے جانے سے نابود نہیں ہوگا۔ لہٰذا قرآن صراحت کے ساتھ اوپر کی آیت میں اعلان کرتا ہے کہ محمدؐ صرف خدا کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں ان سے پہلے بھی بھیجے ہوئے افراد تھے جو دنیا سے چل بسے۔ کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہوں تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور بت پرستی کا راستہ اختیار کرو گے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ آیت میں رجعت قہقہری (پیچھے کی طرف پلٹنے) کے لیے " انقلبتم علی اعقابکم " کے الفاظ لائے گئے ہیں کیونکہ اعقاب جو کہ عقب (بروزن خشن) کی جمع ہے اس کا معنی ایڑی ہے اور یہ رجعت قہقہری کی واضح تصویر کشی ہے۔

ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ پیچھے کی طرف پھر جائیں اور کفر و بت پرستی کے دور کی طرف لوٹ جائیں وہ صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں نہ کہ خدا کو۔ کیونکہ اس عمل سے نہ صرف ان کی نیک بختی جاتی رہتی ہے بلکہ جو کچھ اب تک کما چکے ہیں وہ بھی تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے دے بیٹھیں گے۔

وسیجزی اللہ الشاکرین

آیت کے آخر میں اس قلیل جماعت کی طرف اشارہ کیا گیا جو تمام مشکلات اور پیغمبر اکرمؐ کی خبرِ شہادت عام ہونے کے باوجود جہاد سے دست بردار نہیں ہوئی۔ اس میں ان کی جد و جہد کو سراہا گیا ہے اور ان کا تعارف شاکرین اور نعمات الٰہی سے بہرہ ور ہونے والے اشخاص کے عنوان سے کرایا گیا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: خدا ان شکر گزاروں کو اچھی جزا دے گا۔ اس آیت نے تمام مسلمانوں اور ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے شخصیت پرستی کا مقابلہ کرنے کا ایک نصیحت آموز درس دیا ہے کہ با مقصد مسائل کبھی ایک یا کئی محدود اشخاص سے وابستہ نہیں ہوتے بلکہ وہ کئی ایک اصول اور ابدی پروگراموں کے گرد گھومتے ہیں اور افراد کے بدلنے یا ان کے فوت ہو جانے سے انہیں معطل نہیں ہونا چاہیے، چاہے وہ فرد خدا کے عظیم پیغمبرؐ ہی کیوں نہ ہوں اور اصولی طور پر ایک مذہب اور پروگرام کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اس لیے کہ جو پروگرام اور مشن کسی شخصِ واحد سے مربوط ہوتے ہیں وہ تا دیر نہیں رہتے بلکہ بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اکثر اسلامی اداروں کے پروگرام ابھی تک اشخاص سے قائم ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ درج بالا آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف اداروں کی داغ بیل اس طرح ڈالیں کہ وہ لائق و فائق افراد سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں تاہم وہ کسی شخص سے وابستہ نہ رہیں۔

وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ میدان احد میں پیغمبرؐ کی شہادت کی بے بنیاد خبر نے بہت سے مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں ڈال دیا



تنگ کر وہ میدان چھوڑ گئے بلکہ بعض تو اسلام سے ہی علیحدہ ہونا چاہتے تھے اس لیے ازسرِنو اس آیت میں اس گروہ کو تنبیہ اور بیداری کے لیے ارشاد ہوا کہ موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ہاں ہر شخص کے لیے مقرر شدہ وقت ہے جس سے وہ بھاگ نہیں سکتا بنا بریں اگر پیغمبرؐ اس میدان میں جامِ شہادت نوش فرما لیتے تو سوائے ایک سنت الٰہی انجام پانے کے اور کوئی بات نہیں تھی لیکن ان حالات میں مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ لڑائی جاری نہ رکھیں اور دوسری طرف میدانِ جنگ سے فرار موت سے خلاصی نہیں دلا سکتا جیسا کہ میدان جنگ میں شریک ہونا بھی انسان کی موت کو پہلے نہیں لا سکتا۔ اس لیے جان کی حفاظت کے لیے میدان جنگ سے فرار چہ معنیٰ دارد؛ اجل اور اسی طرح اجل "حتمی" اور "معلق" کے درمیان فرق پر سورۂ انعام میں ہم سیر حاصل تبصرہ کریں گے۔

ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منھا ومن یرد ثواب الاخرۃ نؤتہ منھا

آیت کے آخر میں ارشاد ہوا کہ انسان کی کوشش کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اگر کسی کا مقصد صرف مادی فوائد تک محدود ہو اور مقصد جنگِ اُحد کے بعض سپاہیوں کی طرح صرف مال غنیمت جمع کرنا ہو تو بالآخر کچھ نہ کچھ اس سے بہرہ ور ہو گا لیکن اگر اس کا مقصد عظیم ہو اور حیاتِ جاودانی اور انسانی فضائل کی راہ میں کوشش کی جائے تو پھر بھی اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا۔ بنا بریں جب دنیا یا آخرت کا حصول دونوں ہی کوشش کے محتاج ہیں تو پھر انسان کیوں اپنے وجود کے سرمائے کو بلند ترین اور پائیدار راستے میں صرف نہ کرے۔

اس کے بعد دوبارہ تاکیداً کہا گیا کہ ہم بہت جلد شکر گزاروں کو جزا دیں گے (وسنجزی الشاکرین)۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں یہی جملہ فعل غائب کی شکل میں ذکر ہوا تھا اور یہاں فعل متکلم کی صورت میں ہے جس سے وعدۂ خداوندی کی انتہائی تاکید ہوتی ہے اور سادہ الفاظ میں خدا کہتا ہے کہ ان کی جزا کا میں ضامن ہوں۔ تفسیر مجمع البیان میں امام باقرؑ سے اس آیت کے ذیل میں منقول ہے؛

حضرت علیؑ کو اُحد کے دن اکسٹھ زخم لگے تھے اور پیغمبر نے "ام سلیم" اور "ام عطیہ" کو حکم دیا کہ وہ دونوں حضرت علیؑ کے زخموں کا علاج کریں۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ وہ حالت پریشانی میں آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کرنے لگیں کہ حضرت علیؑ کے بدن کی کیفیت یہ ہے کہ ہم جب ایک زخم باندھتی ہیں تو دوسرا کھل جاتا ہے اور ان کے بدن کے زخم اس قدر زیادہ اور خطرناک ہیں کہ ہم ان کی زندگی کے بارے میں پریشان ہیں تو حضرت رسولؐ خدا اور کچھ دیگر مسلمان حضرت علیؑ کی عیادت کے لیے ان کے گھر آئے جبکہ ان کے بدن پہ زخم ہی زخم تھے تو پیغمبر اکرمؐ اپنے دست مبارک ان کے جسم سے مَس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو شخص راہ خدا میں اس حالت کو دیکھ لے وہ اپنی ذمہ داری کے آخری درجہ کو پہنچ چکا ہے اور جن جن زخموں پر آپؐ ہاتھ رکھتے تھے وہ فوراً مل جاتے تھے تو اس وقت حضرت علیؑ نے فرمایا کہ الحمد للہ کہ ان حالات میں مَیں میدان جنگ سے نہیں بھاگا اور دشمن کو پشت نہیں دکھائی، خدا نے ان کی کوشش کی قدردانی کی اور قرآن کی دو آیات میں آپؐ کی اور مجاہدین اُحد میں سے دیگر قابل تقلید افراد کی فداکاریوں کی طرف اشارہ کیا "وسیجزی اللہ الشاکرین" اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوا (وسنجزی الشاکرین)۔

١٤٦ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ



يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝

۱۴۷۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

۱۴۸۔ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۴۶ اور کتنے پیغمبر تھے جن کی معیت میں بہت سے خدا والوں نے جنگ کی تو انہوں نے راہ خدا میں پہنچنے والی مصیبت کے مقابلے میں سستی نہیں کی اور نہ وہ کمزور و ناتواں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سر جھکایا اور خدا صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۴۷ ان کی گفتگو صرف یہ تھی کہ پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمارے کاموں میں زیادتی سے صرف نظر فرما ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کفار پر کامیابی عطا کر۔

۱۴۸ لہٰذا خدا نے دنیا اور آخرت کا حسنِ ثواب انہیں دیا اور خدا نیک کاروں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر

گذشتہ زمانوں کے مجاہدین

وکاین من نبی ......

" کاین " کے معنی ہیں کتنے زیادہ اور ادب کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ لفظ کاف تشبیہ اور " این " سے مرکب ہے کہ جو اب ایک ہی کلمہ بن چکا ہے اور پہلے اجزاء کا انفرادی معنی متروک ہو گیا ہے اور اس کا معنیٰ ہو گیا ہے " کتنے زیادہ "

" ربیون " ربی (بروزن ملی) کی جمع ہے اور ربی اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس کا خدا سے مضبوط اتصال ہو جو صاحبِ ایمان عالم، صابر اور مخلص ہو۔

جنگ اُحد کے واقعات کے بعد اوپر کی آیت گذشتہ زمانہ کے مجاہدین اور اصحاب انبیاء کی قوت، شجاعت پختگی ایمان



اور استقامت کی یاد دلا کر مسلمانوں کو شجاعت اور فداکاری کی تشویق و ترغیب دلاتی ہے اور ضمنی طور پر میدان سے فرار کرنے والوں کی سرزنش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ بہت سے انبیاء ایسے تھے جن کے یار و انصار کی صف میں خدا پرست مجاہد موجود تھے۔ اس کے بعد ان کا طرزِ عمل یوں بیان کرتی ہے، وہ انبیاء کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، بہت کٹھن مشکلات میں انہوں نے سستی اور ناتوانی نہیں دکھائی اور دشمن کے سامنے کبھی سرخم نہیں کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو ان کے سپرد کیا ہے (ما ضعفوا و ما استکانوا) اور واضح ہے کہ خدا ایسے ہی افراد کو پسند کرتا ہے جو لڑائی میں پیچھا نہیں دکھاتے (و اللہ یحب الصابرین)۔ وہ لوگ جو کبھی سستی یا لغزش کی وجہ سے دشمن کے سامنے مشکلات میں گھر جاتے تھے تو بجائے اس کے کہ میدان ان کے حوالے کر دیں یا اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں یا ان کے دماغ میں کفر و ارتداد کی خلش پیدا ہو، وہ بارگاہِ خداوندی سے صبر و استقامت اور پامردی کی درخواست کرتے تھے اور کہتے تھے "ربنا اغفرلنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا و انصرنا علی القوم الکافرین" پروردگارا! ہمارے گناہوں کو بخش دے ہماری جلد بازی سے درگزر فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافروں پر کامیابی عطا کر۔ وہ اس قسم کے طرزِ فکر و عمل سے خدا سے جلد اپنی جزا اور ثواب حاصل کرتے تھے اس دنیا کی جزا بھی جو دشمن پر فتح و کامرانی ہے اور دوسرے جہاں کی جزا و ثواب بھی۔ "فاتاھم اللہ ثواب الدنیا و حسن ثواب الاخرۃ"

آیت کے آخر میں انہیں نیکوکاروں میں شمار کر کے ارشاد ہوتا ہے: و اللہ یحب المحسنین خدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔ اس طرح سے خدا تازہ مسلمانوں کے لیے گذشتہ امتوں کے مجاہدین کے پروگراموں اور مشکلات کے مقابلے میں ان کے طرزِ عمل کا ذکر ایک درس کے طور پر کر رہا ہے۔

اوپر کی آیات ان چیزوں کے علاوہ کئی اور نکات بھی واضح کرتی ہیں:

۱ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ صبر کے معنی ہیں استقامت و پامردی۔ اس لیے اس آیت میں اسے ضعف اور تسلیم کے مقابلے میں لایا گیا ہے اور ضمناً صابر اور نیکوکار ایک درجہ میں قرار پائے ہیں کیونکہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: و اللہ یحب الصابرین اور دوسری آیت میں ہے و اللہ یحب المحسنین۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ نیکوکاری صبر و استقامت کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ ہر نیکوکار شخص کے سامنے ہزارہا مشکلات کھڑی ہیں۔ اگر اس میں استقامت نہ ہو گی تو وہ بہت جلد ہی اپنا کام چھوڑ دے گا۔

۲ حقیقی مجاہد بجائے اس کے کہ وہ اپنی شکست کا سبب دوسرے کو قرار دے یا اسے وہمی عوامل کا نتیجہ قرار دے، وہ اپنی ذات میں اس کا سرچشمہ تلاش کرتے ہیں اور اپنے اشتباہات کی تلافی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ شکست کا لفظ اپنی زبان پر بھی نہیں لاتے اور اس کے بجائے اپنے نفسوں پر زیادتی کا ذکر کرتے ہیں بخلاف ہمارے کہ ہم آج کی دنیا میں کوشش کرتے ہیں کہ ضعف و کمزوری کے پہلوؤں کو نظرانداز کر دیں جو ہماری ناکامیوں کا سرچشمہ ہیں اور ان سب کو خارجی اسباب کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کبھی ان کمزوریوں کو ختم نہیں کر سکتے۔

۳ درج بالا آیت میں دنیاوی جزا کو "ثواب الدنیا" کہا گیا ہے جبکہ آخرت کی جزا کو "حسن ثواب الاخرۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت کی جزا دنیاوی جزا سے بہت زیادہ امتیاز رکھتی ہے کیونکہ دنیاوی جزا کتنی ہی اچھی کیوں



نہ ہو وہ آخر فنا ہو جائے گی اور خلافِ مزاج چیزوں کے ساتھ ملی ہوئی ہوگی، جبکہ آخرت کی جزا سرتاپا بہتر، خالص اور ہر قسم کی تکلیف سے پاک ہوگی۔

۱۴۹۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○

۱۵۰۔ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَھُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ○

۱۵۱۔ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىھُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۴۹ اے ایمان والو! اگر ان لوگوں کی اطاعت کرو جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تمہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے اور آخر کار تم نقصان اُٹھانے والے ہو جاؤ گے۔

۱۵۰ (وہ تمہارا سہارا نہیں ہیں) بلکہ تمہارا سہارا اور سرپرست خدا ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔

۱۵۱ چونکہ وہ (کفار) بلا دلیل کچھ چیزوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں، اس لیے بہت جلد ان کے دلوں پر ہم رعب و خوف طاری کریں گے اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کا ٹھکانا کس قدر برا ہے۔

تفسیر

بار بار خطرے سے آگاہی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓي اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ

یہ آیات بھی گذشتہ آیات کی طرح جنگ اُحد کے واقعات کا تجزیہ و تحلیل کرتی ہیں اور اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جنگ اُحد کے ختم ہونے کے بعد دشمنانِ اسلام زہریلے پروپیگنڈا سے نصیحت کے بھیس میں مسلمانوں کے درمیان منافرت و اختلاف کا بیج بوتے تھے اور چند مسلمانوں کی نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اسلام سے بدظن کرنا چاہتے تھے شاید یہودی اور عیسائی بھی اس کام میں منافقین کے شریک تھے۔ جیسا کہ جنگ اُحد میں بھی پیغمبر اکرمؐ کی شہادت کی بے بنیاد افواہ پھیلا کر مسلمانوں کی نفسیات کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلی آیت مسلمانوں کو کفار کی پیروی کرنے سے ڈراتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تم کفار کی



پیروی کروگے تو وہ تمہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیں گے اور تعلیمات اسلام کے زیرِ سایہ روحانی، معنوی اور مادی ترقی کے بعد تمہیں پہلے نقطہ کی طرف گرا دیں گے جو کفر و فساد ہے اور اس وقت تمہیں بہت زیادہ نقصان پہنچے گا کیونکہ اس سے زیادہ خسارہ اور کیا ہوگا کہ انسان اسلام کو کفر سے اور سعادت کو شقاوت سے اور حق کو باطل سے بدل ڈالے۔

اس کے بعد انہیں تسلی دیتے ہوئے تاکید کی گئی ہے کہ تمہارا بہت بڑا مددگار موجود ہے (بل اللہ مولاکم و ھو خیر الناصرین) خدا تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مددگار ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا جبکہ دوسرے مددگار شکست و ہزیمت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب۔

یہاں جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے معجزانہ طور پر نجات پانے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نصرت و حمایت کا ایک موقع یاد دلاتا ہے۔ آئندہ کے لیے بھی ان کا جوش اُبھارا گیا ہے اور کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے کیونکہ جیسا بیان ہو چکا ہے کہ مکہ کے بُت پرست جنگ اُحد میں شاندار کامیابی حاصل کر چکے تھے اور ظاہراً لشکرِ اسلام مغلوب ہو چکا تھا اب چاہیے تو یہ تھا کہ وہ میدان کی طرف پلٹ آتے اور مسلمانوں کی باقی ماندہ قوت کو کچل دیتے، مدینہ کو تاخت و تاراج کرتے، پیغمبرؐ کی بے بنیاد خبرِ شہادت سے مطلع ہونے کے بعد انہیں قتل کر دیتے اور اس بارے میں کسی شک و شبہ کا شکار نہ ہوتے لیکن خدا نے اُن کے دلوں میں عجیب خوف ڈال دیا ایسا خوف و ہراس جو کفر و بت پرستی کا خاصہ ہے۔ یہ خوف اُن میں اتنا جاگزین ہوا کہ روایات کے مطابق جس وقت وہ میدانِ اُحد سے پلٹ کر مکہ کے قریب پہنچے تو ایک شکست خوردہ لشکر کی صورت میں نظر آتے تھے۔ آیت کہتی ہے: "ہم بہت جلد ہی کفار کے دلوں میں خوف ڈال دیں گے" (یعنی جس طرح جنگِ اُحد کے موقع پر تم دیکھ چکے ہو) اسی طرح آئندہ کے لیے بھی یہی اُمید رکھو۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان کے دلوں میں رعب و خوف کا سبب یوں بیان کیا گیا ہے: بما اشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطانا یعنی اسی وجہ سے کہ انہوں بلا دلیل بہت سی چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیا تھا۔ درحقیقت جو بے ہودہ لوگ دلیل و بُرہان کی پیروی نہیں کرتے اور رائی کو پہاڑ بنا لیتے ہیں اور پتھر اور لکڑی کو اپنا معبود سمجھتے ہیں وہ حوادثِ زمانہ کے مقابلے سے عاجز ہوتے ہیں کیونکہ وہ بہت جلد محاسبہ کے اشتباہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور زندگی میں کسی معمولی حادثہ کا بھی سامنا نہیں کر پاتے۔ مثال کے طور پر وہ سُن لیں کہ مدینہ کے مسلمان جنگِ اُحد کے زخمیوں کو ساتھ لیے ہوئے دوبارہ میدانِ اُحد میں پلٹ آئے ہیں تو یہ بات ان کی نگاہ میں بہت بڑی ہوتی ہے اور وہ اس سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں جیسا کہ آج کی دنیا میں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار معمولی سے واقعہ پر پریشان ہو جاتے ہیں اور رائی کو پہاڑ سمجھ لیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے لیے محکم اور مضبوط سہارے کا انتخاب نہیں کیا ہوتا۔

وماٰوٰھم النار وبئس مثوی الظٰلمین

یہ افراد اپنے اور معاشرے پر ظلم کرتے ہیں اس بنا پر ان کے لیے سوائے (جہنم کی) آگ کے کوئی پناہ گاہ نہیں اور وہ کیسی بُری پناہ گاہ ہے۔

دشمن کا خوفزدہ ہونا کامیابی کا ایک راستہ ہے

بہت سی روایات میں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ فرمایا کرتے تھے کہ خداوندِ عالم کی طرف سے مجھے عطا کی گئی خصوصیات میں سے ایک



یہ ہے کہ: وہ دشمن کے دل میں خوف ڈال کر مجھے کامیابی سے نوازتا ہے[1]۔

یہ بات جنگ میں کامیابی کے ایک اہم عامل کی طرف اشارہ ہے جو آج کل کے زمانہ میں خصوصی توجہ کے لائق ہے کہ کامیابی کا اہم ترین عامل مجاہد کا جذبہ ہوتا ہے اور جتنا مؤثر یہ عامل ہے اتنا ان کی افرادی قوت اور ساز و سامان کی زیادتی بھی مؤثر نہیں۔ اسلام روح ایمان کو تقویت بخشتا ہے جہاد کے لیے عشق و ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اعزاز شہادت کی تمنا پیدا کرتا ہے اور خدائے قادر پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے اسلام اس روح اور جذبے کی پرورش اپنے مجاہدین میں اعلیٰ ترین طریقہ سے کرتا ہے۔ جبکہ خرافات کے متوالے بت پرست جن کا سہارا بے شعور و بے ارادہ اور بے جان بت تھے اور جو معاد و قیامت اور حیات بعد موت کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، جن کے افکار بیہودگیوں سے آلودہ تھے ان کا جذبہ کمزور اور ناتواں تھا اور مسلمانوں کی ان پر کامیابی کا مؤثر عامل یہی روحانی امتیاز تھا۔

۱۵۲۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○

۱۵۳۔ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِىْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

۱۵۴۔ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۤئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۤئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَىْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِىْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِىْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى

---

[1] کتاب خصال اور مجمع البیان سے رجوع کیجیے۔



مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

ترجمہ

۱۵۲ خدا نے تم سے اپنا وعدہ (جنگ اُحد میں دشمن پر کامیابی کا) سچ کر دکھایا جبکہ (ابتداء جنگ اُحد میں) تم دشمنوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے (اور یہ کامیابی جاری تھی) یہاں تک کہ تم سست ہو گئے اور (مورچوں کو چھوڑنے لگے اور) آپس میں نزاع کرنے لگے اور جو (دشمن پر غلبہ) تم چاہتے تھے وہ تمہیں دکھایا لیکن اس کے بعد تم نے نافرمانی کی۔ تم میں سے بعض دنیا کے خواہشمند تھے اور بعض آخرت کے خواہاں تھے پھر خدا نے تمہیں ان سے پھیر دیا (اور تمہاری فتح شکست سے بدل گئی) تاکہ تمہارا امتحان لے اور اس نے تمہیں معاف کر دیا اور خدا مومنین کے لیے فضل کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۱۵۳ (یاد کرو وہ وقت) جب تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے (اور تمہارا ایک گروہ بیاباں میں بکھرا ہوا تھا) اور تم پیچھے رہ جانے والوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور پیغمبر پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے۔ اس کے بعد تم پر پے در پے مصائب آئے اور یہ اس لیے تھا (تاکہ جنگی غنائم کے) ہاتھ سے چلے جانے سے تم غمگین نہ ہو اور نہ ہی ان آلام کی وجہ سے جو تم پر آپڑے ہیں اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۱۵۴ پھر اس غم و اندوہ کے بعد امن و آرام کا تم پر سایہ نازل کیا اور یہ ایک اونگھ کی صورت میں تھا جو (واقعہ اُحد کی بعد والی رات میں) تم میں سے ایک گروہ کو عارض ہوئی تھی لیکن ایک دوسرے گروہ کو اپنی جان کی فکر تھی (اور انہیں نیند نہیں آئی تھی) وہ لوگ خدا کے بارے میں زمانہ جاہلیت کے سے بُرے گمان کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا کامیابی کا کچھ حصہ ہمیں نصیب ہوگا۔ کہہ دو: تمام (کامیابیاں اور) کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ اپنے دل میں کچھ باتیں چھپائے ہوئے ہیں جن کا تمہارے سامنے اظہار نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کامیابی میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو ہم قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو: اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو وہ لوگ کہ قتل ہونا جن کی قسمت میں تھا، وہ (دشمن) ان کے بستروں پر آپڑتے (اور انہیں قتل کر دیتے) اور یہ اس لیے کہ خدا تمہارے سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کی آزمائش کرے اور تمہارے دلوں میں جو (ایمان) ہے اس کے خلوص کو پرکھے۔ اور تمہارے سینوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے باخبر ہے۔



تفسیر

کامیابی کے بعد شکست

جنگِ اُحد کے واقعات میں گزر چکا ہے کہ مسلمان ابتداءِ جنگ میں اتحاد اور بڑی دلیری کے ساتھ لڑے اور جلد ہی کامیاب ہو گئے اور دشمن کا لشکر پراگندہ و منتشر ہو گیا جس سے سارے لشکرِ اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن کوہ عینین کے درے میں عبداللہ بن جبیر کی سرکردگی میں لڑنے والے تیراندازوں کی نافرمانی اور ان کے اس حساس مورچے کو چھوڑنے اور دوسرے لوگوں کی مالِ غنیمت جمع کرنے کی مشغولیت سے ورق ہی اُلٹ گیا اور لشکرِ اسلام ایک زبردست شکست سے دوچار ہوا۔

کافی شہید دے کر اور بہت نقصان اُٹھا کر جب مسلمان مدینہ کی طرف پلٹ آئے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا خدا نے ہم سے فتح و کامیابی کا وعدہ نہیں کیا تھا، پھر اس جنگ میں ہمیں کیوں شکست ہوئی؟ اس پر مندرجہ بالا آیات میں انہیں جواب دیا گیا اور شکست کے اسباب کی نشاندہی کی گئی۔ اب ہم آیات کی تفصیلی تفسیر کی طرف آتے ہیں۔

ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذ تحسونهم[1] باذنه حتی اذا فشلتم[2]

اس جملہ میں ارشادِ خداوندی ہے کہ کامیابی کے بارے میں خدا کا وعدہ بالکل درست تھا اور اس کی وجہ ہی سے تم ابتدائے جنگ میں کامیاب ہوئے اور حکمِ خدا سے تم نے دشمن کو تتر بتر کر دیا۔ کامیابی کا یہ وعدہ اس وقت تک تھا جب تک تم استقامت و پامردی اور فرمانِ پیغمبرؐ کی پیروی سے دست بردار نہیں ہوئے اور شکست کا دروازہ اس وقت کھلا جب سستی اور نافرمانی نے تمہیں آگھیرا۔ یعنی اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کامیابی کا وعدہ بلاشرط تھا تو تمہاری بڑی غلط فہمی ہے بلکہ کامیابی کے تمام وعدے فرمانِ خدا کی پیروی کے ساتھ مشروط ہیں۔ البتہ یہ کہ خدا نے مسلمانوں سے اس جنگ میں کامیابی کا وعدہ کب کیا تھا، اس بارے میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ مراد عمومی وعدے ہیں جو خدا کی طرف سے مسلمانوں کو دشمنوں پر کامیابی کے بارے میں دیئے جا چکے تھے۔ دوسرا یہ کہ پیغمبرِ خدا صریحی طور پر جنگِ اُحد سے پہلے وعدہ دے چکے تھے اور ان کا وعدہ خدا کا وعدہ ہے۔

وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما ارٰکم ما تحبون

اس میں کوہ عینین کے تیراندازوں کی طرف اشارہ ہے اور ان کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ تیرانداز جو پہاڑ کے درے پر تھے ان میں مورچہ چھوڑنے کے بارے میں اختلاف پڑ گیا اور ان میں بیشتر نے نافرمانی اور مخالفت کی اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ جیسی تمہاری آرزو تھی ویسی ہی نظروں میں سما جانے والی کامیابی دیکھ لینے کے بعد تم نے راہِ عصیان اختیار کی اور حقیقت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تم نے جو لازمی تھی وہ کوشش کی لیکن اس کو برقرار رکھنے کے لیے تم نے استقامت و پامردی نہیں دکھائی اور ہمیشہ

---

[1] تحسونهم ـــ مادہ حس سے ہے۔ اس کا معنی ہے کسی کے حواس ختم کر دینا اور اسے قتل کر دینا ـــ یعنی تم انہیں قتل کرتے تھے۔

[2] " اذا " ـــ یہاں پر شرطیہ نہیں " حین " اور " وقت " کے معنی میں ہے۔



کامیابیوں کی حفاظت کرنا ان کے حصول سے زیادہ مشکل ہوا کرتا ہے۔

منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاخرۃ

اس موقع پر تم میں سے ایک گروہ دُنیا چاہتا تھا وہ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے لگا جب کہ دوسرا گروہ جس میں عبداللہ بن جبیر اور دیگر تیرانداز شامل تھے جو ثابت قدم رہے وہ آخرت اور خدائی جزا و ثواب کے خواہاں تھے۔

ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم

یہاں ورق اُلٹ گیا اور خدا نے تمہاری کامیابی کو شکست سے بدل ڈالا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور تمہیں تنبیہ کرے اور تمہاری تربیت کرے۔

ولقد عفا عنکم واللہ ذو فضل علی المومنین

اس کے بعد خدا نے تمہاری ان سب نافرمانیوں سے درگزر کیا جبکہ تم سزا کے مستحق تھے کیونکہ خداوند عالم مومنین کے لیے ہر قسم کی نعمتوں کو فروگذار نہیں کرتا۔

اذ تصعدون[1] ولا تلوٗن علی احد والرسول یدعوکم فی اخرٰکم[2]

اس آیت میں خدا تعالیٰ مسلمانوں کے لیے جنگ اُحد کے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے اور فرماتا ہے: یاد کرو اس وقت کو جب تم ہر طرف منتشر تھے اور بھاگ رہے تھے اور پیچھے کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے کہ تمہارے باقی بھائی کس حالت میں ہیں جبکہ پیغمبر پیچھے سے تمہیں پکار رہے تھے: "الیّ عباد اللہ الیّ عباد اللہ فانی رسول اللہ" خدا کے بندو میری طرف پلٹ آؤ میری طرف پلٹ آؤ میں خدا کا رسول ہوں لیکن تم میں سے کوئی اُن کی پکار پر کان نہیں دھرتا تھا۔

فاثابکم غما بغمٍ

اس وقت یکے بعد دیگرے غم و اندوہ تم پر ٹوٹے کیونکہ تم ایک طرف جنگ میں شکست، کئی افسروں اور بہادر سپاہیوں کی شہادت اور کئی زخمیوں کے غم میں مبتلا تھے تو دوسری طرف پیغمبر اکرمؐ کی خبرِ شہادت کے پھیل جانے کی پریشانی اور پھر ان کے زخمی ہونے کا غم تھا اور یہ سب کچھ مخالفتوں اور نافرمانیوں کا نتیجہ تھا۔

لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم ولا ما اصابکم

غم و اندوہ کا یہ سیلاب اس لیے تھا تاکہ اب تم مالِ غنیمت ہاتھ سے جانے پر غمگین نہ ہونے پاؤ اور کامیابی کی راہ میں جو مشکلات اور زخم تمہیں پہنچے ہیں ان کی فکر کرو۔

واللہ خبیر بما تعملون

---

[1] تصعدون مادہ اصعاد سے ہے۔ مفردات میں راغب کے بقول اس کا معنی ہے سطح زمینوں پر چلنا یا اُوپر کی طرف جانا جبکہ صعود کا معنی صرف اُوپر کی طرف جانا ہے۔ آیت میں یہ لفظ شاید اس لیے آیا ہے کہ بھاگنے والوں میں کچھ پہاڑ پر چڑھ گئے تھے اور بعض بیابان میں سرگرداں تھے۔

[2] "اخریکم" یہاں "ورائکم" کے معنی میں ہے یعنی تمہارے پیچھے۔



خدا تمہارے اعمال سے آگاہ تھا اور پوری طرح سے اطاعت کرنے والوں، حقیقی مجاہدین اور اسی طرح بھاگنے والوں کی کیفیت کو جانتا تھا۔ بنابریں تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو فریب نہ دے اور جو کچھ جنگ اُحد میں ہوا ہے اس کے برخلاف دعویٰ نہ کرے اور اگر واقعاً تم پہلے گروہ میں داخل ہو تو خدا کا شکر ادا کرو ورنہ گناہوں سے توبہ کرو۔

زمانۂ جاہلیت کے وسوسے

ثم انزل علیکم من بعد الغم امنۃ نعاسا[۱]

واقعہ اُحد کے بعد والی رات بہت دردناک اور اضطراب انگیز تھی۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ قریش کے فاتح سپاہی دوبارہ مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے اور مسلمانوں کے باقی ماندہ مقابلے کی طاقت ختم کر دیں گے اور شاید کسی طور پر بت پرستوں کے واپس آنے کی خبر بھی انہیں آپہنچی تھی اور یہ مسلم تھا کہ اگر وہ پلٹ آتے تو جنگ کا خطرناک ترین مرحلہ پیش آتا۔ اس دوران حقیقی مجاہدین اور فرار کرنے والوں میں سے پشیمان افراد جنہوں نے توبہ کر لی تھی اب پروردگار کے لطف و کرم پر اعتماد رکھتے تھے اور آئندہ کے لیے پیغمبر اکرمؐ کے وعدوں پر مطمئن تھے۔

اس حالت وحشت میں وہ آرام کی نیند سو گئے تھے جبکہ جنگی لباس میں ملبوس اور ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن منافق ضعیف الایمان اور بزدل گروہ ساری رات فکر و پریشانی میں مبتلا رہا اور بادل نخواستہ حقیقی مومنین کی پہرہ داری کرتا رہا۔ درج بالا آیت رات کی اس کیفیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتی ہے کہ پھر اُحد کے دن کے ان تمام غم واندوہ کے بعد تم پر امن وامان اور راحت وآرام نازل کیا اور یہ وہی ہلکی پھلکی نیند تھی جو تم میں سے ایک گروہ کو آئی۔ لیکن ایک اور گروہ بھی تھا کہ جسے صرف اپنی جان کی فکر تھی وہ لوگ سوائے اپنی جانیں بچانے کے اور کوئی چیز نہیں سوچتے تھے۔ اس لیے وہ راحت و آرام سے محروم ہو گئے تھے۔

یہ ایمان کا ایک اہم ترین ثمرہ ہے کہ مرد مومن اس دنیا میں بھی راحت و آرام سے رہتا ہے جبکہ بے ایمان یا منافق اور کمزور ایمان والے افراد کبھی بھی اس کا ذائقہ نہیں چکھتے۔ بعدازاں قرآن منافقین اور کمزور ایمان والے لوگوں کی گفتگو اور طرز فکر کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ وہ خدا کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کا غلط اور ناحق گمان رکھتے اور اپنی گفتگو میں کہتے کہ شاید پیغمبرؐ کے وعدے غلط ہی ہوں۔ اپنے آپ کو یا ایک دوسرے کو کہتے تھے:

ھل لنا من الامر من شیء یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ اس دلخراش کیفیت کے بعد ہمیں کامیابی نصیب ہو یعنی بہت ہی بعید یا ناممکن ہے۔ قرآن اُن کو جواباً کہتا ہے: قل ان الامر کلہ للہ کہہ دو، جی ہاں! کامیابی تو خدا کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ چاہے اور تمہیں اس لائق سمجھے تو تمہیں کامیابی نصیب کرے۔ وہ اب بات کو ظاہر کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے کیونکہ وہ اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں کفار کی صف میں ان کا شمار نہ ہو۔

یخفون فی انفسھم ما لا یبدون لک

---

[۱] "امنۃ" کا معنی ہے امن و امان اور نعاس کا مطلب ہے ہلکی سی نیند یا اونگھ۔



گویا ان کا خیال تھا کہ جنگ اُحد کی شکست دین اسلام کے ناحق ہونے کی علامت ہے۔ اسی لیے وہ کہتے تھے: لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ھٰھنا۔ یعنی اگر ہم حق پر ہوتے اور کامیابی ہمارے نصیب میں ہوتی تو یہاں ہمارے اتنے لوگ نہ مارے جاتے۔ خداوند عالم ان کے جواب میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے یہ کہ یہ تصور نہ کرو کہ کوئی شخص میدانِ جنگ کے سخت حوادث سے بھاگ کر موت سے بچ سکتا ہے (جبکہ ان کا استقبال کرنا چاہیے) جن کی اجل آگئی ہے چاہے وہ اپنے گھروں میں رہ جائیں ان کے بستر پر دشمن آپڑیں گے اور انہیں قتل کر دیں گے (قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الی مضاجعھم)

اُصولی طور پر وہ قوم جس کی اکثریت کے خلاف شکست کا فیصلہ اس کی سستی کی وجہ سے کیا گیا ہو وہ آخر کار موت کا ذائقہ چکھے گی تو کیا ہی اچھا ہے کہ وہ میدانِ جہاد میں دشمن کی ضرب سے پُر افتخار مقابلے میں اُسے لبیک کہے نہ یہ کہ بستر پر ذلت آمیز طریقہ سے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ یہ حوادث رونما ہونے چاہئیں تاکہ دلوں میں جو کچھ ہے وہ آشکار ہو جائے۔ علاوہ ازیں لوگوں کی آہستہ آہستہ تربیت ہو اور ان کی نیتیں خالص، ایمان پختہ اور دل پاک ہوں (ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم ولیمحص ما فی قلوبکم)۔ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: واللہ علیم بذات الصدور یعنی خدا سینوں کے بھیدوں کو جانتا ہے اسی بنا پر وہ صرف لوگوں کے اعمال پر نگاہ نہیں رکھتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ان کے دلوں کو بھی آزمائے اور انہیں شرک، نفاق، شک اور تردد کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر دے۔

۱۵۵ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۵۵ وہ لوگ جنہوں نے دو گروہوں کے آمنے سامنے ہونے کے دن (جنگ اُحد کے روز) فرار کیا، انہیں شیطان نے ان کے چند گناہوں کی وجہ سے بہکا دیا اور خدا نے انہیں معاف کر دیا۔ خدا بخشنے والا اور بردبار ہے۔

تفسیر

ایک گناہ دوسرے گناہ کا سرچشمہ ہے

ان الذین تولوا منکم ....

یہ آیت بھی جنگ اُحد کے واقعات سے متعلق مسلمانوں سے ایک اور حقیقت بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ جو لغزشیں انسان سے شیطانی وسوسوں کے باعث صادر ہوتی ہیں، وہ دراصل ان گذشتہ گناہوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی روحانی کمزوریوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جو انسان کے لیے دوسرے گناہوں کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ ورنہ پاک و پاکیزہ دل میں شیطانی توہمات کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔



اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو میدان اُحد سے فرار کر گئے شیطان نے انہیں چند ایک گناہوں کی وجہ سے پھسلا دیا مگر خدا نے انہیں بخش دیا اور خدا بخشنے والا اور حلیم ہے۔ یوں خدا اُن کی آزمائش کرتا ہے تاکہ وہ آئندہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوشش کریں وہ پہلے اپنے دل کو گناہ سے پاک کریں۔ اس بات کا امکان ہے کہ اس گناہ سے مراد وہی دنیا پرستی، مال غنیمت کو جمع کرنا اور دوران جنگ پیغمبرؐ کی حکم عدولی کرنا ہو یا دوسرے گناہ مراد ہوں جن کے وہ جنگ اُحد سے پہلے مرتکب ہوئے تھے اور اُنہوں نے ان کی ایمانی قوت کمزور کر دی تھی مفسر عظیم مرحوم طبرسی اس آیت کے ذیل میں ابو القاسم بلخی سے نقل کرتے ہیں کہ جنگ اُحد کے دن (پیغمبرؐ کے علاوہ) سوائے تیرہ افراد کے تمام بھاگ گئے تھے اور ان تیرہ میں سے آٹھ انصار اور پانچ مہاجر تھے۔ جن میں سے حضرت علیؑ اور طلحہ کے علاوہ باقی ناموں میں اختلاف ہے البتہ دونوں کے بارے میں تمام کا اتفاق ہے کہ اُنہوں نے فرار نہیں کیا۔

۱۵۶۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَقَالُوا۟ لِإِخْوَٰنِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ أَوْ كَانُوا۟ غُزًّى لَّوْ كَانُوا۟ عِندَنَا مَا مَاتُوا۟ وَمَا قُتِلُوا۟ لِيَجْعَلَ ٱللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِى قُلُوبِهِمْ ۗ وَٱللَّهُ يُحْىِۦ وَيُمِيتُ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

۱۵۷۔ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝

۱۵۸۔ وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى ٱللَّهِ تُحْشَرُونَ ۝

ترجمہ

۱۵۶ اے ایماندارو! تم کفار کی مانند نہ ہو جاؤ کہ جب اُن کے بھائی سفر یا جنگ کے لیے جاتے ہیں (اور مر جاتے ہیں یا قتل ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور قتل نہ ہوتے (تم ایسا نہ کہو) تاکہ خدا یہ حسرت اُن کے دلوں میں رکھ دے اور زندہ کرنے والا اور مارنے والا خدا ہے (اور زندگی اور موت اُس کے ہاتھ میں ہے) اور وہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

۱۵۷ (اب) اگر تم راہِ خدا میں قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ (تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا) کیونکہ خدا کی رحمت اور مغفرت ان تمام چیزوں سے جو اُنہوں نے (ساری زندگی میں) جمع کیا ہے بہتر ہے۔

۱۵۸ اور اگر تم مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ تو خدا کی طرف پلٹ جاؤ گے (لہٰذا تم فنا نہیں ہو گے کہ اس سے تم پریشان ہو)۔



تفسیر

منافقین کی مفاد پرستی

یاایھاالذین امنوا لا تکونوا کالذین کفروا ....

واقعہ اُحد دو لحاظ سے مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے پہلی یہ کہ یہ واقعہ اس وقت کے تمام حالات وکیفیات کا آئینہ دار ہے جس میں مسلمانوں کی حقیقی صورتحال کی عکاسی ہوتی ہے اور انہیں اپنی کیفیت کی اصلاح کرنے پر اُبھارا گیا اور کمزور پہلوؤں کو بہتر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے اس واقعہ کو نہایت اہتمام سے بیان کیا ہے۔ بہت سی گذشتہ اور آئندہ آیات میں بھی اس واقعے سے تربیت کے لیے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ واقعہ دشمنوں اور منافقوں کے لیے زہر پاشی کا کام دیتا تھا اس لیے بہت سی آیات میں اس کو زائل کیا گیا ہے مندرجہ بالا آیات بھی ایسی ہی ہیں۔

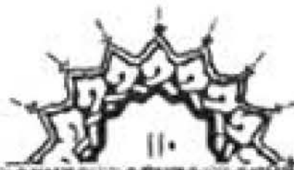
مذکورہ بالا آیات منافقین کی تخریبی کارروائیوں کو ناکام بنانے اور مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے پہلے صاحبِ ایمان افراد سے خطاب کرتی ہیں کہ تم کفار کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جس وقت ان کے بھائی سفر یا جنگ لڑنے کے لیے جاتے ہیں اور وہ قتل ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ افسوس اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔ اگرچہ وہ یہ باتیں ہمدردی کے بھیس میں کرتے ہیں لیکن تم ان زہریلی باتوں سے بچو اور ایسے جملے زبان پر نہ لاؤ۔

لیجعل اللہ ذٰلک حسرۃ فی قلوبھم :

اگر تم مومنین ان کی گمراہ کن باتوں سے متاثر ہوئے اور ایسی ہی باتیں کیں تو فطری طور پر تمہارے جذبے ماند پڑ جائیں گے اور میدانِ جنگ کی طرف جانے سے اور راہِ خدا میں سفر سے رک جاؤ گے اور اس طرح لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن تم ایسا نہ کرو اور مضبوط جذبے کے ساتھ میدان جہاد میں جاؤ تاکہ ایسی حسرت منافقین کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے رہ جائے۔ اس کے بعد قرآن ان کی زہرآلود باتوں کے تین منطقی جواب دیتا ہے:

۱ موت وحیات ہر حالت میں اللہ کے دست قدرت میں ہے، سفر اور جنگ کرنے سے اس کی قطعی ویقینی حالت نہیں بدل سکتی اور خدا بندوں کے سب اعمال سے آگاہ ہے (و اللہ یحی و یمیت واللہ بما تعملون بصیر)۔

۲ اب اگر تم راہِ خدا میں مر جاؤ یا قتل ہو جاؤ اور منافقین کے خیال کے مطابق تم پر موت جلد آپڑے تو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ پروردگار کی رحمت ومغفرت ان اموال سے بدرجہا بہتر ہے جو تم یا منافقین اپنی زندگی میں جمع کرتے ہیں (و لئن قتلتم فی سبیل اللہ او متم لمغفرۃ من اللہ و رحمۃ خیر مما یجمعون)۔ اصولی طور پر ان دونوں کا آپس میں تقابل نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ان کی پست ذہنیت مال و دولت اور چند روزہ زندگی کو اعزازِ جہاد و شہادت پر ترجیح دیتی تھی، اس لیے اس کے علاوہ چارہ نہیں تھا کہ کہا جاتا کہ جن اموال کو کفار شہوت بھری زندگی اور دنیا پرستی کے جنون میں جمع کرتے ہیں، اس سے وہ اعزاز وحاصل کہیں بہتر ہے جو تم راہِ شہادت اور راہِ خدا میں مر جانے سے پاتے ہو۔



۳ موت کا معنیٰ فنا اور نابودی نہیں ہے جس سے تم اتنے پریشان ہوتے ہو بلکہ موت دوسری زندگی کے لیے ایک دریچہ ہے جو بہت وسیع اور جاوداں ہے (ولئن متم او قتلتم لا الی اللہ تحشرون)۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان آیات میں سفر میں مرجانے کو شہادت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان سفروں سے مراد وہ سفر تھے جنہیں وہ خدا کے لیے کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر میدانِ جنگ یا تبلیغی پروگراموں کے لیے سفر کرنا وغیرہ۔ اس دور کے سفر مشکلات و مصائب سے پُر ہوتے تھے بیماریاں بھی آگھیرتی تھیں لہٰذا ان میں مرجانا میدان جہاد میں مرنے سے کم نہیں ہوتا تھا البتہ بعض مفسرین نے اس سے تجارتی سفر مراد لیا ہے لیکن یہ معنیٰ اس آیت سے بہت بعید ہے کیونکہ یہ حصولِ مال کا ایک ذریعہ تھا اور کافروں کو ایسے سفر پر کیا افسوس ہوسکتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں میں کمزوری پیدا کرنے کے لیے مؤثر نہیں ہوسکتی تھی نیز اس سلسلے میں مسلمان اگر کافروں سے ہم آہنگ نہ ہوں تو یہ ان کے لیے باعث حسرت ویاس نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا یہاں سفر میں مرنے سے مراد وہ سفر ہے جو میدان جہاد کی طرف تھا یا دیگر اسلامی مقاصد کے لیے۔

۱۵۹۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○

۱۶۰۔ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۱۵۹ رحمت الٰہی کے سبب تم ان کے سامنے نرم (اور مہربان) ہو اور اگر تم سخت خو ہوتے تو وہ تم سے دور ہوجاتے لہٰذا انہیں معاف کردو اور ان کے لیے مغفرت طلب کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو لیکن مصمم ارادہ کرو تو ڈٹ جاؤ اور خدا پر توکل کرو کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۱۶۰ اگر خدا تمہاری مدد کرے تو کوئی بھی تم پر غلبہ نہیں پاسکتا اور اگر وہ تمہاری مدد سے دستبردار ہوجائے تو اس کے علاوہ کون تمہاری مدد کرنے والا ہے اور مومنین کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیے۔



تفسیر

عام معافی کا حکم

فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم

اگرچہ اس آیت میں گردوپیش کے حوالے سے عمومی پروگراموں سے متعلق کام پیغمبرؐ کو دیئے گئے لیکن شانِ نزول کے لحاظ سے اس کا تعلق جنگ اُحد کے ساتھ ہے کیونکہ جو لوگ واقعہ اُحد کے دوران جنگ سے فرار ہو گئے تھے، وہ پیغمبرؐ کے گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے ندامت و پشیمانی کے عالم میں معافی کی درخواست کی تو خدا تعالیٰ نے اس آیت میں پیغمبر اکرمؐ سے انہیں عام معافی دینے کے لیے فرمایا لہٰذا یہ آیت نازل ہوتے ہی آپؐ نے فراخ دلی سے توبہ کرنے والے خطاکاروں کو معاف کر دیا۔

درج بالا آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی ایک بہت بڑی اخلاقی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم پروردگار کے لطف و کرم کے سبب ان پر مہربان ہو گئے اور اگر تم ان کے لیے سنگدل، سخت مزاج اور تند خو ہوتے اور عملاً ان پر لطف و عنایت نہ کرتے تو وہ تمہارے پاس سے بکھر جاتے۔ ”فظ“ لغت میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی باتیں تیز اور سخت ہوں اور غلیظ القلب اسے کہتے ہیں جو سنگدل ہو اور لطف و محبت کا عملی اظہار بھی نہ کر سکے۔ اس بنا پر ان دونوں میں ”سختی“ کا معنی پایا جاتا ہے لیکن اول الذکر گفتگو میں سختی کرنے اور مؤخر الذکر کام میں سختی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے گویا خدا تعالیٰ نادانوں اور گنہگاروں کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی کامل نرم دلی اور لطف و عنایت کا ذکر کرتا ہے۔

فاعف عنہم واستغفر لہم

اس کے بعد حکم دیا گیا کہ ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمایئے اور انہیں اپنے دامنِ عفو میں جگہ دیجئے اور اس جنگ میں انہوں نے جو بے وفائیاں آپ سے کی ہیں اور جو تکالیف اس جنگ میں آپؐ کو پہنچائی ہیں، ان کے لیے ان کی مغفرت طلب کیجیئے اور میں خود ان کے لیے تم سے سفارش کرتا ہوں کہ انہوں نے میری جو مخالفتیں کی ہیں، مجھ سے ان کی مغفرت طلب کرو دوسرے لفظوں میں جو تم سے مربوط ہے اسے تم معاف کر دو اور جو مجھ سے ربط رکھتا ہے اسے میں بخش دیتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمان خدا پر عمل کرتے ہوئے ان تمام کو عام معافی دے دی۔ واضح ہے کہ عفو و درگزر کرنے کے لیے یہ ایک اہم اور بہت مناسب موقع تھا اور اگر آپؐ ایسا نہ کرتے تو لوگوں کے بکھر جانے کے لیے فضا ہموار تھی۔ وہ لوگ جو اتنی بری شکست کا سامنا کر چکے تھے اور بہت سے مقتول و مجروح پیش کر چکے تھے (اگرچہ یہ سب کچھ ان کی اپنی غلطی سے ہوا تاہم) ایسے لوگوں کو محبت، دلجوئی اور تسلی کی ضرورت تھی تاکہ اُن کے دل اور جسم کے زخم پر مرہم لگ سکے اور وہ ان سے جانبر ہو کر آئندہ کے معرکوں کے لیے تیار ہو سکیں۔

اس آیت میں ہر رہبر و رہنما کے لیے ایک ناگزیر صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ان لوگوں سے درگزر کرنا، نرم مزاجی سے کام لینا اور محبت و مہربانی سے پیش آنا جن سے غلطی سرزد ہوئی ہو اور وہ بعد میں پشیمان ہوئے ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے اگر ایک رہبر سخت مزاج اور تند خو ہو اور محبت و ہمدردی کے جذبے سے سرشار نہ ہو تو وہ بہت جلد اپنے پروگراموں میں ناکام ہو جائے



گا اور لوگ اس کے پاس سے منتشر ہو جائیں گے اور وہ رہبری کی ذمہ داری سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ اسی لیے نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں حضرت علیؑ کا ایک فرمان ہے:

"آلة الریاسة سعة الصدر"

"رہبری فراخ دلی کے ذریعے ہونی چاہیے۔"

مشورہ کرنے کا حکم

"وشاورھم فی الامر"

عام معافی دینے کے حکم کے بعد ان کی شخصیتوں کی حیات تازہ اور فکری و روحانی طور پر انہیں پھر سے زندہ کرنے کے لیے حکم دیا گیا کہ مسلمانوں سے مختلف کاموں میں مشورہ کیجیے اور ان کی رائے اور نظریہ معلوم کیجیے۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ نے جنگ اُحد کے شروع میں مختلف کاموں میں مشورہ کیا تھا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے۔ ان میں سے اکثر کا نظریہ تھا کہ کوہ اُحد کے دامن میں لشکرگاہ اور پڑاؤ ہونا چاہیے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نقطہ نظر کے اچھے نتائج نہ نکل سکے اس لیے عمومی طور پر یہ رائے اُبھری کہ پیغمبر اکرمؐ کو آئندہ کسی سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن اس طرزِ فکر کا جواب دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ پھر بھی ان سے مشورہ کیجیے گا اگرچہ ان کے مشورے کئی مقامات پر مفید ثابت نہیں ہوئے تاہم کلی طور پر مشورہ کے فوائد اس کے نقصانات سے زیادہ ہوتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی تربیت اور شخصیت کی سطح کو بلند کرنے میں اس کے فوائد نقصانات سے کہیں بالاتر ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبرؐ کن مسائل میں لوگوں سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

اگرچہ آیت "شاورھم فی الامر" میں لفظ امر ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں ہر قسم کا کام شامل ہے۔ لیکن مسلّم ہے کہ آپؐ احکام الٰہی میں ان سے مشورہ نہیں کیا کرتے تھے بلکہ انہیں وہ وحی الٰہی کے تابع کرتے تھے۔ اس بنا پر مشورہ کا دائرہ کار صرف ان احکام کے اجراء کے طرز و طریقہ اور ان کو عملی جامہ پہنانے تک محدود ہوتا تھا دوسرے لفظوں میں آپؐ صرف اجرائے قانون کے طریقہ کے بارے مسلمانوں کا نظریہ معلوم کر لیتے تھے۔ قانون بنانے میں کبھی کسی سے مشورہ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرتؐ کوئی پروگرام ان کے سامنے پیش کرتے تو مسلمان یہ پوچھتے کہ کیا یہ حکم الٰہی ہے جس میں اظہار رائے کی گنجائش نہ ہو یا قوانین کے اجراء سے مربوط ہے جس کے لیے وہ لوگ اپنا نظریہ پیش کر سکیں اگر امر دوسری قسم کا ہوتا تو وہ اپنی رائے پیش کرتے ورنہ قبول کر لیتے چنانچہ جنگ بدر میں مسلمان آپؐ کے حکم کے مطابق ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہتے تھے تو ایک صحابی "حباب بن منذر" نے پوچھا کہ کیا اس مقام کو خدا کے حکم سے منتخب کیا گیا ہے یا آپؐ کی رائے ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں کوئی خاص حکم تو نہیں آیا تو اس نے مختلف وجوہ پیش کیں اور کہا کہ یہ جگہ مناسب نہیں آپ حکم دیجیے کہ لشکر اسلام یہاں سے چل پڑے اور پانی کے قریب پڑاؤ ڈالے۔ آنحضرتؐ نے اس کی رائے کو پسند کیا اور اس کے مطابق عمل فرمایا[1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۴ صفحہ ۱۰۰ (ظاہر ہے اصولی طور پر یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی۔ مترجم)



اسلام میں مشورہ کی اہمیت

مشورہ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پیغمبر اکرمؐ وحی آسمانی سے قطع نظر ایسی قوت فکر کے مالک تھے کہ انہیں کسی قسم کے مشورہ کی ضرورت نہ تھی، پھر بھی آپؐ مسلمانوں کو مشورہ کی اہمیت بتلانے کے لیے قانون سازی کو چھوڑ کر دیگر عام معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے تاکہ ان کی قوت فکر و نظر پروان چڑھ سکے اور خصوصیت کے ساتھ صاحب الرائے افراد کی قدر افزائی کیا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض دفعہ ان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی رائے کو ترجیح دیا کرتے تھے جیسا کہ ایک واقعہ جنگ اُحد کے تذکرے میں پیش کیا گیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی اسلامی پروگراموں میں کامیابی کا ایک اہم راز ان کا یہی طرزِ عمل تھا۔ اصولی طور پر جو لوگ اپنے اہم کاموں کو ایک دوسرے کے صلاح و مشورہ سے انجام دیتے ہیں اور متعلقہ اُمور کے ماہر غور و خوض کے بعد ان کے بارے میں مشورہ دیتے ہیں اس کے برعکس جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں کے صلاح و مشورہ سے بے نیاز سمجھتے ہیں وہ کتنے ہی بڑے صاحبِ فکر و نظر کیوں نہ ہوں زیادہ تر خطرناک اور المناک اشتباہات میں گرفتار ہو جاتے ہیں علاوہ ازیں مشورہ سے بے نیازی کی وجہ سے عامۃ الناس میں شخصیت کا وقار ختم ہو جاتا ہے اور افکار و نظریات کی ترویج میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے اور موجود استعدادیں ختم ہو جاتی ہیں اور اس طرح کسی ملت کا بہت بڑا انسانی سرمایہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مزید براں جو شخص اپنے کام دوسروں کے صلاح و مشورہ سے کرتا ہے اگر وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے تو دوسرے لوگ اس کو حسد کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کیونکہ دوسرے لوگ اس کی کامیابی کو اپنی طرف سے ہی سمجھتے ہیں اور عموماً انسان اس کام سے حسد نہیں کرتا جسے اس نے خود سرانجام دیا ہو اور اگر کبھی وہ شکست کھا جائے تو وہ دوسروں کے اعتراضات کا نشانہ نہیں بنتا کیونکہ کوئی شخص اپنے کام کے نتیجہ پر اعتراض نہیں کرتا نہ صرف یہ کہ اعتراض نہیں کرتا بلکہ ہمدردی و غمخواری بھی کرتا ہے۔

مشورے کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان دوسرے افراد کی شخصیت کی قدر و قیمت اور اُن کی دشمنی و دوستی کا اندازہ بھی لگا لیتا ہے اور یہ چیز کامیابی کے لیے درکار شناسائی و آشنائی کا سبب بھی بنتی ہے۔

اسلامی روایات میں مشورے کے بارے میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے ایک حدیث میں رسولِ خداؐ نے فرمایا!

"ما شقی عبد قط بمشورة ولا سعد باستغناء رای"

کوئی شخص ہرگز مشورے سے بدبخت اور استبداد رائے سے خوش بخت نہیں ہو سکتا۔[1]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"من استبد برایه هلك ومن شاور الرجال شارکها فی عقولها"

جو شخص استبداد رائے رکھتا ہو وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور جو بڑے لوگوں سے مشورہ کرتا ہے وہ ان کی عقل میں شریک ہو جاتا ہے۔[2]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی۔

[2] نہج البلاغہ۔



پیغمبر اکرمؐ نے ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

"اذا کان امرائکم خیارکم و اغنیائکم سمحائکم و امرکم شوری بینکم فظهر الارض خیر لکم من بطنها و اذا کان امرائکم شرارکم و اغنیائکم بخلائکم و لم یکن امرکم شوری بینکم فبطن الارض خیر لکم من ظهرها"

جس وقت تمہارے حاکم نیک لوگ ہوں اور تمہارے امیر سخی ہوں اور تمہارے کام مشورے سے انجام پائیں تو اس وقت زمین کا ظاہری حصہ باطنی کی نسبت تمہارے لیے بہتر ہے (یعنی یہ زمین جینے کے قابل ہے) لیکن اگر تمہارے حکمران برے ہوں، دولت مند بخیل ہوں اور کام ایک دوسرے کے مشورہ سے نہ ہوتے ہوں تو اس وقت تمہارے لیے زمین کا نچلا (باطنی) حصہ، بالائی (ظاہری) حصے سے بہتر ہے۔[1]

یہ مسلّم ہے کہ ہر شخص سے مشورہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بعض اوقات ان میں کمزوری کے پہلو ہوتے ہیں جن کی بنا پر ان کا مشورہ بدبختی اور پسماندگی کا سبب بن سکتا ہے جیسا کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ تین قسم کے لوگوں سے مشورہ نہ کرو۔

۱۔ بخیل افراد سے مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے بخشش اور دوسروں کی مدد کرنے سے روکیں گے اور فقر و غربت سے ڈرائیں گے (لا تدخلن فی مشورتک بخیلا یعدل بک عن الفضل و یعدک الفقر)[2]

۲۔ بزدلوں سے بھی مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ تجھے اہم کاموں کی انجام دہی سے روکیں گے (ولا جبانا یضعفک عن الامور)[2]

۳۔ حریص افراد سے مشورہ نہ کرنا کیونکہ وہ دولت کی طمع میں تمہیں ظلم و ستم کی طرف رغبت دلائیں گے (ولا حریصا یزین لک الشرة بالجور)۔

جس سے مشورہ کیا جائے اُس کی ذمہ داری

جس طرح اسلام میں مشورہ کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اسی طرح ان افراد کے بارے میں احکام ہیں جن سے مشورہ کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ خیر خواہی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ مشورہ میں خیانت کرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ یہ حکم غیر مسلموں کے لیے بھی ہے کہ وہ مشورہ طلب کریں تو ان سے کسی قسم کی خیانت نہ کی جائے اور جو صحیح رائے ہو وہی انہیں دی جائے۔

امام زین العابدین علیہ السلام سے نقل شدہ "رسالہ حقوق" میں آپؑ نے فرمایا:

"وحق المستشیر ان علمت له رأیا اشرت علیه و ان لم تعلم ارشدته الی من یعلم
وحق المشیر علیک ان لا تتهمه فیما لا یوافقک من رأیه"

تجھ سے مشورہ کرنے والے کا حق یہ ہے کہ اگر کوئی نظریہ رکھتے ہو تو اسے بتادو اور اگر اس کام کے بارے میں تجھے

۱۔ تفسیر ابوالفتوح رازی۔ ۲۔ نہج البلاغہ فرمان بنام مالک اشتر۔



علم نہیں تو اسے ایسے شخص کی طرف رہنمائی کرو جو جانتا ہے اور مشورے دینے والے کا حق تجھ پر یہ ہے کہ جس نظریے میں وہ تمہارا موافق نہیں ہے اس میں اس پر تہمت تراشی نہ کرو۔ [1]

حضرت عمر کی مجلس شوریٰ

اہل سنت کے مفسرین درج بالا آیت کے ذیل میں حضرت عمر کی اس چھ رکنی مشاورتی کمیٹی کا تذکرہ کرتے ہیں جو انہوں نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے لیے تشکیل دی تھی یہ لوگ مندرجہ بالا آیت اور مشورہ کی تمام روایات کو اسی واقعہ پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ اس موضوع کے متعلق عقائد کی کتابوں میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے لیکن یہاں چند ایک نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ امام اور جانشین پیغمبرؐ کا انتخاب صرف اللہ کے حکم سے ہونا چاہیے کیونکہ اسے بھی پیغمبرؐ کی طرح عصمت اور ایسے دیگر کمالات کا حامل ہونا چاہیے کہ جن کا علم صرف خدا کے پاس ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح پیغمبرؐ کو مشورے سے منتخب نہیں کیا جاسکتا ہے اسی طرح امام کا انتخاب بھی مشورے سے ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ افراد کی مجلس شوریٰ ہرگز مشورے کے تقاضوں اور شرائط کو پورا نہیں کرتی کیونکہ اگر مقصود تمام مسلمانوں سے مشورہ کرنا تھا تو اسے چھ افراد میں منحصر کرنے کا کیا معنی ہے اور اگر مقصد اُمت کے صاحبانِ فکر و نظر سے مشورہ کرنا تھا تو وہ صرف چھ نہیں تھے اُمت کے دانا و اہل رائے افراد مثلاً سلمان جو خود حضرت پیغمبر اکرمؐ کے مشیر تھے اسی طرح ابوذر، مقداد، ابن عباس اور ان جیسے دیگر افراد مجلسِ شوریٰ میں شامل نہ تھے۔ مجلسِ مشاورت کی ہیئت مشاورت کی بجائے ایک سیاسی چال زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر مشورے کے لیے صاحبانِ اثر و رسوخ کو جمع کرنا مقصود تھا تاکہ دوسرے لوگ اُن کی رائے قبول کرلیں پھر بھی یہ ہیئت درست نہ تھی کیونکہ کئی ایک اہم شخصیتیں ان میں شامل نہ تھیں مثلاً سعد بن عبادہ جو انصار کے سربراہ تھے، ابوذر غفاری جو قبیلہ غفار کی ایک عظیم شخصیت تھے اور ان جیسے دیگر افراد اس مجلسِ مشاورت سے الگ رکھے گئے تھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ اس مجلس شوریٰ کے لیے بڑی سخت اور سنگین شرائط مقرر کی گئی تھیں اور مخالفین کو موت کی دھمکی تک دی گئی تھی حالانکہ اسلام کے مشاورتی اصولوں اور طریقوں میں ایسی کسی چیز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آخری فیصلے کا مرحلہ

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ

مشورہ کرتے وقت نرم مزاجی اور محبت سے کام لینا چاہیے لیکن جب پختہ ارادہ کرلیا جائے تو اتنا ہی مضبوط بھی ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو ہر قسم کے تردد اور اختلاف آراء سے دور رکھتے ہوئے مصمم ارادہ کرلینا چاہیے۔ اسی کو قرآن مجید نے مندرجہ بالا آیت میں عزم سے تعبیر کیا ہے اور یہی تصمیم قاطع ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۴۰۵۔



یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں جمع (وشاورھم) کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے لیکن آخری فیصلہ پیغمبر اکرمؐ کے ذمہ کر دیا گیا ہے اور یہاں واحد کا صیغہ (عزمت) استعمال ہوا ہے۔ جمع و مفرد کا یہ فرق ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی معاملات کے مختلف پہلوؤں کا مل جل کر اور اجتماعی صورت میں جائزہ لینا چاہیے اور تحقیق کرنا چاہیے لیکن جب ایک چیز کو درست سمجھ لیا جائے تو پھر اس کے اجراء کے لیے ایک ہی ارادے کو کام میں لانا چاہیے ورنہ ہرج مرج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر ایک پروگرام پر کسی ایک سرپرست کی بجائے کئی رہبروں کے ذریعے عمل درآمد ہو تو یقینی طور پر وہ اختلاف اور شکست سے دوچار ہوگا۔ اسی بناء پر آج کی دنیا میں بھی مشورہ تو اجتماعی صورت میں ہوتا ہے لیکن فیصلے کا نفاذ ایسی حکومتوں کے ذریعے ہوتا ہے جس کے پروگرام ایک شخص کے زیر نظر رہ کر انجام پاتے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت کہتی ہے کہ پختہ ارادہ کرتے ہوئے خدا پر توکل کرنا چاہیے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ عمومی اسباب و وسائل فراہم ہو جانے کے بعد خدا کی لامتناہی قدرت سے مدد طلب کرنا فراموش نہ ہو جائے۔ البتہ توکل کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مادی دنیا میں خدا کے عطا کردہ اسباب و وسائل کو کام میں نہ لائے۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک عرب نے اپنے اونٹ کے پاؤں نہیں باندھے تھے اور اسے محافظ کے بغیر چھوڑ دیا تھا اور اسے وہ خدا پر توکل کرنا سمجھتا تھا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا:

اعقلها و توكل

یعنی —— پہلے اس کا پاؤں باندھو اور پھر توکل کرو۔

یہاں آیت میں یہ مقصد ہے کہ انسان عالم مادہ کی چار دیواری اور اپنی محدود قدرت و توانائی پر انحصار نہ کرے اور اپنی نگاہیں پروردگار کی حمایت و لطف پر لگائے رکھے۔ یہ مخصوص توجہ انسان کو امن و سکون، اطمینان اور عظیم روحانی تقویت سے ہمکنار کرتی ہے جو مشکلات کے عالم میں انسان کے لیے بہت مؤثر ہوتی ہے۔

اس کی مزید تفصیل مسئلہ توکل اور عالم طبیعت سے استفادہ کرنے کے زیر عنوان انشاء اللہ سورہ طلاق کی آیت ۲ —— ومن يتق الله يجعل له مخرجا —— کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ان الله يحب المتوكلين

بعد والی آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ توکل کا مرحلہ مکمل مشورہ کرنے اور تمام امکانی وسائل جو انسانی اختیار میں ہیں سے استفادہ کرنے کے بعد آتا ہے۔

توکل کا نتیجہ

ان ينصركم الله فلا غالب لكم و ان يخذلكم فمن ذا الذي ينصركم من بعده



یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے اس میں خدا پر توکل کے سلسلے میں ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ خدا کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے لہٰذا وہ جس کی حمایت کرے گا دوسرا کوئی بھی اس پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ ذات جو ایسی تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے اُس پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اسی سے مدد مانگنی چاہیے۔

یہ آیت اہل ایمان کو ترغیب دلاتی ہے کہ ہر قسم کے ظاہری وسائل میسر ہونے کے باوجود خدا تعالیٰ کی ناقابلِ شکست قدرت پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

دراصل گذشتہ آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا لیکن اس آیت میں تمام مومنین مخاطب ہیں۔ انہیں فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ کی طرح خدا کی ذات پاک پر بھروسہ کریں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔ یعنی مومنین کو صرف ذاتِ خدا پر توکل کرنا چاہیے۔

بنا کیے واضح ہے کہ خدا تعالیٰ مومنین کی حمایت یا عدم حمایت بلاوجہ نہیں کرتا بلکہ اُن کی اہلیت کے مطابق ہی کرتا ہے۔ جو خدا کے حکم کو پاؤں تلے روندتے ہیں اور مادی و روحانی توانائیاں فراہم کرنے سے غافل رہتے ہیں خدا کی مدد اور حمایت اُن کے لیے نہیں ہوتی مگر جو لوگ صف بستہ خالص نیت اور عزمِ راسخ سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، تمام ممکنہ دیگر وسائل بھی دشمن کے مقابلے میں فراہم کرتے ہیں انہی کے سر پر خدا کا دستِ حمایت ہوتا ہے۔

۱۶۱۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۱۔ (تم گمان کرتے ہو کہ ہو سکتا ہے پیغمبرؐ تم سے خیانت کرے حالانکہ) ممکن نہیں ہے کہ کوئی پیغمبر خیانت کرے اور جو شخص خیانت کرے گا وہ روزِ قیامت اسی چیز کے ہمراہ (میدان حشر میں) پیش ہو گا پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اُس نے کمایا ہو گا (اس بنا پر) ان پر ظلم نہیں ہو گا (بلکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہی دیکھیں گے)۔

تفسیر

ہر قسم کی خیانت ممنوع ہے

وما کان لنبی ان یغل

اس طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ مندرجہ بالا آیت جنگ احد کے سلسلے کی آیات کے بعد آئی ہے اور ان روایات پر نظر رکھتے ہوئے جو صدر اول کے مفسرین نے نقل کی ہیں، یہ آیت جنگ احد کے سپاہیوں کی بعض بے بنیاد عذر تراشیوں کے جواب میں ہے۔ اس کی



وضاحت کچھ یوں ہے کہ جنگ اُحد کے بعض تیر انداز جب اپنا حساس مورچہ مالِ غنیمت جمع کرنے کے لیے چھوڑنا چاہتے تھے تو اُن کے سردار نے انہیں حکم دیا کہ وہ یہ مورچہ نہ چھوڑیں اور ساتھ ہی اُن سے کہا کہ رسولِ خدا تمہیں مالِ غنیمت سے محروم نہیں رکھیں گے لیکن ان دنیا پرستوں نے اپنے اصلی چہرے چھپانے کے لیے کہا کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ پیغمبر تقسیمِ غنائم میں نظر انداز کر دیں گے لہٰذا ہمیں اپنے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا مورچہ چھوڑا اور مالِ غنیمت سمیٹنے لگ گئے اور پھر وہ دردناک حوادث پیش آئے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

قرآن اُن کے جواب میں کہتا ہے: کیا تم گمان کرتے ہو کہ پیغمبرؐ تم سے خیانت کریں گے جبکہ ممکن نہیں کہ کوئی پیغمبر خیانت کرے (وماکان لنبی ان یغلّ)[1]

اس آیت میں خداوندِ عالم نے ساحتِ مقدس انبیاء کو خیانت سے کاملاً منزہ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرماتا ہے: بنیادی طور پر ایسی چیز مقامِ نبوت کے شایانِ شان ہی نہیں یعنی خیانت کا نبوت سے کوئی جوڑ نہیں اگر پیغمبر خائن ہو تو پھر رسالتِ الٰہی کی ادائیگی اور تبلیغِ احکام میں اس پر اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔

بغیر کہے واضح ہے کہ اس آیت میں انبیاء سے ہر قسم کی خیانت کی نفی کی گئی ہے اس کا تعلق مالِ غنیمت کی تقسیم سے ہو یا لوگوں کی امانتوں کی حفاظت سے یا پھر وحی حاصل کرنے اور اسے بندگانِ خدا تک پہنچانے سے۔

تعجب ہے کہ جو شخص پیغمبرؐ کو وحیِ الٰہی کے بارے میں امین سمجھتا ہو کیسے گمان کر سکتا ہے کہ وہ نعوذ باللہ جنگی مالِ غنیمت کے بارے میں ناروا حکم دے گا یا اسے اس کے حق سے محروم کر دے گا۔

البتہ واضح ہے کہ خیانت کی کسی شخص کو اجازت نہیں چاہے وہ پیغمبر ہو یا کوئی اور، لیکن جنگ اُحد کے بہانہ سازوں کی گفتگو چونکہ پیغمبرؐ کے بارے میں تھی لہٰذا آیت بھی پہلے انبیاء کے متعلق بات کرتی ہے اور پھر مزید کہتی ہے: ومن یغلل یأت بما غلّ یوم القیٰمۃ۔ یعنی جو شخص بھی خیانت کرے گا وہ روزِ قیامت اُس چیز کا بار اپنے دوش پر بطورِ سند اُٹھائے ہوئے حاضر ہوگا جس میں اُس نے خیانت کی ہوگی یا میدانِ محشر میں اُسے اپنے ساتھ لائے گا۔ اس طرح وہ سب کے سامنے ذلیل و رسوا ہوگا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دوش پر اُٹھا لانے یا اپنے ساتھ لے آنے سے مراد یہ نہیں کہ بعینہٖ وہی چیز اُٹھا لائیں گے بلکہ یہاں اس کی جواب دہی کا بوجھ مراد ہے لیکن قیامت میں انسانی اعمال مجسم ہونے کے مسئلے کی طرف نظر کی جائے تو اس تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ جیسے مندرجہ بالا آیت کا ظاہری مفہوم شاہد ہے بعینہٖ وہی چیزیں بطورِ سند خیانت کاروں کے دوش پر ہوں گی یا ان کے ہمراہ ہوں گی جن میں خیانت کی گئی ہے۔

ثم توفی کل نفس ما کسبت و ھم لا یظلمون

پھر ہر شخص کو وہ کچھ دیا جائے گا جو اس نے انجام دیا ہے یا کسب کیا ہے یعنی لوگ اپنے اعمال کو بعینہٖ وہاں پائیں گے لہٰذا

---

[1] یہ لفظ "غل" سے خیانت کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اصل میں "غل" کا معنی ہے پانی کا تدریجی اور مخفی طور پر درختوں کی جڑوں میں پہنچنا۔ خیانت چونکہ مخفی طور پر اور تدریجاً ہوتی ہے اس لیے اسے بھی "غلول" کہتے ہیں تشنگی سے پیدا ہونے والی اندرونی حالت کو بھی "غلیل" اسی وجہ سے کہتے ہیں۔



اس بنا پر کسی شخص پر ظلم و ستم نہیں ہو گا کیونکہ ہر شخص کو وہ کچھ مل جائے گا جو اس نے حاصل کیا تھا یا کمایا تھا، چاہے اچھا ہو یا بُرا۔

مندرجہ بالا آیت اور وہ احادیث جو پیغمبر اکرمؐ پر خیانت کا الزام لگانے کی مذمت کے ضمن میں صادر ہوئیں انہوں نے مسلمانوں پر عجیب تربیتی اثرات مرتب کیے۔ ان کی تاثیر تھی کہ ان سے چھوٹی سے چھوٹی خیانت بھی سرزد نہیں ہوتی تھی خصوصاً مال غنیمت اور دیگر مالی معاملات میں ہوتا یہ تھا کہ بہت قیمتی غنائم کم حجم ہونے کے باوجود جن میں خیانت کرنا کچھ مشکل نہ تھا، مکمل پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے بعد برسرکار حکام کے پاس بغیر دست برد کے لائے جاتے تھے اور یہ ہر دیکھنے والے کے لیے تعجب خیز امر تھا۔ یہ وہی زمانہ جاہلیت کے وحشی اور غارت گر عرب تھے جو تعلیمات اسلامی کے نتیجے میں انسانی تربیت کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے۔ گویا میدان محشر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ جس میں اموال میں خیانت کرنے والوں کو سب کے سامنے اس عالم میں پیش کیا جائے گا کہ وہ اموال ان کے دوش پر ہوں گے جن میں انہوں کی خیانت کی ہو گی۔ یہی وہ ایمان تھا جو انہیں اس قدر بیدار کرتا تھا کہ وہ خیانت کا خیال بھی ترک کر دیں۔

طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے:

جب مسلمان مدائن میں داخل ہوئے اور مال غنیمت جمع کرنے لگے ایک مسلمان مال غنیمت میں سے ایک نہایت قیمتی چیز مال غنیمت جمع کرنے والوں کے پاس لے آیا۔ وہ اس چیز کو دیکھ کر تعجب کرنے لگے اور اس سے کہنے لگے ہم نے آج تک اس قسم کی قیمتی چیز نہیں دیکھی۔ پھر انہوں نے اس سے پوچھا: تم نے اس میں سے کچھ لیا بھی ہے؟ وہ کہنے لگا: خدا کی قسم اگر یہ خدا کے لیے نہ ہوتا تو میں ہرگز اسے تمہارے پاس نہ لاتا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ شخص بڑی روحانی شخصیت کا حامل ہے۔ پھر انہوں نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنا تعارف کروائے۔ وہ کہنے لگا: بخدا میں ہرگز تم سے اپنا تعارف نہیں کرواؤں گا، کہیں تم میری تعریف و توصیف کرنے لگو میں نہیں چاہتا کہ دوسرے میری تعریف کریں لیکن میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کی جزا و ثواب پر راضی ہوں[1]

۱۶۲۔ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

۱۶۳۔ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۶۲ وہ جو رضائے خدا کی پیروی کرے کیا وہ اس کی مانند ہے جو خشم و غضب خدا کی طرف لوٹے اور جس کی جائے قرار جہنم ہے جس کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔

۱۶۳ ان میں سے ہر ایک کے لیے درگاہِ خدا میں درجہ و مقام ہے اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا اسے دیکھتا ہے۔

---

[1] تاریخ طبری، جزو ۴، صفحہ ۱۶۔



تفسیر

جہاد میں شرکت نہ کرنے والے

افمن اتبع رضوان اللہ

آیاتِ گذشتہ میں جنگِ اُحد کے مختلف پہلوؤں اور اس کے نتائج پر بحث ہو چکی ہے۔ اب باری ہے منافقین اور ان کمزور ایمان والے مسلمانوں کی جو منافقین کی اتباع کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں حاضر نہ ہوئے۔ روایات میں ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے جنگِ اُحد کے لیے چلنے کا حکم صادر فرمایا تو منافقین کا ایک گروہ اس بہانے سے شامل نہ ہوا کہ بقول ان کے انہیں جنگ کے وقوع پذیر ہونے کا یقین نہیں تھا۔ بعض کمزور ایمان والے مسلمان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ زیرِ نظر آیت ان کی اسی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے: وہ لوگ جو حکمِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی رضا کی پیروی کرتے ہیں کیا وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو غضبِ خدا کی طرف لوٹ گئے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم اور ان کا انجام کار بُرا اور تکلیف دہ ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ھم درجات عند اللہ — یعنی ان میں سے ہر کوئی بارگاہِ الٰہی میں درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ نہ فقط یہ کہ تن پرور منافق اور مجاہدین آپس میں فرق رکھتے ہیں بلکہ ہر شخص جو ان دو صفوں میں سے کسی میں کھڑا ہے فداکاری و جانبازی یا نفاق و حق دشمنی میں فرق کا ایک خاص درجہ رکھتا ہے جو صفر سے شروع ہو کر حدِ تصور سے بالاتر تک جاری و ساری رہتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں حضرت امام علیؑ بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

ہر درجے کے درمیان آسمان و زمین کے درمیانی فاصلے جتنا فاصلہ ہے[1]

ایک اور روایت میں ہے:

اہلِ بہشت درجاتِ بالا میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے آسمان پر ستارہ دکھائی دیتا ہے[2]

البتہ توجہ رہے کہ عموماً درجہ سیڑھیوں کو کہا جاتا ہے کہ جن کے ذریعے انسان بلند نقطے کی طرف جاتا ہے لیکن جن سیڑھیوں کے ذریعے نیچے کی طرف جایا جاتا ہے انہیں "درک" (بروزن مرگ) کہا جاتا ہے۔ اسی لیے سورۂ بقرہ آیہ ۲۵۳ میں انبیاء کے بارے میں ہے:

ورفع بعضھم فوق بعض درجات

سورہ نساء آیہ ۱۴۵ میں منافقین کے بارے میں ہے:

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۴۰۶

[2] تفسیر مجمع البیان، زیرِ نظر آیت کے ذیل میں۔



ان المنٰفقین فی الدرک الاسفل من النار

لیکن زیر بحث آیت میں کیونکہ دونوں گروہوں کے متعلق گفتگو ہے اس لیے مومنین سے متعلقہ تعبیر اختیار کی گئی اور لفظ "درجۃ" استعمال کیا گیا (اس طرز بیان کو ادبی اصطلاح میں تغلیب کہتے ہیں)۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: واللہ بصیر بما یعملون۔ یعنی خدا سب کے اعمال دیکھتا ہے اور کامل طور پر جانتا ہے کہ ہر شخص اپنی نیت، ایمان اور عمل کے لحاظ سے کس درجے کا اہل ہے۔

ایک موثر طریقۂ تربیت

قرآن مجید میں دینی، اخلاقی اور اجتماعی معارف سے مربوط حقائق کو سوال کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے اور مسئلہ کے دونوں پہلو سننے والے کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی عقل و فکر سے ایک کو انتخاب کر لے۔ یہ طریقہ جسے غیر مستقیم (INDIRECT) کہنا چاہیے تربیتی امور میں بہت موثر ہوتا ہے کیونکہ انسان عموماً مختلف امور میں سے سب سے زیادہ اہمیت اپنے افکار و نظریات کو دیتا ہے۔ جب کوئی مسئلہ ایک قطعی اور حتمی صورت میں پیش کیا جائے تو بعض اوقات انسان اُس کے مقابلے کی کوشش کرتا ہے اور اسے ایک اجنبی فکر کی حیثیت سے دیکھتا ہے لیکن جب اسے سوال کی صورت میں پیش کیا جائے اور اس کا جواب وہ اپنے وجدان اور دل کے اندر سے سُنے تو اسے اپنی فکر اور اپنی رسائی سمجھتا ہے اور اسے ایک جانی پہچانی فکر کی حیثیت سے قبول کرتا ہے لہٰذا اس کے مقابلے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ طرز تعلیم بالخصوص ہٹ دھرم لوگوں اور بچوں کے لیے موثر ہے۔ قرآن مجید میں اس طریقے سے بہت کام لیا گیا ہے، اس کے چند نمونے یہ ہیں۔

۱ ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون

یعنی ــــ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔ (زمر ـ ۹)

۲ قل ھل یستوی الاعمٰی و البصیر افلا تتفکرون

یعنی ــــ کہیے: کیا نابینا اور بینا برابر ہیں، کیا تم سوچتے نہیں۔ (انعام ـ ۵۰)

۳ قل ھل یستوی الاعمٰی و البصیر ام ھل تستوی الظلمٰت و النور

یعنی ــــ کہیے کیا نابینا اور بینا برابر ہیں، آیا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں۔ (رعد ـ ۱۶)

۱۶۴۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ النصف

ترجمہ

۱۶۴ خدا نے مومنین پر احسان کیا (انہیں ایک عظیم نعمت بخشی) جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کے



سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگر چہ اس سے پہلے وہ واضح گمراہی میں تھے۔

تفسیر

خدا کی بہت بڑی نعمت

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم

اس آیت میں عظیم ترین نعمت ــــ یعنی "بعثت پیغمبر اسلامؐ" کے متعلق گفتگو ہے۔ حقیقت میں یہ ان سوالات کا جواب ہے جو نو مسلموں کے دل میں جنگ اُحد کے بعد اُٹھتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ ہم ان مشکلات و مصائب میں کیوں گرفتار ہوں۔ قرآن انہیں کہتا ہے: اگر تمہیں اس راہ میں نقصان اٹھانا پڑا ہے تو یہ نہ بھول جاؤ کہ اللہ نے تمہیں ایک بہت بڑی نعمت عطا کی ہے، اس نے پیغمبر مبعوث کیا ہے جو تمہاری تربیت کرتا ہے اور تمہیں کھلی گمراہیوں سے روکتا ہے، اس عظیم نعمت کی حفاظت کے لیے تم جتنی بھی کوشش کرو اور تمہیں جتنی بھی قیمت دینا پڑے حقیر ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس نعمت کا ذکر لقد من اللہ علی المؤمنین (خدا نے مومنین پر احسان کیا) سے شروع ہوتا ہے، جو ابتدائی نظر میں مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن "منت" کے اصلی معنی کی طرف توجہ دی جائے تو مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مفردات میں راغب کہتا ہے کہ یہ لفظ دراصل "من" سے ہے جس کا معنی ہے "وہ پتھر جن سے چیزوں کو تولا جاتا ہے" اسی لیے ہر قیمتی چیز اگر وہ عملی پہلو رکھتی ہو تو اُسے "منت" کہتے ہیں یعنی کسی نے دوسرے کو عملی طور پر عظیم نعمت عطا کی ہو تو اس کا استعمال بالکل زیبا اور مناسب ہے لیکن اگر کوئی اپنے چھوٹے سے کام کو باتوں سے بڑا کر کے دکھائے تو یہ انتہائی بُرا اور قبیح ہے لہٰذا احسان جتلانا جو بُرا اور مذموم ہے وہ باتوں میں اپنے احسانات کو بڑا شمار کرنا ہے لیکن اُس احسان کا تذکرہ جو عظیم نعمتوں کی عطا ہو، مناسب اور زیبا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: پروردگار نے مومنین پر احسان کیا یعنی انہیں عظیم نعمت عطا کی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف مومنین کا ذکر کیوں کیا گیا ہے جبکہ بعثت پیغمبرؐ تو تمام نوع بشر کی ہدایت کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نتیجہ اور تاثیر کے لحاظ سے صرف مومنین ہی اس عظیم نعمت سے استفادہ کرتے ہیں اور عملاً اسے اپنے سے مخصوص کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے: پیغمبر کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خود انہی کی جنس اور نوع بشر میں سے ہے (من انفسھم) وہ فرشتہ یا دیگر مخلوق کی نوع میں سے نہیں ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ ضروریات بشر کو مکمل طور پر جان سکے اور انسانوں کے دُکھ درد، مشکلات، مصائب اور مسائل زندگی کو لمس کر سکے اور یوں ان کی تربیت کے لیے اقدام کرنے کی طرف خود متوجہ ہو سکے۔ علاوہ ازیں انبیاء کے تربیتی پروگرام کا اہم ترین حصہ اُن کی اپنی زندگی اور عملی تبلیغات تھیں۔ اُن کے اعمال تربیت کے لیے بہترین نمونہ اور ذریعہ تھے۔ کیونکہ "عمل کی زبان" سے ہر زبان میں بہتر تبلیغ کی جا سکتی ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب تبلیغ کرنے والا سننے والے کا ہم جنس ہو۔ اُس کی جسمانی، طبیعی اور روحی بناوٹ ایک سی ہو۔ مثلاً اگر انبیاء ملائکہ کے ہم جنس ہوتے تو لوگوں کی طرف سے یہ سوال باقی رہتا کہ اگر وہ گناہ نہیں کرتے تو کیا اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ شہوت و غضب اور طرح طرح کی انسانی احتیاجات اور بشری غرائز و سرشت کے حامل



نہیں ہیں اور یوں انبیاء کا عملی تبلیغات کا پروگرام ختم ہو کر رہ جاتا۔ اسی لیے انبیاء کا انتخاب انسانوں میں سے انہی حاجات، ضروریات، غرائز اور طبائع کے ساتھ کیا گیا ہے تاکہ وہ سب کے لیے نمونہ عمل بن سکیں۔

یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ

پھر فرمایا: پیغمبر نے ان کے سامنے تین اہم پروگرام پیش کیے ہیں:

پہلا ان کے سامنے پروردگارِ عالم کی آیات پڑھنا، تلاوت کرنا اور ان کے کانوں اور افکار کو ان آیات سے آشنا کرنا۔

دوسرا تعلیم — یعنی ان حقائق کو ان کی روح تک پہنچانا۔

تیسرا تزکیہ نفس یعنی اخلاقی و انسانی ملکات کی تربیت اور نشوونما۔ چونکہ اصلی ہدف تربیت ہے لہٰذا آیت میں اس کا ذکر تعلیم سے پہلے آیا ہے حالانکہ فطری تربیت کے لحاظ سے تعلیم تربیت پر مقدم ہے۔

وہ لوگ جو انسانی حقائق سے بالکل دور ہیں وہ تربیت کا اثر آسانی سے قبول نہیں کرتے بلکہ ایک مدت تک ان کے کانوں کو ارشاداتِ الٰہی سے آشنا کرنا پڑے گا اور ان میں پہلے سے موجود وحشت و اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا پھر تعلیم کا مرحلہ شروع ہوگا اور اس کے بعد تربیت کی باری آئے گی جو کہ سارے پروگرام کا ماحصل ہے۔

ممکن ہے آیت میں تزکیہ سے مراد شرک، باطل عقائد اور بیہودہ خصائل اور بری حیوانی عادات کی آلودگی سے پاک کرنا ہو کیونکہ جب تک انسان کا باطن ان غلاظتوں سے پاک نہ ہو تو ممکن نہیں کہ وہ کتاب الٰہی اور حقیقی حکمت و دانائی کی تعلیم کے لیے آمادہ ہوسکے۔ جیسے ایک تختی پر موجود برے نقوش جب تک صاف نہ ہو جائیں اس پر خوبصورت اور دلکش نقوش بجا طور پر ثبت نہیں ہوسکتے اس لیے مندرجہ بالا آیت میں تزکیہ نفس کو تعلیم یعنی بلند اور اعلیٰ اسلامی معارف پر مقدم کیا گیا ہے۔

وان کانوا من قبل لفی ضلٰلٍ مبین

ایک عظیم نعمت کی اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب اس سے فائدہ حاصل کرنے کے زمانے کا اس سے قبل کے زمانے سے موازنہ کیا جائے اور ان دونوں کا فرق جان لیا جائے۔ زیر نظر جملے میں قرآن کہتا ہے: اسلام سے قبل کے زمانے پر ایک نگاہ کرو تمہاری کیا حالت تھی اور تمہارے ایام کیسے گزر رہے تھے اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہو۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرآن زمانۂ جاہلیت کی کیفیت کو "ضلٰل مبین" یعنی "واضح گمراہی" قرار دیتا ہے کیونکہ گمراہی و ضلالت کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض گمراہیاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان آسانی سے ان کے باطل ہونے کو نہیں سمجھ سکتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو فوراً سمجھ لیتا ہے۔

دنیا کے لوگ اور خصوصاً جزیرۃ العرب کے رہنے والے پیغمبر اسلام کی بعثت کے زمانے میں واضح ضلالت و گمراہی میں مبتلا تھے۔ ناجائز کاروبار، بدبختی، جہل و نادانی اور طرح طرح کی معنوی آلودگیوں نے اس زمانے میں تمام دنیا کو گھیر رکھا تھا اور یہ غیر مناسب کیفیت کسی پر بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔

۱۶۵۔ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ



قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ترجمہ

۱۶۵ (جنگ اُحد میں) تم پر مصیبت آئی جبکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنا (دشمن) پر بھی تم غالب آچکے ہو، تو تم کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی ہے؟ کہہ دو کہ یہ خود تمہاری طرف سے ہے (کہ تم نے جنگ اُحد کے میدان میں حکم پیغمبر کی مخالفت کی)، خدا ہر چیز پر قادر ہے (اور اب بھی اگر تم اپنی اصلاح کرو تو آئندہ وہ تمہیں کامیابی دے گا)۔

تفسیر

جنگ اُحد پر ایک اور نظر

اس آیت میں واقعہ اُحد پر ایک اور نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض مسلمان جنگ کے المناک نتائج پر غمگین اور پریشان تھے اور بار بار اپنی پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔ خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں ان سے تین نکات کا ذکر کرتا ہے:

۱ تم صرف ایک ہی جنگ کے نتائج سے پریشان نہ ہو جاؤ بلکہ جتنی مرتبہ دشمن سے مقابلہ ہوا ہے اس کا موازنہ کرو۔ اگر اس میدان میں تم پر مصیبت آئی ہے تو دوسرے میدان (بدر) میں اس سے دوگنا دشمن پر تم بھی غالب آچکے ہو کیونکہ انہوں نے اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید کیے ہیں جبکہ تم میں سے کوئی قید نہیں ہوا لیکن جنگ بدر میں تم نے ان کے ستر آدمی قتل کیے اور ستر ہی گرفتار کیے تھے۔

اولما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیھا ۔

حقیقت میں " قد اصبتم مثلیھا " یعنی تم نے دشمن کو دوگنا نقصان پہنچایا تھا۔ ایک جواب ہے جو سوال سے پہلے آیا ہے۔

۲ تم کہتے ہو کہ یہ مصیبت ہمیں کہاں سے دامن گیر ہوئی۔ " قلتم انی ھذا " لیکن اے پیغمبر! ان سے کہیے: اس مصیبت کا باعث خود تم ہو اور عوامل شکست کو اپنی ہی ذات میں تلاش کرو (ھل ھو من عند انفسکم)۔ تم ہی تو تھے جنہوں نے حکم پیغمبر کی مخالفت میں کوہ عینین کا حساس مورچہ چھوڑ دیا اور تم ہی نے جنگ ختم ہونے سے پہلے اور اس کے حتمی فیصلے سے قبل مال غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا اور تم ہی دشمن کے نئے حملے کے وقت میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہاری یہی کوتاہیاں اور گناہ اس شکست اور اتنے لوگوں کے قتل کا سبب بنیں۔

۳ اب آئندہ تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور اگر تم اپنی کمزوریوں کی تلافی کرو تو اس کی حمایت تمہارے شامل حال ہوگی (ان اللہ علی کل شیء قدیر)۔



۱۶۶۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ

۱۶۷۔ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ

ترجمہ

۱۶۶ اور اس روز (اُحد کے دن) جب دو گروہ (مومنین و کفار) آپس میں نبرد آزما ہوئے تو تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ حکم خدا (اور قانون مکافات) کے مطابق تھی اور اس بنا پر تھی کہ اہل ایمان پہچانے جائیں۔

۱۶۷ اور (یہ بھی وجہ تھی کہ) جن لوگوں نے منافقت کی ہے وہ پہچانے جائیں، وہ جنہیں کہہ دیا گیا تھا کہ آؤ اور راہ خدا میں جنگ کرو یا (کم از کم) اپنے حریم کا دفاع کرو۔ انہوں نے کہا اگر ہمیں یقین ہوتا کہ واقعاً جنگ ہوگی تو ہم تمہاری پیروی کرتے (لیکن ہمیں تو پتہ ہے کہ جنگ نہیں ہوگی)، وہ لوگ اُس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ نزدیک تھے، وہ اپنے منہ سے وہ کچھ کہتے تھے جو ان کے دل میں نہیں ہوتا تھا اور خدا اس چیز کو جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔

تفسیر

مختلف گروہوں کو الگ الگ پہچانا جانا چاہیے

مندرجہ بالا آیت یہ بات یاد دلاتی ہے کہ (اُحد کی طرح) جو مصیبت بھی پیش آتی ہے ایک تو یہ کہ وہ بلاسبب نہیں ہوتی اور دوسرا یہ کہ وہ آزمائش کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس آیت میں سچے مجاہدین اور منافقین یا کمزور ایمان لوگوں کی صفوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا ذکر ہے۔ اسی لیے آیت کے پہلے حصے میں فرمایا گیا ہے وما اصابکم یوم التقی الجمعٰن فباذن اللہ — اُحد کے دن جب مسلمانوں کا بت پرستوں سے آمنا سامنا ہوا اُس وقت جو کچھ تم پر گزرا وہ حکم خدا سے تھا اور اُسی کی مشیت اور ارادے سے ظہور پذیر ہوا۔

خلقت کے عمومی قانون کے مطابق ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے اور بنیادی طور پر یہ جہان علل و اسباب کی دنیا



ہے اور یہ ایک ثابت و دائمی اصول ہے اور اس کے مطابق بھی کہ جو فوج بھی میدان جنگ میں سستی کرے گی اور مال و دولت اور غنیمت کی لالچ میں پڑ جائے گی اور اپنے ہمدرد حاکم کا حکم فراموش کر دے گی تو وہ شکست کھا جائے گی۔ اس بناء پر اذن اللہ (حکم خدا) سے مراد اس کا وہی ارادہ و مشیت ہے جو قانونِ علیت کی شکل میں عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا ہے: ولیعلم المؤمنین و لیعلم الذین نافقوا۔ اس جنگ کا ایک مقصد یہ تھا کہ مومنین اور منافقین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور صاحبِ ایمان اور کمزور ایمان والوں میں امتیاز ہو سکے۔

واقعہ اُحد میں مسلمانوں میں سے تین گروہ نمایاں ہو گئے:

پہلا ۔۔ اس میں چند محدود افراد تھے جو آخری لمحوں تک ثابت قدم رہے اور دشمن کے جم غفیر کے سامنے آخری دم تک ڈٹے رہے۔ ان میں سے بعض نے جامِ شہادت نوش کیا اور بعض شدید زخمی ہوئے۔

دوسرا ۔۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں اضطراب اور تزلزل پیدا ہو گیا تھا اور وہ آخر تک استقامت نہ دکھا سکے اور بالآخر بھاگ کھڑے ہوئے۔

تیسرا ۔۔ یہ منافقین کا گروہ تھا۔ یہ لوگ راستے ہی سے واپس لوٹ گئے تھے، طرح طرح کے بہانے کر کے جنگ سے منہ موڑ گئے اور مدینہ کی طرف پلٹ گئے۔ ہم جلد ہی ان کے بہانوں کا تذکرہ کریں گے۔ یہ گروہ عبداللہ بن ابی سلول اور اس کے تین سو ساتھیوں پر مشتمل تھا۔

اگر اُحد میں سخت معرکہ پیش نہ آتا تو یہ صفیں کبھی الگ الگ نہ ہوتیں اور ہر گروہ کے لوگ اپنی مخصوص صفات کے باوجود کسی معین صف میں نہ سمجھے جاتے اور ممکن تھا کہ دعویٰ کرتے وقت ہر شخص اپنے آپ کو بہترین مومن قرار دیتا۔

درحقیقت آیت میں دو چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلی جنگ اُحد کی شکست کی علتِ فاعلی اور دوسری اس کی علتِ غائی اور اس کا آخری نتیجہ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے: لیعلم الذین نافقوا (تاکہ وہ لوگ پہچانے جائیں جنہوں نے نفاق کیا ہے)۔ یہ نہیں فرمایا: لیعلم المنافقین (تاکہ منافق پہچانے جائیں)۔ دوسرے لفظوں میں نفاق کا ذکر فعل کی صورت میں ہوا ہے صفت کے طور پر نہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ نفاق ابھی تک ان سب میں صفتِ ثابت کے طور پر نہیں تھا۔ اسی لیے تاریخ اسلام میں ہے کہ ان میں سے بعض کو توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اور وہ مومنین کی صفوں سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد قرآن اس گفتگو کا تذکرہ کرتا ہے جو جنگ سے قبل مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان ہوئی، فرمایا:

وقیل لھم تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا

ایک مسلمان (ابن عباس کے قول کے مطابق عبداللہ بن عمرو بن حزام) نے جب دیکھا کہ عبداللہ بن ابی سلول اپنے ساتھیوں کے ساتھ لشکرِ اسلام سے کنارہ کش ہو کر مدینہ کی طرف پلٹنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے تو اس سے کہا: آؤ خدا کے لیے اور



اس کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم جو خطرہ تمہارے وطن اور قوم قبیلے کو درپیش ہے اس کا ہی دفاع کرو۔

مگر ان لوگوں نے ایک بے ہودہ بہانہ کیا اور کہنے لگے: لو نعلم قتالاً لا تبعناکم ۔ ہمیں اگر معلوم ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم بے دریغ تمہاری پیروی کرتے، ہمارا خیال ہے کہ یہ بختی کسی جنگ اور خون ریزی کے بغیر ختم ہو جائے گی۔

ایک اور مفہوم کے مطابق منافقین کہنے لگے، اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو تمہارا ساتھ دیتے لیکن ہماری نگاہ میں تو یہ جنگ نہیں بلکہ ایک طرح کی خودکشی ہے کیونکہ لشکر اسلام اور کفار میں جو عدم توازن نظر آرہا ہے اس کے پیش نظر ان سے جنگ کرنا عقلمندی کا کام نہیں خصوصاً جبکہ لشکر اسلام کے پڑاؤ کی جگہ بھی نامناسب ہے۔

بہرحال یہ باتیں بہانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھیں۔ جنگ کا ہونا بھی یقینی تھا اور مسلمان ابتدا میں کامیاب اور فتح مند بھی ہو گئے تھے۔ اب اگر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے تو یہ ان کے اپنے اشتباہات اور خلاف ورزیوں کا نتیجہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا: وہ جھوٹ بولتے ہیں، ھم للکفر یومئذ اقرب منھم للایمان اس روز وہ ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے اس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفر و ایمان کے کئی درجے ہیں جو انسان کے عقیدے اور طرز عمل سے وابستہ ہیں۔

یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم وہ زبان سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے اور ان کی نیت اُن کی گفتگو سے بالکل میل نہیں کھاتی انہوں نے اپنی اس تجویز میں اصرار کرتے ہوئے کہ جنگ مدینہ کے اندر ہونی چاہیے یا دشمن کے حملوں کے خوف سے اور یا پھر اسلام سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کی — واللہ اعلم بما یکتمون لیکن خدا اُس سے مکمل طور پر آگاہ ہے جو کچھ منافق چھپائے ہوئے ہیں اور وہ اس جہان میں بھی اُن کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے مقاصد سے آگاہ کرتا ہے اور آخرت میں بھی اُن کا حساب چکائے گا۔

۱۶۸۔ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ط قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

ترجمہ

۱۶۸۔ (منافقین) وہ ہیں جنہوں نے اپنے بھائیوں سے اُن کی حمایت سے دستکش ہو کر کہا کہ اگر وہ ہماری پیروی کرتے تو قتل نہ ہوتے۔ کہہ دو (کیا تم لوگوں کی موت کی پیش بینی کر سکتے ہو تو) پھر موت کو اپنے آپ ہی سے دور کر لو، اگر تم سچے ہو۔

تفسیر

منافقین کی بے بنیاد باتیں

منافقین خود بھی جنگ اُحد سے کنارہ کش رہے اور دوسروں کے حوصلے کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور پھر مجاہدین واپس آئے



توانہیں سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر تم ہماری بات مانتے تو تمہارے آدمی قتل نہ ہوتے۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن اُن کی اس بے بنیاد بات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: الذین قالوا لاخوانھم وقعدوا۔ یعنی۔ جنہوں نے جنگ سے کنارہ کشی کی اور اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہماری اطاعت کی ہوتی تو تم قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہیے: اگر تم آئندہ کے حوادث کی پیش بینی کر سکتے ہو تو اپنے آپ ہی سے موت دور کر لو، اگر سچے ہو۔

یعنی حقیقت میں تمہارا دعویٰ ہے کہ تم عالم غیب ہو اور آنے والے حوادث سے باخبر، تو ایسا دعویٰ کرنے والے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی موت کے علل و عوامل کی پیش بینی کرتے ہوئے انہیں بے کار کر دے، کیا تم میں یہ قدرت و طاقت ہے۔

پھر اگر تم میدان جہاد اور راہِ افتخار میں قتل نہیں ہوتے تو کیا تمہیں عمر جاوداں مل جائے گی اور کیا تم موت کو ہمیشہ کے لیے اپنے سے دور کر سکتے ہو۔ جب تم موت کے مسلم قانون کو ختم نہیں کر سکتے تو پھر ذلت کے بستر پر کیوں مرتے ہو اور میدان جہاد میں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے عزت سے جام شہادت نوش کیوں نہیں کرتے۔

زیر نظر آیت میں ایک اور قابل غور نکتہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مومنین کو بھائی کہا گیا ہے جبکہ مومن ہرگز منافق کا بھائی نہیں ہے۔ دراصل یہ انہیں ایک قسم کی سرزنش ہے کہ تم تو مومنین کو اپنا بھائی سمجھتے تھے تو پھر ان حساس لمحوں میں ان کی حمایت سے دست کش کیوں ہو گئے ہو۔ اسی لیے اخوانھم کے فوراً بعد بلا فاصلہ لفظ قعدوا (جنگ سے بیٹھ گئے) آیا ہے، تو کیا انسان برادری کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور پھر ایک دم اپنے بھائی کی حمایت چھوڑ کر بھی بیٹھ جاتا ہے۔

۱۶۹۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝

۱۷۰۔ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

۱۷۱۔ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ: ۱۶۹۔ راہ خدا میں قتل ہونیوالوں کے بارے میں ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں سے روزی پاتے ہیں۔

۱۷۰۔ وہ خدا کی عطا کردہ فراواں نعمتوں پر خوش ہیں اور وہ (مجاہد) کہ جو اُن سے پیچھے رہ گئے ہیں اور اُن سے ابھی آکر نہیں ملے اُن کے بارے میں بھی خوش ہیں (کیونکہ وہ اُس جہاں میں انکے عظیم مراتب کو دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں) کہ نہ اُن کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ ملال۔



۱۷۱ اور وہ خدا کی نعمت اور اُس کے فضل سے (خوشحال و مسرور ہوتے ہیں) اور (وہ دیکھتے ہیں کہ) خدا (شہید ہونے والوں اور نہ شہید ہونے والے مجاہد) مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تفسیر

زندۂ جاوید

بعض مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیات شہدائے اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بعض دوسرے سمجھتے ہیں کہ یہ شہدائے بدر سے متعلق ہیں لیکن حق یہ ہے کہ گذشتہ آیات سے ان کا ربط ظاہر کرتا ہے کہ یہ جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا عمومی مفہوم بھی ہے جو تمام شہدا جن میں بدر کے چودہ شہدا بھی شامل ہیں پر محیط ہے۔ اسی لیے امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: یہ آیات شہدا، بدر و اُحد، ہر دو کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔[1] ابن مسعود پیغمبر اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں:

> خدا نے شہدا، اُحد کی ارواح کو خطاب کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تمہاری کیا آرزو ہے تو انہوں نے کہا: پروردگار ہم اس سے زیادہ کیا آرزو کر سکتے ہیں کہ ہم ہمیشگی نعمتوں میں مستغرق ہیں اور تیرے عرش کے سائے میں رہتے ہیں، ہمارا تقاضا صرف یہ ہے کہ ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور پھر سے تیری راہ میں شہید ہوں۔ اس پر خدا نے فرمایا: میرا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی شخص دوبارہ دنیا کی طرف نہیں پلٹے گا۔[2] انہوں نے عرض کیا: جب ایسا ہی ہے تو ہماری تمنا ہے کہ ہمارا سلام پیغمبر اسلام کو پہنچا دے، ہمارے حالات ہمارے پسماندگان کو بتادے اور انہیں ہماری حالت کی بشارت دے تاکہ انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔
>
> اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

بہر حال یوں لگتا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد کچھ کمزور ایمان لوگ بیٹھ جاتے اور اپنے ان دوستوں اور عزیزوں کا افسوس کرتے جو اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے اور کہتے کہ وہ کیوں مارے گئے اور ختم ہو گئے۔ خصوصاً جب انہیں کوئی نعمت ملتی اور ان کی عدم موجودگی کے خیال سے انہیں بہت دُکھ ہوتا۔ وہ اپنے آپ سے کہتے کہ ہم تو ایسے ناز و نعمت سے بہرہ ور ہیں لیکن ہمارے بھائی بیٹے قبروں میں سوئے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ بالکل خالی ہیں۔

ایسے افکار اور ایسی باتیں نہ فقط یہ کہ درست اور واقع کے مطابق نہ تھیں بلکہ باقی رہ جانے والوں کے جذبوں کو بھی کمزور کرنے کا باعث تھیں۔ زیر نظر آیات نے ایسے افکار پر خط بطلان کھینچ دیا اور شہیدوں کے بلند مقام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: لاتحسبن

---

[1] نور الثقلین جلد ۱، صفحہ ۴۰۹ بحوالہ عیاشی۔

[2] عموماً ایسا ہی ہوتا ہے البتہ بعض مواقع استثنائی حیثیت رکھتے ہیں جیسے امام زمانہ کے دور حکومت میں رجعت (مترجم)



الذین قتلوا فی سبیل اللہ اموا تا — یہاں روئے سخن نقطہ پیغمبرؐ کی طرف ہے تاکہ دوسرے خود اندازہ کریں۔
آیت کے اس حصے کا مفہوم ہے کہ اے پیغمبرؐ! یہ گمان ہرگز نہ کیجئے کہ جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں وہ مردہ ہیں — بل احیاء عند ربھم یرزقون بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے نعمتیں حاصل کرتے ہیں۔
یہاں زندگی سے مراد برزخ کی زندگی ہے جو موت کے بعد کے زمانے میں ارواح کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ مادی وجسمانی زندگی نہیں۔ البتہ یہ زندگی شہداء سے مخصوص نہیں اور دیگر بہت سے لوگ بھی اس زندگی کے حامل ہیں۔[1] لیکن شہیدوں کی زندگی چونکہ بہت انواع واقسام کی نعمتوں سے مالامال ہے۔ علاوہ ازیں آیت میں موضوع سخن شہداء ہی ہیں اس لیے صرف انہی کا نام لیا گیا ہے اور وہ اس قدر حیات معنوی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں گویا برزخ میں رہنے والے باقی لوگوں کی زندگی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔
اس کے بعد شہداء کی حیات برزخ کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:
فرحین بما اتٰھم اللہ من فضلہ — وہ فراواں نعمتیں جو خدا نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دی ہیں ان سے وہ خوشحال ہیں۔
ان کی دوسری مسرت اپنے ان مجاہد بھائیوں کے بارے میں ہے جنہوں نے میدان جنگ میں جام شہادت نوش نہیں کیا اور ان سے مل نہیں پائے۔ وہ ان کے مقامات اور اجر وثواب کو اس جہان میں اچھی طرح دیکھتے ہیں اس بناء پر وہ مسرور وشاداں ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم۔[2] اس کے بعد فرماتا ہے: الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون یعنی شہداء محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مجاہد بھائی ان چیزوں کے بارے میں کوئی غم نہیں کرتے جو وہ بعداز موت دنیا میں چھوڑ آئے ہیں اور نہ ہی انہیں قیامت اور اس کے وحشتناک حوادث کا خوف ہے۔
اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ شہداء اپنے ان مجاہد بھائیوں کے مقامات بلند دیکھ کر خوش ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ نہیں مل سکے اور اس کے علاوہ انہیں خود بھی آئندہ کا کوئی خوف اور گذشتہ کا غم نہیں ہے۔[3]

یستبشرون بنعمۃ من اللہ وفضل
یہ آیت درحقیقت ان بشارتوں کی زیادہ تاکید اور توضیح ہے جو شہادت کے بعد شہداء کو حاصل ہوئی ہیں۔ وہ دو وجوہ کی بناء پر خوش اور مسرور ہیں:
پہلی یہ کہ وہ خدا کی نعمتیں پا لیتے ہیں نعمتیں ہی نہیں بلکہ اس کا فضل جس کا معنی ہے ان نعمتوں کی زیادتی اور تکرار۔
دوسری یہ کہ وہ دیکھتے ہیں کہ خدا مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا نہ شہیدوں اور سچے مجاہدین جو جام شہادت نوش نہیں کر سکے، کا اجر ضائع کرتا ہے۔ وان اللہ لا یضیع اجر المؤمنین — درحقیقت جو کچھ انہوں نے پہلے سنا ہوا تھا اب وہ اسے واضح طور پر دیکھیں گے۔

---

[1] بعض محققین دو طرح کے لوگوں کے لیے حیات برزخ کے قائل ہیں ایک بہت زیادہ نیک اور دوسرے بہت زیادہ بُرے۔
[2] استبشار کا معنی ہے بشارت پانا یا خود نعمت حاصل کرنے پر خوش ہونا یا دوستوں کے نعمت پانے پر مسرور ہونا اور اس کا معنی بشارت دینا نہیں ہے۔
[3] دوسرے الفاظ میں پہلی تفسیر کی رو سے "لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" کی ضمیریں دنیا میں رہ جانے والوں کی طرف لوٹتی ہیں جبکہ دوسری تفسیر کی رو سے خود شہداء کی طرف لوٹتی ہیں۔



روح کی بقاء کا شاہد

جو آیات صراحت سے بقاءِ روح پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے زیرِ نظر آیات بھی ہیں جو موت کے بعد حیاتِ شہداء کے بارے میں ہیں۔ بعض نے یہ جو احتمال دیا ہے کہ حیات سے مراد اُن کی مجازی زندگی ہے اور مقصد ان کی زحمات کے آثار اور نام و نشان کی بقا ہے یہ مفہوم آیات کے معنی سے بہت بعید ہے۔ یہ مفہوم مندرجہ بالا آیات کے کسی جملے سے پیدا نہیں ہوتا چاہے شہداء کے روزی حاصل کرنے کا معاملہ ہو یا مختلف حوالوں سے ان کے سرور و انبساط کا تذکرہ۔ علاوہ ازیں زیرِ نظر آیات وجودِ برزخ اور نعماتِ برزخ پر واضح دلیل ہیں۔ اس کی تشریح سورہ مومنون کی آیہ ۱۰۰ کے ذیل میں تفصیل سے پیش کی جائے گی۔ مذکورہ آیت یوں ہے:

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

شہیدوں کا اجر

مقامِ شہداء کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہر قوم و ملت اپنے شہداء کے لیے ایک مخصوص مرتبے کی قائل ہے لیکن اسلام نے راہِ خدا کے شہداء کو جو احترام دیا ہے وہ بے نظیر ہے۔ ذیل میں ایک مثال پیش کی جا رہی ہے جو اسلام کی نظر میں احترامِ شہداء کا ایک واضح نمونہ ہے۔ اسلام کی اپنی تعلیمات کی وجہ سے ایک مختصر سی پسماندہ جماعت میں ایسی قوت و طاقت آگئی جس نے دنیا کے عظیم ترین شاہی نظاموں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ مذکورہ روایت یہ ہے:

امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

> ایک مرتبہ آنحضرتؑ خطبہ دے رہے تھے اور لوگوں کو جہاد کا شوق دلا رہے تھے۔ اس دوران میں ایک نوجوان کھڑا ہو گیا۔ اُس نے عرض کیا: اے امیر المومنینؑ! مجھ سے راہِ خدا میں جنگ کرنے والوں کی فضیلت بیان فرمایئے۔ امام نے جواب میں فرمایا: ایک دفعہ میں پیغمبرِ خدا کی سواری پر آپ کے پیچھے سوار تھا۔ ہم جنگ ذات السلاسل سے واپس آ رہے تھے۔ یہی سوال جو تو نے مجھ سے کیا ہے میں نے رسول اللہ سے کیا، تو آپ نے فرمایا: جب مجاہد میدانِ جہاد میں شرکت کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں تو خداوندِ عالم جہنم سے آزادی ان کے لیے مقدر کر دیتا ہے اور جب وہ ہتھیار اُٹھا کر میدانِ جنگ کا رُخ کرتے ہیں تو ملائکہ ان پر فخر کرتے ہیں اور جب ان کی بیوی بچے، عزیز و اقارب اُنہیں الوداع کہتے ہیں تو وہ اپنے گناہوں سے آزاد ہو جاتے ہیں ..... پھر وہ جو بھی کام کرتے ہیں اس کا اجر دوگنا ہو جاتا ہے اور ہر دن کے بدلے ان کے لیے ہزار عابد کی عبادت کا اجر لکھا جاتا ہے اور جب وہ دشمن کے آمنے سامنے ہوتے ہیں تو پورے عالم کے لوگ ان کے میزانِ ثواب کا اندازہ نہیں کر سکتے اور جب وہ میدانِ جنگ میں قدم رکھتے ہیں، نیزہ و تیر کا تبادلہ ہونے لگتا ہے اور پھر دست بدست لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو فرشتے اپنے پر و بال سے انہیں گھیر لیتے ہیں اور خدا سے میدان میں ان کی ثابت قدمی کی دعا کرتے ہیں۔ اس وقت ایک منادی آواز دیتا ہے: الجنة تحت ظلال السيوف (یعنی۔ جنت تلواروں کے سائے میں ہے)۔ اس وقت شہید کے جسم پر دشمن کے وار زیادہ آسان اور گرمیوں میں ٹھنڈا



پانی پینے سے زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں اور جب شہید اپنی سواری سے لوٹتا ہوا گرتا ہے تو زمین تک پہنچنے سے پہلے حوران بہشت اس کے استقبال کو آتی ہیں اور اسے ان تمام عظیم روحانی و مادی نعمتوں کی خبر دیتی ہیں جو خدا تعالیٰ نے اس کے لیے فراہم کر رکھی ہیں اور جب شہید زمین پر گر ملکتا ہے تو زمین کہتی ہے: آفرین ہے پاکیزہ روح کے لیے جو پاکیزہ بدن سے پرواز کر رہی ہے، تیرے لیے خوشخبری ہے، ان لك مالا عين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر (یعنی۔ تیرے انتظار میں ایسی نعمتیں ہیں جنہیں کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہے نہ کسی کان نے ان کے بارے میں سنا ہے اور نہ کسی دل میں ان کا خیال آیا ہے)۔ نیز خدا فرماتا ہے: میں اس کے پس ماندگان کا سرپرست ہوں، جو کوئی انہیں خوش کرے گا اس نے مجھے خوش کیا اور جو انہیں ناراض کرے گا اس نے مجھے ناراض اور غضب ناک کیا ہے[1]

۱۷۲۔ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

۱۷۳۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝

۱۷۴۔ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝

ترجمہ

۱۷۲ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی خدا اور رسول کی دعوت کو قبول کیا (اور ابھی اُن کے جنگ اُحد کے زخم تازہ تھے کہ وہ حمراء الاسد کے میدان کی طرف چل پڑے) ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

۱۷۳ وہ ایسے اشخاص تھے جن سے (بعض) لوگوں نے کہا کہ (لشکر دشمن کے) افراد نے تم پر (حملہ کرنے کے لیے) اکٹھ کر لیا ہے ان سے ڈرو لیکن ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور وہ کہنے لگے کہ خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی ہے۔

---

[1] یہ اس روایت کا خلاصہ ہے جو عظیم اسلامی مفسر مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں درج کی ہے۔



۱۷۴ اسی وجہ سے وہ (اس میدان سے) پروردگار کی نعمت وفضل کے ساتھ اس عالم میں لوٹے کہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی اور خدا صاحبِ فضل و بخشش ہے۔

تفسیر

غزوہ حمراء الاسد

ہم کہہ چکے ہیں کہ جنگ اُحد کے اختتام پر ابوسفیان کا فاتح لشکر بڑی تیزی سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ روحاء کے مقام پر پہنچے تو اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوئے اور انہوں نے مدینہ کی طرف لوٹنے اور باقی ماندہ مسلمانوں کو نابود کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ اطلاع پیغمبر اکرمؐ کو پہنچی تو آپ نے فوراً حکم دیا کہ جنگ اُحد میں شریک ہونے والا لشکر دوسری جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ نے یہ حکم خصوصیت سے دیا کہ جنگ اُحد کے زخمی بھی لشکر کی صفوں میں جا شامل ہوں۔ ایک صحابی کہتے ہیں:

> میں بھی زخمیوں میں سے تھا لیکن میرے بھائی کے زخم مجھ سے زیادہ شدید تھے۔ ہم نے ارادہ کر لیا کہ جو بھی حالت ہو ہم پیغمبر اسلام کی خدمت میں پہنچیں گے۔ میری حالت چونکہ میرے بھائی سے کچھ بہتر تھی، جہاں میرا بھائی نہ چل پاتا میں اُسے کندھے پر اٹھا لیتا۔ بڑی تکلیف سے ہم لشکر تک جا پہنچے پیغمبر اکرمؐ اور لشکرِ اسلام "حمراء الاسد" کے مقام پر پہنچ گئے اور وہاں پڑاؤ ڈالا۔ یہ جگہ مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔

یہ خبر جب لشکر قریش تک پہنچی خصوصاً جب انہوں نے مقابلے کے لیے ایسی آمادگی دیکھی کہ زخمی بھی میدان جنگ میں پہنچ گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گئے اور شاید انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوئی کہ مدینہ سے تازہ دم فوج ان سے آملی ہے۔

اس موقع پر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے دلوں کو اور کمزور کر دیا اور ان میں مقابلے کی ہمت نہ رہی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مشرک جس کا نام معبد خزاعی تھا مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اصحاب کی کیفیت دیکھی تو انتہائی متاثر ہوا۔ اس کے انسانی جذبات میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا: آپ کی یہ حالت و کیفیت ہمارے لیے بہت ہی ناگوار ہے، آپ آرام کرتے تو ہمارے لیے بہتر ہوتا۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل پڑا اور روحاء کے مقام پر ابوسفیان کے لشکر سے ملا۔ ابوسفیان نے اس سے پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا: میں نے محمد (ص) کو دیکھا ہے کہ وہ ایسا عظیم لشکر لیے ہوئے تمہارا تعاقب کر رہے ہیں جس جیسا لشکر اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے اضطراب اور پریشانی کے عالم میں کہا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہم نے انہیں قتل کیا، زخمی کیا اور منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔

معبد خزاعی نے کہا: میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا کیا ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ایک عظیم اور کثیر لشکر اس وقت تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ جائیں اور مکہ کی طرف پلٹ جائیں اور اس مقصد کے لیے



کہ مسلمان ان کا تعاقب نہ کریں اور انہیں پیچھے ہٹ جانے کا کافی موقع مل جائے، انہوں نے قبیلہ عبدالقیس کی ایک جماعت سے خواہش کی کہ وہ پیغمبر اسلام اور مسلمانوں تک یہ خبر پہنچا دیں کہ ابوسفیان اور قریش کے بُت پرست باقی ماندہ اصحاب پیغمبر کو ختم کرنے کے لیے ایک عظیم لشکر کے ساتھ تیزی سے مدینہ کی طرف آرہے ہیں۔ یہ جماعت گندم خریدنے کے لیے مدینہ جا رہی تھی جب یہ اطلاع پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں تک پہنچی تو انہوں نے کہا: حسبنا اللہ و نعم الوکیل (خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمارا بہترین حامی اور مدافع ہے)۔

انہوں نے بہت انتظار کیا لیکن دشمن کے لشکر کی کوئی خبر نہ ہوئی۔ لہٰذا تین روز توقف کے بعد وہ مدینہ کی طرف لوٹ گئے۔ مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں[1]

الذین استجابوا للہ و الرسول من بعد ما اصابھم القرح ۛ للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم۔

جنہوں نے خدا اور پیغمبر کی دعوت قبول کی اور جنگ اُحد میں اٹھائے گئے زخموں کے باوجود دشمن سے دوسری جنگ کے لیے آمادہ ہوگئے ان میں سے نیک عمل کرنے والوں اور تقویٰ اختیار کرنے والوں یعنی پاکیزہ نیت اور خلوص کامل سے میدان میں شرکت کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے۔

زیر نظر آیت میں ایک گروہ کے لیے اجر عظیم مخصوص کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی کچھ ایسے افراد تھے جو صحیح طور پر مخلص نہ تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منھم (ان میں سے بعض) اس طرف اشارہ ہو کہ اُحد کے جنگجو لوگوں میں سے بعض کسی بہانے سے اس میدان سے کنارہ کش ہوگئے۔

اس کے بعد قرآن نے ان کی پامردی و استقامت کی ایک درخشاں نشانی کا یوں تذکرہ کیا ہے: الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا ۖ و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل ــــــــــ یعنی۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں کچھ لوگوں نے (قبیلہ عبدالقیس کے لوگ یا ایک روایت کے مطابق نعیم بن مسعود جو خبر لائے تھے) کہا کہ دشمن کی فوج جمع ہوگئی ہے اور وہ حملہ کرنے کو تیار ہے، ان سے ڈرو لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ڈرے نہیں بلکہ اس کے برعکس ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین حامی ہے۔

اس استقامت، ایمان اور زبردست پامردی کے تذکرے کے بعد قرآن ان کے عمل کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

فانقلبوا بنعمۃ من اللہ و فضل ــــ یعنی وہ اس میدان سے اللہ کے فضل و نعمت کے ساتھ لوٹے۔ نعمت و فضل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ دشمن سے کسی خطرناک ٹکراؤ کے بغیر ہی دشمن ان سے بھاگ گیا اور یہ صحیح سالم بغیر کوئی زحمت اٹھائے مدینہ پلٹ آئے۔

فضل و نعمت میں ممکن ہے یہ فرق ہو کہ نعمت استحقاق کے طور پر اُجرت کے مفہوم میں ہو اور فضل استحقاق سے بڑھ کر اور اس پر اضافہ ہو۔

---

[1] نورالثقلین، مجمع البیان، المنار اور دیگر کتب۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر ہے: لم یمسسھم سوء — یعنی انہیں اس واقعہ میں تھوڑی سی تکلیف بھی نہیں پہنچی، جبکہ واتبعوا رضوان اللہ خوشنودیٔ خدا اُن کے ہاتھ آئی انہوں نے فرمانِ خدا کی اتباع کی واللہ ذو فضل عظیم اور خدا کے پاس عظیم فضل و انعام ہے جو حقیقی مومنین اور سچے مجاہدین کے انتظار میں ہے۔

تربیت الٰہی کی فوری تاثیر

جنگ احد اور واقعہ حمراء الاسد جس کی تفصیل گزر چکی ہے، ان دونوں مواقع پر مسلمانوں کے جذبے کا موازنہ کیا جائے تو انسان کو تعجب ہوتا ہے کہ ایک شکست خوردہ جماعت جس کے جذبے بلند نہ تھے، تعداد کافی نہ تھی اور جس میں بہت سے زخمی بھی موجود تھے اتنی تھوڑی سی مدت میں جو شاید چوبیس گھنٹے بھی نہ بنتی تھی اس کی حالت اتنی بدلی کہ وہ عزم راسخ اور بڑے ولولے اور جذبے کے ساتھ دشمن کے تعاقب پر آمادہ ہو گئی یہاں تک کہ قرآن ان لوگوں کے متعلق کہتا ہے جب انہیں اطلاع ملی کہ دشمن نے ان پر حملے کے لیے اکٹھ کر لیا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ ڈرے نہیں بلکہ ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور ان کی استقامت میں اضافہ ہو گیا۔ دراصل یہ ہدف و مقصد پر ایمان رکھنے کی خاصیت ہے کہ انسان پر مشکلات و مصائب جس قدر بڑھیں اور وہ انہیں زیادہ قریب سے دیکھے اس کی پامردی و استقامت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ایسے میں اس کی تمام روحانی و مادی قوتیں خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مجتمع ہو جاتی ہیں۔ ایک چھوٹی سی جماعت میں یہ عجیب و غریب تغیرِ انسانی تربیت کرنے والی آیاتِ قرآن اور پیغمبر اسلام کے موثر و دل آویز ارشادات کی فوری اور گہری تاثیر کا غماز ہے اور یہ بات بذات خود ایک معجزے سے کم نہیں۔

۱۷۵۔ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۷۵ یہ صرف شیطان ہی ہے جو اپنے پیروکاروں کو (بے بنیاد باتوں اور افواہوں کے ذریعے) ڈراتا ہے۔ ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

یہ آیت غزوہ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ضمیمہ ہے۔ لفظ "ذٰلکم" ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کو فوجِ قریش کی طاقت سے ڈراتے تھے تاکہ ان کے دلوں کو کمزور کریں۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہے کہ نعیم بن مسعود یا کاروانِ عبدالقیس کا عمل فقط ایک شیطانی عمل ہے جو شیطان کے دوستوں کو ڈرانے کے لیے ہے یعنی ایسے وسوسے صرف شیطان کے دوستوں پر ہی اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اہلِ ایمان اور ثابت قدم لوگ ایسے وسوسوں سے کبھی اثر نہیں لیتے۔ اس بناء پر جب تم شیطان



کے پیرو نہیں ہو تو تمہیں ان وسوسوں سے متزلزل نہیں ہونا چاہیے۔

نعیم بن مسعود یا کاروان عبدالقیس کو اس لیے شیطان قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کا عمل واقعاً شیطانی تھا اور یہ اس کے الہام اور وسوسہ سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ قرآن و احادیث میں ہر بُرے اور غلط کام کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے چونکہ ایسے ہر کام کا انجام شیطانی وسوسوں کا سا ہے۔

یا شیطان سے مراد خود وہی اشخاص ہیں اور یہ ان مواقع میں سے ایک ہے جہاں لفظ شیطان اپنے انسانی مصداق کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ شیطان کا ایک وسیع معنی ہے اور اس کے مفہوم میں تمام گمراہ کرنے والے شامل ہیں، وہ انسان ہوں یا غیر انسان۔ جیسا کہ سورہ انعام آیہ ۱۱۲ میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ

یعنی — اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانی اور جناتی شیطانوں میں سے دشمن قرار دیے ہیں۔

وخافون ان کنتم مومنین — آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایمان رکھتے ہو تو مجھ سے اور میرے حکم کی نافرمانی سے ڈرو یعنی ایمان اور غیر خدا کا خوف ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:

فَمَنْ يُؤْمِنْ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا

یعنی۔ جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آتا ہے وہ کسی نقصان اور طغیان سے نہیں ڈرتا۔ (جن۔ ۱۳)

اس بنا پر اگر کسی دل میں غیر خدا کا خوف پیدا ہو تو یہ ایمان کے کامل نہ ہونے کی دلیل ہے اور شیطانی وسوسوں کے نفوذ کی نشانی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس بے کنار عالم ہستی میں پناہ گاہ صرف خدا ہے اور صرف وہی موثر بالذات ہے اور اس کی قدرت کے مقابلے میں کسی کی کوئی قدرت نہیں۔

اصولی طور پر مومنین اپنے ولی یعنی خدا کا مشرکین و منافقین کے ولی یعنی شیطان سے موازنہ کریں تو یہ بات ان پر قطعاً واضح ہو جائے گی کہ خدا کے مقابلے میں اُس کی کچھ قدرت و طاقت نہیں ہے۔ اس لیے اہل ایمان کو معمولی سی پریشانی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ایمان نفوذ کر جاتا ہے لازمی طور پر وہاں جرأت و شجاعت بھی نفوذ کرتی ہے۔

۱۷۶۔ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۗ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

۱۷۷۔ إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○



ترجمہ

۱۷۶ جو لوگ راہِ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں وہ تمہیں غمگین نہ کردیں کیونکہ وہ ہرگز خدا کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ (علاوہ ازیں) خدا چاہتا ہے (کہ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے اور اس کے نتیجے میں) آخرت میں ان کا کوئی حصہ قرار نہ دے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

۱۷۷ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا ہے وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

پیغمبر کے لیے تسلی

ولا یحزنك الذین یسارعون فی الکفر

اس آیت میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے۔ احد کے دردناک واقعہ کے بعد خدا تعالیٰ نے انہیں تسلی دی کہ اے پیغمبر! یہ جو تم دیکھتے ہو کہ راہِ کفر میں ایک گروہ دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے درپے ہے تو اس سے غمگین و محزون نہ ہونا، وہ خدا کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے (انھم لن یضروا اللہ شیئًا) بلکہ وہ خود اس راہ میں نقصان اٹھائیں گے۔ اصولی طور پر نفع و ضرر اور سود و زیاں ایسے موجودات کے لیے ہے جن کا وجود خود ان سے نہیں ہے لیکن خداوند ازلی و ابدی جو ہر لحاظ سے بے نیاز ہے اور اس کا وجود غیر محدود ہے، لوگوں کا کفر و ایمان اور سعی و کاوش اس کے لیے کیا اثر رکھتی ہے جبکہ لوگوں کا ایمان ان کے اپنے تکامل و ارتقا کا باعث ہے اور کفر کی وجہ سے وہ خود تنزل و سقوط کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

یرید اللہ الا یجعل لھم حظا فی الاخرۃ ولھم عذاب عظیم

خدا چاہتا ہے کہ اس راہ میں انہیں آزاد رکھے اور وہ اتنی تیزی سے راہ کفر طے کریں کہ آخرت میں تھوڑا سا حصہ بھی نہ پائیں بلکہ عذاب عظیم ان کے انتظار میں ہو۔

درحقیقت آیت کہتی ہے کہ اگر وہ لوگ راہ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں تو اس کی یہ وجہ نہیں کہ خدا ان کی گرفت نہیں کر سکتا بلکہ خدا نے تو انہیں آزادیٔ عمل دے رکھی ہے وہ جو کچھ کر سکتے ہیں کریں اور اس کا نتیجہ نعماتِ اُخروی سے ان کی محرومی ہے۔ اس بناء پر نہ صرف یہ کہ آیت جبر پر دلالت نہیں کرتی بلکہ آزادیٔ ارادہ کی ایک دلیل ہے۔

بعد والی آیت میں بات کو وسعت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان الذین اشتروا الکفر بالایمان لن یضروا اللہ شیئا یعنی راہ کفر پر تیزی سے جانے والے ہی ایسے نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو ایمان ہاتھ سے دے کر راہِ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں اور ایمان کے بدلے کفر خرید چکے ہیں وہ ہرگز خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے بلکہ اس کا نقصان خود انہی کو پہنچے گا۔ آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ



فرماتا ہے: ولھم عذاب الیم — ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہاں "عذاب الیم" ہے جبکہ گذشتہ آیت میں "عذاب عظیم" آیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق اس بناء پر ہے کہ پہلی آیت میں جن کا ذکر ہے وہ کفر کے راستے میں زیادہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

۱۷۸۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ○

ترجمہ

۱۷۸ جو کافر ہو گئے ہیں (اور انہوں نے راہِ سرکشی اختیار کی ہے) وہ یہ خیال نہ کریں کہ اگر ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تو یہ ان کے نفع میں ہے، ہم تو یہ مہلت انہیں اس لیے دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کر لیں اور ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

تفسیر

جن پر بھاری بوجھ ہے

ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی[1] لھم

گذشتہ آیت میں دشمنانِ حق کی بہت زیادہ سعی و کاوش کے ضمن میں رسول اکرمؐ کو تسلی دی گئی ہے اور ان کی دل جوئی کی گئی ہے اب اس آیت میں روئے سخن دشمنوں کی طرف ہے۔ اس میں انہیں درپیش بدبختی کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ آیت درحقیقت واقعہ اُحد اور اس کے بعد کے واقعات سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ ایک جگہ روئے سخن نبی کریمؐ کی طرف تھا، دوسرے مقام پر مومنین کی طرف اور اب اس جگہ مشرکین مخاطب ہیں۔

مندرجہ بالا آیت مشرکین کو تنبیہ کرتی ہے اور انہیں ڈراتی ہے کہ وہ خدا کے عطا کردہ وسائل کبھی کبھار مل جانے والی کامیابیوں اور آزادیٔ عمل کو اس بات کی دلیل قرار نہ دیں کہ وہ صالح افراد ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں صحیح یا یہ ان کے لیے خوشنودیٔ خدا کی نشانی ہے۔
اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ گناہوں سے کم آلودہ گناہگاروں کو جرس بیداری کے ذریعے متوجہ کرتا ہے، کبھی ان اعمال کے عکس العمل کے ذریعے بیدار کرتا ہے اور یا کبھی ان سے سرزد ہونے والے اعمال کی مناسب سزاؤں کے ذریعے بیدار کرتا ہے اور اس طرح انہیں راہ حق کی طرف واپس لاتا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ابھی ہدایت کی

---

[1] "نملی" کا معنی ہے "مدد کرنا"، لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ مہلت دینے کے معنی میں بھی آتا ہے، جبکہ مہلت خود ایک قسم کی مدد ہے۔ یہاں یہ لفظ مہلت کے معنی میں ہی ہے۔



اہلیت رکھتے ہیں اور لطفِ الٰہی کے حامل ہیں۔ حقیقت دین، مجازاتِ عمل اور تکالیف و زحمات ایسے لوگوں کے لیے نعمت شمار ہوتی ہیں۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون

خشکی پر اور دریاؤں میں تباہی وطغیانی لوگوں کے اعمال کا نتیجہ ہے تاکہ خدا اُن کے بعض اعمال کا مزہ انہیں چکھائے شاید اس طرح یہ لوگ پلٹ آئیں۔ (روم۔ ۴۱)

لیکن وہ لوگ جو گناہ و عصیان میں غرق ہو جائیں اور طغیان، سرکشی اور نافرمانی کے آخری مرحلے تک جا پہنچیں، خدا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہا جاتا ہے کہ انہیں موقع دیتا ہے کہ ان کی کمر بارِ گناہ سے بوجھل ہو جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو جائیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پیچھے کے تمام پُل تباہ کر دیے ہیں، واپس لوٹنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں رہا، حیا و شرم کا پردہ چاک کر چکے ہیں اور ہدایتِ خداوندی کی اہلیت بالکل کھو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت اس مفہوم کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے: جو کافر ہو گئے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے انہیں جو مہلت دی ہے وہ ان کے فائدے میں ہے بلکہ انہیں مہلت تو اس لیے دی جاتی ہے تاکہ وہ گناہ و سرکشی میں اضافہ کریں اور ان کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب ہے۔

دنیائے اسلام کی شیر دل خاتون حضرت زینب کبریٰ علیہا السلام نے شام کی جابر و خود سر حکومت کے دربار میں سرکش یزید کے سامنے اپنے خطبے میں اسی آیت سے استدلال پیش فرمایا کیونکہ یزید ناقابلِ برگشت گنہگار کا واضح مصداق تھا۔ خطبے میں آپ نے فرمایا:

تو آج خوش ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ چونکہ تو نے وسیع و عریض دنیا ہم پر تنگ کر رکھی ہے اور آسمان کے کنارے کو ہم پر بند کر دیا ہے اور قیدیوں کی طرح ہمیں دیار بدیار پھرا رہا ہے اس لیے یہ تیری قدرت و طاقت کی نشانی ہے اور یا خدا کے ہاں تیری قدر و منزلت ہے اور ہمارے لیے اُس کے ہاں کوئی راہ نہیں۔ یہ سب تیرا اشتباہ ہے۔ یہ موقع اور آزادی خدا نے تجھے اس لیے دی ہے تاکہ تیری پشت بارِ گناہ سے بھاری ہو جائے اور دردناک عذاب تیرے انتظار میں ہے۔ خدا کی قسم اگر حوادث زمانہ مجھے ایک قیدی عورت کی شکل میں تیرے پایۂ تخت میں لے آئے ہیں تو اس سے یہ خیال مت کر کہ میری نظر میں تمہاری کوئی تھوڑی سی بھی حیثیت یا قدر و قیمت ہے۔ میں تجھے چھوٹا، پست، ہر لحاظ سے حقیر اور ملامت، سرزنش اور پھٹکار کا مستحق سمجھتی ہوں۔ جو کچھ تجھ سے ہو سکتا ہے کر لے۔ خدا کی قسم تو ہمارے نور کو خاموش نہیں کر سکتا۔ تو وحی جاوداں اور ہمارے آئینِ حق کو محو نہیں کر سکتا۔ تو نابود ہو جائے گا اور یہ تابناک ستارہ یونہی چمکتا رہے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ سوال بہت سے ذہنوں میں موجود ہے کہ بہت سے ستمگر، گنہگار اور آلودہ دامن لوگ اس طرح نعمات میں کیوں مستغرق ہیں اور



انہیں سزا کیوں نہیں ملتی۔ زیر نظر آیت سے ضمنی طور پر اس کا جواب بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگ ہیں جو قابل اصلاح نہیں اور انہیں سنت آفرینش اور آزادی ارادہ و اختیار کے اصول کے مطابق ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ یہ سقوط کے آخری مرحلے تک پہنچ جائیں اور زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو جائیں۔

علاوہ ازیں قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات خدا ایسے لوگوں کو فراواں نعمتیں دیتا ہے اور جب وہ کامیابی اور مسرت کی لذت میں غرق ہوتے ہیں تو اچانک تمام چیزیں ان سے چھین لیتا ہے تاکہ اسی دنیا میں زیادہ سے زیادہ عذاب اور سزا کا مزہ چکھ لیں کیونکہ ایک دم خوشحال زندگی کا چھن جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شیءٍ حتیٰ اذا فرحوا بما اوتوا اخذناهم بغتة فاذا هم مبلسون

جب انہوں نے وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں فراموش کر دیں، تو ہم نے ہر اچھائی اور خیر کے دروازے ان کے لیے کھول دیے تاکہ وہ خوش ہو جائیں پھر اچانک جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا تھا واپس لے لیا لہٰذا وہ انتہائی تکلیف اور غم میں مبتلا ہو گئے۔ (انعام - ۴۴)

درحقیقت ایسے اشخاص ان لوگوں کی طرح ہیں جو ظلم و تشدد سے کسی درخت پر چڑھ جاتے ہیں، وہ جتنا اوپر جاتے ہیں زیادہ خوش ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ درخت کی چوٹی پر جا پہنچتے ہیں۔ اچانک سخت آندھی آتی ہے جو انہیں اوپر سے نیچے گرا دیتی ہے جس سے ان کی سب ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

ایک ادبی نکتہ

آیت کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ لیزدادوا اثما میں لام "لام عاقبت" ہے نہ کہ "لام غایت"۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض اوقات حرف لام عربی لغت میں ایسے موقع پر آتا ہے جو انسان کو محبوب و مطلوب ہو، مثلاً:

لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور

ہم نے قرآن تمہاری طرف اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف دعوت دو۔ (ابراہیم - ۱)

واضح ہے کہ لوگوں کی ہدایت خدا کو محبوب و مطلوب ہے۔ لیکن کبھی لام حرف ایسی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے جو انسان کی ہدف، غرض اور پسند نہ ہو بلکہ اس کے عمل کا نتیجہ ہو۔ مثلاً

لیکون لهم عدوا وحزنا

فرعون کے ساتھیوں نے موسیٰ کو پانی میں سے اٹھا لیا تاکہ انجام کار وہ ان کا دشمن ہو جائے۔ (قصص - ۸)

یہ بات مسلم ہے کہ فرعون کے ساتھیوں نے موسیٰ کو پانی سے اس لیے نہیں اٹھایا تھا کہ وہ کل کو ان کا دشمن ہو جائے لیکن یہ سب ان کے کام کا نتیجہ تھا۔ یہ دونوں تعبیریں نہ صرف ادبیات عرب میں بلکہ باقی زبانوں میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

یہاں سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خدا نے کیوں کہا ہے کہ لیزدادوا اثما (ہم چاہتے ہیں کہ ان کے



گناہ زیادہ ہوں) یہ اعتراض اس صورت میں ہو سکتا تھا جب لام "لام علت" ہوتا اور یہ ہدف و غرض کے طور پر ہوتا اور "لام عاقبت" کے طور پر نہ ہوتا اور یہ نتیجے کے لیے نہ ہوتا۔ اس بناء پر آیت کا معنی یوں ہوگا: ہم انہیں مہلت دیتے ہیں، ان کا انجام یہ ہے کہ ان کی پشت بارگناہ سے بوجھل ہو جائے۔ لہٰذا یہ آیت نہ صرف یہ کہ جبر کی دلیل نہیں بلکہ اختیار اور ارادے کی آزادی کی دلیل ہے۔

۱۷۹۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۷۹ ممکن نہ تھا کہ خدا مومنین کو اسی شکل میں چھوڑ دیتا جس میں تم ہو مگر یہ کہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے۔ نیز (یہ بھی) ممکن نہ تھا کہ خدا تمہیں مخفی رازوں سے آگاہ کرے (کہ اس طرح تم علم غیب کے ذریعے مومنین اور منافقین میں تمیز کرنے لگے، کیونکہ یہ طریقہ سنتِ الٰہی کے خلاف ہے) لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا چن لیتا ہے (اور کچھ مخفی رازوں پر انہیں مطلع کرتا ہے جو ان کی رہبری کے لیے ضروری ہوتے ہیں) پس (اب جب کہ پاک اور ناپاک میں تمیز کے لیے کٹھالی ہے) خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ اگر تم ایمان لے آئے اور تم نے تقویٰ اختیار کر لیا تو تمہارے لیے اجرِ عظیم ہوگا۔

تفسیر

مسلمانوں کی تطہیر

واقعۂ اُحد سے پہلے منافقین کا موضوع مسلمانوں میں زیرِ بحث نہیں آیا تھا اسی لیے وہ زیادہ تر کفار ہی کو اپنا دشمن سمجھتے تھے لیکن اُحد کی شکست کے بعد سچے مسلمانوں کی وقتی کمزوری اور منافقین کی کارکردگی کے لیے زمین ہموار ہو جانے پر انہیں سمجھ آیا کہ ان کے اور بھی خطرناک دشمن ہیں جن پر کڑی نگاہ رکھنا پڑے گی۔ یہ خطرناک دشمن منافق تھے۔ جنگ اُحد کے نتائج میں سے یہ ایک اہم نتیجہ تھا۔

زیرِ نظر آیت جو اس مقام پر واقعہ اُحد کے سلسلے کی آخری آیت ہے اس حقیقت کو ایک عمومی قانون کی صورت میں بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: ماکان اللہ لیذر المؤمنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب — ممکن نہیں کہ خدا مومنین کو اسی حالت میں رہنے دے جس میں تم ہو اور ان کی تطہیر نہ کرے اور طیب کو خبیث سے ممتاز نہ کرے۔ یہ حکم سب کے لیے



ایک جیسا اور عمومی ہے۔ پروردگار کی ایک دائمی سنت ہے کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کرے اور مسلمانوں میں مل جل کر رہنے لگے اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ پے در پے خدائی آزمائشوں سے آخر کار اس کے اندرونی راز فاش ہو جائیں گے۔

ممکن تھا یہاں یہ سوال کیا جاتا (اور بعض روایات کے مطابق کچھ مسلمانوں نے ایسا سوال کیا بھی) کہ وہ خدا جو سب کے مخفی اسرار سے آگاہ ہے اس کے لیے کیا رکاوٹ ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی کیفیت سے آگاہ کرے اور علم غیب کے ذریعے مومن اور منافق میں تمیز کر دی جائے۔

آیت کا دوسرا حصہ اسی سوال کا جواب ہے، جس میں فرمایا گیا ہے: وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب۔ یعنی۔ خدا تمہیں پوشیدہ راز اور علم غیب نہیں دے گا کیونکہ مخفی اسرار پر آگاہی عام لوگوں کے خیالات کے برعکس مشکل کو حل نہیں کرتی بلکہ بہت سے مواقع پر رازوں کے عیاں ہو جانے سے ہرج مرج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اجتماعی گرہیں کھل جاتی ہیں امید کے چراغ بجھ جاتے ہیں اور عام لوگ سعی و کاوش چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے لوگوں کی قدر و قیمت کا تعین ان کی کارکردگی کے حوالے سے ہونا چاہیے کسی اور طریقے سے نہیں[1]

اس کے بعد مذکورہ حکم سے انبیاء الٰہی کا استثناء یوں بیان کیا گیا ہے: ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء۔

خدا جب چاہتا ہے اپنے پیغمبروں میں بعض کو منتخب کرتا ہے اور لامتناہی علم غیب کے کسی گوشے سے انہیں مطلع کر دیتا ہے اور لوگوں کے ایسے اسرار کی انہیں خبر دیتا ہے جن سے آگاہی ان کی رہبری کی تکمیل کیلئے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال کلی و عمومی اور دائمی قانون یہی ہے کہ لوگوں کی پہچان کا آئینہ ان کے اعمال ہی ہیں۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر ذاتی طور پر عالم غیب نہیں ہوتے نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خدا کے عطا کردہ علم کے ذریعے بعض غیبی امور سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا کچھ ایسے افراد ضرور ہیں جو غیب سے آگاہ ہوتے ہیں اور وہ کس قدر آگاہ ہیں یہ بات خدا کی مشیت سے وابستہ ہے۔

کہے بغیر واضح ہے کہ اس آیت میں بھی مشیت سے مراد دیگر آیات کی طرح وہی ارادہ ہے جس میں حکمت و مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی خدا جسے اہل سمجھتا ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اُسے اسرارِ غیب سے آگاہ کر دیتا ہے۔

فامنوا باللہ و رسلہ و ان تؤمنوا وتتقوا فلکم اجر عظیم۔

آیت کے آخر میں یہ بات ذہن نشین کروائی گئی ہے کہ یہ زندگی ایک آزمائش ہے، اس میں پاک اور ناپاک کو جدا جدا کر دیا جاتا ہے اور مومن و منافق میں تمیز کی جاتی ہے تو پھر تم اس آزمائش کی کٹھالی سے اچھی طرح سے نکل آؤ اور خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آؤ۔ لیکن صرف ایمان لانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ فرماتا ہے: اگر ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو عظیم اجر و ثواب تمہارے انتظار میں ہے۔

آیت میں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ مومن کو طیب (پاکیزہ) قرار دیا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں پاکیزہ اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی پہلی خلقت پر برقرار رہے اور خارجی چیزیں اسے خبیث اور ناپاک نہ کر دیں۔ پاکیزہ پانی، پاکیزہ کپڑا اور دیگر اشیاء تب پاکیزہ ہیں جب انہیں خارجی آلودگی کے عوامل نہ لگیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان انسان کی پہلی فطرت ہے۔

---

[1] ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ... (بقرہ۔ ۱۵۵) کی تفسیر میں خدا کی آزمائشوں کے تذکرے میں اس بات کا تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے کہ خدا کی آزمائشیں ایک طرح کی تربیت ہیں نہ کہ خدا ان کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر دیکھئے۔



١٨٠۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

ترجمہ

١٨٠۔ جو بخل کرتے ہیں اور خدا نے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ دیا ہے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ ان کے لیے کوئی اچھی چیز ہے بلکہ یہ ان کے لیے بُری چیز ہے۔ بہت جلدی روزِ قیامت جن کے بارے میں انہوں نے بخل کیا وہی چیزیں طوق کی طرح ان کی گردن میں ڈال دیں گے اور آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لیے ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

قید وبند کا بھاری طوق

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اٰتٰھم اللہ

زیرِ نظر آیت میں قیامت کے دن بخیلوں کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ بخیل جو مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور دولت و ثروت کی حفاظت میں کوشاں رہتے ہیں لیکن اسے بندگانِ خدا پر خرچ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

آیت میں اگرچہ واجب مالی حقوق کا نام نہیں لیا گیا لیکن روایاتِ اہلِ بیتؑ میں اور اقوالِ مفسرین میں اسے مانعینِ زکوٰۃ سے مخصوص قرار دیا گیا ہے اور آیت میں جس قدر شدت دکھائی دیتی ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد مستحب انفاق اور خرچ کرنا نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: جو لوگ بخل کرتے ہیں اور خدا نے جو اپنے فضل وکرم سے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ نہیں کرتے وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ ان کے نفع میں ہے بلکہ یہ تو ان کے نقصان میں جا پڑتا ہے۔ پھر قیامت میں ان کے انجام کا تذکرہ ہے: سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیٰمۃ — جن اموال میں وہ بخل کرتے ہیں بہت جلد انہیں طوق بنا کر ان کی گردن میں ڈال دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مال سے واجب حقوق ادا نہیں کیے گئے اور معاشرے کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ انفرادی ہوا کی نذر ہو گیا ہے اور بعض اوقات احمقانہ امور میں خرچ ہو گیا ہے اور یا بلا وجہ اسے جمع کر کے رکھ دیا گیا اور اس سے کسی نے فائدہ نہیں



اٹھایا وہ دیگر اعمال انسانی کی طرح تجسیم اعمال کے قانون کے مطابق روزِ قیامت مجسم ہوگا اور دردناک صورتِ عذاب کا ذریعہ بن کر آئے گا۔

ایسا مال طوق کی شکل میں مجسم ہوگا اور گردن میں ڈالا جائے گا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اس کا تمام تر بوجھ اٹھانے کا ذمہ دار ہے اگرچہ اس نے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا ہو۔ وہ زیادہ مال جو جنون کی حد تک کوشش سے جمع کیا جائے اور اس کی حفاظت کی جائے مگر وہ معاشرے کی خدمت کے لیے نہ ہو وہ اپنے مالک کے لیے زنجیر اور زندان کے سوا کچھ نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے مال سے معین حد تک ہی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن حد سے گزر جائے تو ایک طرح کی قید اور بے کار بوجھ کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں مگر یہ کہ اس کی روحانی برکات سے فائدہ حاصل کیا جائے اور اسے مثبت کاموں پر خرچ کیا جائے۔ ایسا مال نہ فقط روزِ قیامت اپنے مالک کے لیے ایک بھاری طوق بنے گا بلکہ اس دنیا میں بھی یہ ایسا ہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرق ہے کہ قیامت میں آشکار ہوگا اور اس دنیا میں انتہائی مخفی ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر جنون اور حماقت کیا ہوگی کہ انسان مال کے حساب کتاب، حفاظت اور بچاؤ کے لیے درکار زحمتیں اور تکلیفیں اٹھانے کے علاوہ مال حاصل کرنے کی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے لیکن اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔۔۔ کیا قید و بند کا طوق اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

تفسیر عیاشی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

> جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا خدا اس مال کو آگ کے طوقوں میں بدل دے گا۔ اس کے بعد کہا جائے گا کہ جیسے دنیا میں تو اس مال کو کسی صورت اپنے سے دور نہیں کرتا تھا اب بھی اسے اٹھائے اور اپنی گردن میں ڈال لے۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ آیت میں مال کو ما اتٰھم اللّٰہ من فضلہ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اموال اور دولت کے پیداواری ذرائع کا حقیقی مالک خدا ہے۔ جو کچھ کسی کو دیا گیا ہے یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ اس لیے یہ گنجائش نہیں کہ کوئی شخص اس مال و دولت کو مالکِ حقیقی کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرے۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس جملے کا مفہوم عام ہے اور اس میں تمام نعماتِ الٰہی یہاں تک کہ علم و دانش بھی شامل ہے لیکن یہ احتمال آیت کے ظاہری مفاہیم پر منطبق نہیں ہوتا۔

اس کے بعد آیت ایک اور نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے: وللّٰہ میراث السمٰوٰت والارض — یعنی یہ مال راہِ خدا میں اور بندگانِ خدا کے لیے خرچ ہو یا نہ ہو آخر کار اپنے مالکوں سے جدا ہو جائیں گے اور خدا تمام آسمانوں اور زمین کی وراثتوں کا وارث ہے۔ جب ایسا ہی ہے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ ان اموال کے جدا ہونے سے پہلے ان کی معنوی و روحانی برکات سے فائدہ اٹھایا جائے نہ کہ ان کی حسرت اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھا لیا جائے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے: خدا تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔ بخل کرو گے تو بھی وہ جانتا ہے اور اگر انسانی معاشرے کے مفاد میں اسے کام میں لاؤ گے تو بھی اسے معلوم ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے حسب حال اجر دے گا۔ واللّٰہ بما تعملون خبیر۔

۱۸۱۔ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○

۱۸۲۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ۝

ترجمہ

۱۸۱ خدا نے ان لوگوں کی بات سُنی ہے جو کہتے ہیں کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا یہ ہم لکھ لیں گے اور (اسی طرح ان کا) پیغمبروں کو ناحق قتل کرنا بھی (ہم نے لکھ رکھا ہے) اور ہم انہیں کہیں گے کہ جلانے والا عذاب چکھو۔

۱۸۲ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی آگے بھیجی ہوئی کمائی ہے اور خدا (اپنے) بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

شانِ نزول

یہ آیات یہودیوں کی سرزنش کے لیے نازل ہوئی ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں:

پیغمبر اکرمؐ نے بنی قینقاع کے یہودیوں کو خط لکھا۔ اس میں انہیں نماز ادا کرنے، زکوٰۃ دینے اور خدا کو قرض دینے[1] کی دعوت دی گئی۔

آنحضرتؐ کا قاصد اس گھر میں گیا جو یہودیوں کی مذہبی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا اس کا نام بیت المدارس تھا۔ قاصد نے یہ خط یہودیوں کے سب سے بڑے عالم فنحاص کے ہاتھ میں دیا۔ اس نے خط پڑھنے کے بعد طنزیہ لہجے میں کہا: اگر تمہاری باتیں سچی ہیں تو پھر یہ کہنا چاہیے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں کیونکہ اگر وہ فقیر نہ ہوتا تو ہم سے قرض کی خواہش نہ کرتا[2] علاوہ ازیں محمد (ص) کا اعتقاد ہے کہ خدا نے تمہیں سود کھانے سے منع کیا ہے حالانکہ وہ خود تمہارے انفاق اور خرچ کرنے کے بدلے ربا اور سود کا وعدہ کرتا ہے[3]

بعد میں فنحاص نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اُس نے یہ باتیں کہی ہیں۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں[4]

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: خدا نے یہودیوں کی کفر آمیز باتیں سُنیں، وہ کہتے تھے کہ خدا فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اب گروہ لوگوں کے سامنے انکار کرتے ہیں مگر خدا کے سامنے تو انکار نہیں کر سکتے کہ وہ سب باتوں کو سُنتا ہے، وہ آواز کی ان کمزور ترین اور قوی ترین سب لہروں کو سُنتا ہے جن کے ادراک سے انسانوں کے کان عاجز ہیں (لقد سمع الله قول الذين قالوا ان الله فقير و نحن اغنياء) — اس لیے ان کا انکار کرنا فضول ہے۔

---

[1] خدا کو قرض دینے سے مراد راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ یہاں قرض کا لفظ انسانوں کے جذبوں کو متحرک کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

[2] یہ اشارہ ہے آیہ "من يقرض الله قرضا حسنا" کی طرف۔ (حدید - ۱۱)

[3] آیہ "يربوا الصدقات" کی طرف اشارہ ہے۔ (بقرہ - ۲۷۶)

[4] اسباب النزول از واقدی، صفحہ ۹۹ اور تفسیر روح البیان زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔



اس سے مزید فرمایا: سنکتب ما قالوا — یعنی نہ صرف یہ کہ ہم ان کی باتیں سُنتے ہیں ان سب کو لکھتے بھی ہیں۔ واضح ہے کہ لکھنے سے مراد ہماری طرح کاغذ پر لکھنا نہیں ہے بلکہ مراد آثارِ عمل کی حفاظت کرنا ہے۔ قانون بقائے مادہ کی ترمیم کے مطابق مادہ ختم نہیں ہوتا لیکن توانائی (ENERGY) میں بدل سکتا ہے اور یوں باقی رہتا ہے۔ اسی طرح فرشتگانِ خدا کا لکھنا بھی حفاظتِ عمل کی ایک قسم ہے جو ہر قسم کی کتابت سے بالاتر ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ان کی ان کفر آمیز باتوں ہی کو نہیں لکھا جاتا بلکہ وہ جو انبیاء و مرسلین کو قتل کرتے رہے ہیں اسے بھی ثبت کیا گیا ہے (وقتلهم الانبیاء)۔ یعنی یہودیوں کی طرف سے انبیاء کا مقابلہ کرنا اور ان کے سامنے صف آراء ہونا کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ پہلی مرتبہ کسی پیغمبر کا مذاق نہیں اڑا رہے بلکہ اپنی طویل تاریخ میں ایسے بہت سے جرائم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی جسارت اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ وہ انبیاء کو قتل کر دیں ان کے لیے کونسی تعجب کی بات ہے کہ وہ ایسی کفر آمیز باتیں اپنی زبان پر لائیں۔

ممکن ہے کہا جائے کہ قتلِ انبیاء کا تعلق پیغمبر اسلام کے زمانے سے تو نہیں تھا لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ یہ نسبت اس بناء پر ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے کاموں پر راضی تھے۔ اس لیے اس جوابدہی میں شریک تھے۔

باقی رہا ان کے اعمال ثبت کیے جانے اور ان کے اعمال کی نگرانی کا مسئلہ تو یہ بے وجہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اس لیے ہے تاکہ روزِ قیامت یہ سب ان کے سامنے رکھ دیا جائے اور ہم ان سے کہیں کہ اس وقت اپنے اعمال کا نتیجہ جلانے والے عذاب کی شکل میں چکھو (ونقول ذوقوا عذاب الحریق)۔

یہ دردناک عذاب جس کی اس وقت تم تلخی چکھ رہے ہو خود تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ تم ہی تھے جنہوں نے اپنے اُوپر ظلم کیا، خدا تو کسی پر ظلم نہیں کرے گا ذلك بما قدمت ایدیکم و ان الله لیس بظلام للعبید — اصولی طور پر اگر تم جیسے ظالم اپنے اعمال کا بدلہ نہ پائیں اور وہ بھی نیک لوگوں کی صف میں کھڑے کیے جائیں تو یہ نیکوں پر ظلم ہے اور اگر خدا ایسا نہ کرے تو وہ ظلام یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا ہو گا۔ نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنین علیؑ سے منقول ہے:

وایم الله ما کان قوم قط فی غض نعمة من عیش فزال عنهم الا بذنوب اجترحوها لان الله لیس بظلام للعبید۔

خدا کی قسم نعمت یافتہ گروہ سے اس وقت تک نعمت نہیں چھینی گئی جب تک وہ گناہوں کا مرتکب نہیں ہوا۔ (اس کے بعد امام علیہ السلام نے قرآن کا یہی جملہ بطور سند پیش کیا کہ) لان الله لیس بظلام للعبید (کیونکہ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اور کسی نعمت کے اہل شخص سے نعمت سلب نہیں کرتا)۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو ایک طرف سے جبریوں کے مذہب کی نفی کرتی ہیں اور دوسری طرف افعال کے معاملے میں عدالت کا عمومی اصول بیان کرتی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ زیرِ نظر آیت صراحت سے کہتی ہے کہ خدا کی طرف سے ہر سزا اور اجرا ان اعمال کی وجہ سے ہے جو لوگ اپنے قصد اور ارادے سے انجام دیتے ہیں۔ ذلك بما قدمت ایدیکم یعنی یہاں کاموں کے سبب ہے جنہیں تمہارے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں[1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ



دوسری طرف زیرِ بحث آیت صراحت سے کہتی ہے کہ خدا کبھی ظلم نہیں کرتا اور اس کی سزا کا قانون عدالت مطلقہ کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدلیہ اسی چیز کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ شیعہ اور اہلِ سنت کا ایک گروہ جسے معتزلہ کہتے ہیں۔ عدل کے قائل ہیں۔ ان کے مقابلے میں اہلِ سنت کا دوسرا گروہ جسے اشاعرہ کہتے ہیں، اس کا اس سلسلے میں عجیب و غریب عقیدہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصولی طور پر خدا کے بارے میں ظلم کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اور وہ جو کام انجام دے عین عدالت ہے یہاں تک کہ اگر تمام نیک لوگوں کو جہنم میں اور تمام ظالموں کو بہشت میں لے جائے تو بھی اس نے کوئی ظلم نہیں کیا اور کوئی شخص اس میں چوں و چرا نہیں کر سکتا۔

زیرِ نظر آیت میں ایسے عقائد کو قطعی طور پر رد کر دیا گیا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اگر خدا کچھ افراد کو غلط کام کیے بغیر سزا دے تو وہ ظالم بلکہ ظلّام ہو گا۔ لفظ ظلّام مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بہت ظلم کرنے والا۔

خدا تو کم سے کم ظلم نہیں کرتا پھر یہاں اس لفظ کا استعمال شاید اس بناء پر ہو کہ اگر وہ لوگوں کو کفر و گناہ پر مجبور کرے اور بُرے کاموں پر ابھارنے والے امور ان میں پیدا کرے پھر ان اعمال کے جرم میں جو انہوں نے مجبوراً انجام دیے ہیں انہیں سزا دے تو یہ چھوٹا سا ظلم نہیں ہو گا بلکہ اس طرح تو وہ ظلّام (بہت زیادہ ظلم کرنے والا) ہی قرار پائے گا۔

۱۸۳۔ اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

۱۸۴۔ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝

ترجمہ

۱۸۳ (یہ) وہی (ہیں) جنہوں نے کہا کہ خدا نے ہم سے پیمان لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ (معجزہ کے طور پر) ایسی قربانی نہ کرے جسے (آسمانی) آگ کھا جائے۔ ان سے کہیے کہ پھر تم نے مجھ سے پہلے آنے والے انبیاء کو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو جبکہ وہ واضح دلائل اور جو کچھ تم کہتے ہو لے کر آئے تھے۔

۱۸۴ پس اگر یہ (بہانہ تراش) تیری تکذیب کرتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) یہ تم سے پہلے پیغمبروں کی (بھی) تکذیب کر چکے

حاشیہ از صفحہ سابقہ ۱؎ افعال کی نسبت ہاتھوں کی طرف اس لیے دی گئی ہے کیونکہ بیشتر کام ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں لیکن یہ حکم ہاتھ کے اعمال سے مخصوص نہیں اسی لیے تو کہتے ہیں کہ فلاں کام اس کے ہاتھ سے انجام پایا ہے حالانکہ ہو سکتا ہے کہ کام میں اس کے ہاتھ کا کوئی دخل نہ ہو۔



ہیں جبکہ وہ (پیغمبر) واضح دلائل، متین ومحکم تحریریں اور ضیاء بخش کتاب لائے تھے۔

شانِ نزول

یہودیوں کے چند سرکردہ افراد پیغمبر اکرمؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے، تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ خدا نے تمہیں ہماری طرف بھیجا ہے اور تم پر کتاب بھی نازل کی ہے حالانکہ خدا نے تورات میں ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے ہم اس پر ایمان لے آئیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک جانور کی قربانی کرے اور آسمان سے (صاعقہ کی صورت میں) آگ آئے جو اسے جلا دے، اگر تم ایسا کر دکھاؤ تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر

یہودیوں کی بہانہ تراشی

الذین قالوا ان الله عهد الينا ......

قبولِ اسلام سے بچنے کے لیے یہودی عجیب وغریب بہانے تراشتے تھے۔ ان میں سے ایک کی طرف زیرِ نظر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے: خدا نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی پیغمبر کی دعوت اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے آسمان سے آگ آکر اچک لے۔

مفسرین کہتے ہیں یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ انبیاء الٰہی اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے لازمی طور پر اس مخصوص معجزے کے حامل ہوتے ہیں کہ وہ جانور ذبح کرتے ہیں اور آسمانی بجلی کے ذریعے وہ لوگوں کے سامنے جل جاتا ہے۔

یہودی یہ فرمائش اگر واقعاً ایک معجزے کے لیے کرتے نہ کہ ہٹ دھرمی اور بہانہ سازی کے طور پر تو ایک بات تھی لیکن انکی گذشتہ تاریخ اور پیغمبر اسلامؐ سے ان کی کشمکشیں واضح طور پر یہ حقیقت ثابت کرتی ہیں کہ ان کا مقصد ہرگز تحقیق حق نہ تھا بلکہ وہ معاشرتی دباؤ اور واضح قرآنی استدلالات سے فرار کے لیے نت نئی تجویزیں پیش کرتے رہتے تھے اور اگر ان کی کوئی تجویز زیرِ عمل آ بھی جاتی تب بھی وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ وہ تو اپنی کتب میں پیغمبر اسلامؐ کی سب نشانیاں پڑھ چکے تھے پھر بھی قبولِ حق سے گریزاں تھے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: قل قد جاءكم رسل من قبلي بالبينات و بالذي قلتم فلم قتلتموهم ان كنتم صدقين — یعنی ان بہانہ تراشیوں کے جواب میں ان سے کہیے کہ مجھ سے پہلے بنی اسرائیل کے کئی انبیاء آئے، وہ اپنے ساتھ واضح نشانیاں بھی لائے یہاں تک کہ انہوں نے اس طرح سے قربانی بھی تمہارے سامنے کی، اگر تم سچے ہو تو پھر ان پر ایمان کیوں نہیں لائے اور انہیں کیوں قتل کیا (حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ اور چند دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے جو ان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے)۔



بعض متاخرین تفسیر نگار حضرات مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف قربانی کے مسئلے کے بارے میں ایک اور احتمال ذکر کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ کوئی جانور ذبح ہو اور آگ معجزانہ طور پر آسمان سے آ کر اسے جلا دے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے مذہبی احکامات میں قربانی کی ایک قسم جلی ہوئی قربانی کی تھی۔ اس کے مطابق وہ ایک جانور ذبح کرتے تھے اور خاص رسوم کے مطابق اسے آگ لگا دیتے تھے (ان مراسم کی تفصیل تورات سفر لاویان کی پہلی فصل میں موجود ہے)۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خدا نے ہم سے عہد لے رکھا ہے کہ جلی ہوئی قربانی کا یہ حکم ہر آسمانی دین میں ہوگا اور چونکہ دین اسلام میں یہ نہیں ہے لہٰذا ہم تم پر ایمان نہیں لاتے۔

لیکن یہ احتمال تفسیر آیت میں بہت بعید ہے کیونکہ اول تو اس لفظ کا عطف بینات پر ہے کہ ان کا مقصود ایک معجزانہ کام ہے جو کہ اس تفسیر پر منطبق نہیں ہوتا دوسرا یہ کہ ایک جانور ذبح کرکے جلا دینا ایک فضول کام ہے اور ایسا کام انبیاء کے لائے ہوئے آسمانی احکامات میں سے نہیں ہو سکتا۔

فان کذبوک فقد کذب رسل من قبلک

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دیتا ہے اور ان کی دلجوئی کرتا ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کی باتیں نہیں مانتے تو آپ پریشان نہ ہوں کیونکہ ایسا پہلے بھی بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ آپ سے پہلے کئی پیغمبر آئے ہیں جن کی انہوں نے تکذیب کی ہے۔

جاءو بالبینات والزبر والکتاب المنیر

جبکہ ان انبیاء کے پاس واضح نشانیاں بھی تھیں، وہ آشکار معجزے بھی لاتے تھے (البینات)، محکم و بلند مرتبہ کتب بھی ان کے پاس تھیں (الزبر) اور وہ ضیا بخش کتابوں کے بھی حامل تھے (الکتاب المنیر)۔ توجہ رہے کہ زبر، زبور کی جمع ہے جس کا معنی ہے ایسی کتاب جو استحکام اور پختگی سے لکھی گئی ہو کیونکہ یہ مادہ دراصل لکھنے کے معنی میں ہے لیکن اس سے ہر طرح کا لکھنا مراد نہیں بلکہ ایسا لکھنا جس میں استحکام ہو۔ باقی رہی یہ بات کہ "الزبر" اور "المنیر" میں کیا فرق ہے، جبکہ دونوں الفاظ کتاب کے بارے میں ہیں تو ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ پہلا لفظ ان انبیاء کی کتب کے بارے میں ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے تھے اور دوسرا لفظ تورات و انجیل کے بارے میں ہو کیونکہ قرآن نے سورہ مائدہ آیت ۴۴ و ۴۶ میں ان کے لیے لفظ "نور" استعمال کیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی ونور

اور دوسری آیت ہے:

واتیناہ الانجیل فیہ ھدی ونور

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ زبور آسمانی کتب کے صرف اس حصے کو کہتے ہیں جو وعظ و نصیحت پر مشتمل ہو لیکن آسمانی کتاب یا کتاب منیر کتب کے ان حصوں کو کہتے ہیں جن میں انفرادی و اجتماعی قوانین ہوں (جیسا کہ موجودہ زبور جو حضرت داؤد کی طرف منسوب ہے اس میں بھی وعظ و نصیحت ہی ہے)۔

۱۸۵۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝



ترجمہ

۱۸۵ ہر شخص موت کا ذائقہ چکھتا ہے اور تم روزِ قیامت اپنا اجر مکمل طور پر حاصل کرو گے پس جو لوگ (جہنم کی) آگ کی زد سے دُور رہے اور بہشت میں داخل ہو گئے وہ سعادت سے ہمکنار ہوئے اور حیاتِ دنیا سرمایۂ فریب کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر

موت کا اٹل قانون

مخالفین اور بے ایمان لوگوں کی ہٹ دھرمی کے تذکرے کے بعد اس آیت میں موت کے عمومی قانون کا تذکرہ ہے اور قیامت میں لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس سے پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کی دلجوئی بھی ہو جائے اور گناہ پیشہ مخالفین کو تنبیہ بھی۔ پہلے تو آیت میں ایک ایسے قانون کا تذکرہ ہے جو اس عالم کے تمام زندہ موجودات پر حاکم ہے۔ فرمایا: تمام زندہ چیزیں چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ایک دن موت کا مزہ چکھیں گی (کل نفس ذائقۃ الموت)۔

اگرچہ بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ یہ بھول جائیں کہ وہ فنا پذیر ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم اسے فراموش بھی کر دیں تب بھی وہ ہمیں نہیں بھلائے گی۔ اس دنیا کی زندگی آخر کار ختم ہو جائے گی اور ایک دن ایسا آئے گا جب موت ہر شخص کی تلاش میں آئے گی اور پھر مجبوراً اس جہان سے رختِ سفر باندھنا پڑے گا۔

اس آیت میں "نفس" سے مراد جسم و جان کا مجموعہ ہے اگرچہ بعض اوقات قرآن میں "نفس" صرف روح کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چکھنا یہاں احساس کامل کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان کوئی غذا آنکھ سے دیکھتا ہے یا ہاتھ سے چھوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل احساس پیدا نہیں کرتا لیکن چکھنے سے مکمل احساس پیدا ہو جاتا ہے گویا کارگہِ خلقت میں بالآخر موت ہی ہر موجودِ زندہ کے لیے ایک طرح کی غذا ہے۔

وانما توفون اجورکم یوم القیٰمۃ

پھر فرمایا کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد جزا و سزا کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں عمل ہے جزا کے بغیر اور وہاں جزا ہے عمل کے بغیر "توفون" کا معنی ہے "مکمل وصولی" یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ روزِ قیامت انسان کو پورے طور پر جزا دی جائے گی۔ اس بنا پر اس میں کوئی مانع نہیں کہ عالم برزخ میں بھی انسان اپنے اعمال کے کچھ نتائج اور جزا کا سامنا کرے گا کیونکہ برزخ کی جزا و سزا مکمل نہیں ہے۔

فمن زحزح عن النار وادخل الجنۃ فقد فاز۔

"زحزح" کا اصل معنی ہے "انسان کا اپنے تئیں کسی چیز کی قوتِ کشش سے آہستہ آہستہ نکالنا" اور "فاز" کا اصل معنی ہے "ہلاکت سے نجات اور محبوب تک رسائی"۔

زیرِ نظر جملے میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ آتشِ جہنم کے دائرۂ کشش سے دُور ہوں گے اور بہشت میں داخل ہوں گے وہ نجات یافتہ



ہوں گے اور اپنے محبوب و مطلوب کو پالیں گے۔

گویا دوزخ اپنی پوری قوت سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو عوامل انسان کو دوزخ کی طرف کھینچتے ہیں ان میں عجیب و غریب قوت جذب موجود ہوتی ہے۔ کیا تیز رو ہوس رانیاں، غیر مشروع جنسی لذتیں، جاہ و منصب اور ناجائز دولت و ثروت انسان کے لیے قوت جاذبہ نہیں رکھتیں؟

اس تعبیر سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر لوگ کوشش نہ کریں اور ان پر فریب عوامل کی قوتِ جاذبہ سے دور نہ ہوں تو آہستہ آہستہ ان کی طرف کھینچے جائیں گے۔ لیکن جو لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنے اوپر تدریجاً کنٹرول پا لیتے ہیں اور نفسِ مطمئنہ کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ حقیقی نجات یافتہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور امن و اطمینان کا لطف اٹھاتے ہیں۔

و ما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور

یہ جملہ گذشتہ بحث کی تکمیل کرتا ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ حیاتِ دنیا تو فقط غرور آمیز متاع ہے۔ یہ زندگی اور اس کے سرگرم عوامل دور سے بہت پر فریب ہیں لیکن جب انسان اسے پا لیتا ہے اور اسے قریب سے چھو لیتا ہے تو عملی طور پر اسے اندر سے خالی چیز نظر آتی ہے اور متاعِ غرور کا بھی بس یہی مفہوم ہے۔

علاوہ ازیں مادی لذتیں دور سے تو خالص دکھائی دیتی ہیں لیکن جب انسان ان کے قریب جاتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ یہ طرح طرح کے رنج و الم سے آلودہ ہیں۔ یہ بھی مادی دنیا کے فریبوں میں سے ایک فریب ہے۔ اسی طرح عموماً انسان ان کے فنا پذیری کی طرف بھی توجہ نہیں کرتا لیکن بہت جلد اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس قدر جلدی زائل اور فنا ہونے والی ہیں۔

یہ تعبیرات قرآن و احادیث میں بار ہا آئی ہیں اور ان سب کا ہدف ایک ہی ہے کہ انسان عالمِ مادہ اور اس کی لذات کو اپنا آخری ہدف و مقصد قرار نہ دے کیونکہ اس کے نتیجے میں تو انسان طرح طرح کے جرائم اور گناہوں میں غرق ہو جاتا ہے اور انسانی تکامل و ارتقاء کی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے لیکن مادی دنیا اور اس کی نعمات سے اس حوالے سے استفادہ کرنا کہ یہ تکمیلِ بشریت کا ذریعہ ہیں نہ صرف مذموم و قبیح نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے۔

۱۸۶۔ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○

ترجمہ

۱۸۶ یہ طے شدہ ہے کہ تمہارے اموال اور تمہاری جانوں کے ذریعے تمہاری آزمائش کی جائے گی اور جن لوگوں (یعنی یہودیوں) کو تم سے پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہے اور (اسی طرح) جنہوں نے شرک کی راہ اختیار کر رکھی ہے ان سے



تم بہت سی تکلیف دہ اور آزار رساں باتیں سنو گے اور اگر تم نے صبر واستقامت اور تقویٰ اختیار کیا (کہ جو تمہارے لیے زیادہ مناسب ہے) تو پھر یہ امر محکم اور قابلِ اطمینان امور میں سے ہے۔

شان نزول

جب مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اپنے گھر اور کاروبار سے دُور ہو گئے تو مشرکین نے ان کے اموال کی طرف دستِ تجاوز دراز کیا اور انہیں اپنے زیر تصرف لے آئے اور جو شخص بھی ان کے ہاتھ لگا اسے زبانی اور جسمانی اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

دوسری طرف جب مسلمان مدینہ آئے تو وہاں پر انہیں یہودیوں کی بدگوئی اور آزار رسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر ان میں سے ایک بدزبان اور کینہ پرور شاعر تھا۔ اس کا نام کعب بن اشرف تھا۔ وہ مسلسل پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کی ہجو کہتا تھا اور مشرکین کو ان کے خلاف ابھارتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں غزل سرائی اور عشق بازی سے نہیں چوکتا تھا اس کی بے حیائی اور گستاخی آخر اس حد تک پہنچ گئی کہ پیغمبر اکرمؐ نے مجبوراً اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فی النار والسقر ہو گیا۔

مفسرین کی نقل کردہ روایات کے مطابق مندرجہ بالا آیت انہی موضوعات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور مسلمانوں کو مقابلہ جاری رکھنے کے لیے شوق دلاتی ہے۔

تفسیر

مقابلے اور پامردی سے تھک نہ جاؤ

لتبلون فی اموالکم و انفسکم

جان ومال کے ذریعے تمہارا امتحان لیا جائے گا اور اصولی طور پر یہ دنیا تو میدانِ آزمائش ہی ہے اور اپنے آپ کو سخت اور ناگوار حوادث و مشکلات کے مقابلے میں آمادہ رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ درحقیقت یہ سب مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے اور آمادہ رہنے کے لیے تلقین ہے تاکہ وہ یہ گمان نہ کریں کہ سخت حوادث ان کی زندگی سے ختم ہو چکے ہیں اور یا کعب بن اشرف جیسے بدگو، بدزبان اور فتنہ پرور شاعر کے خاتمے سے دشمن کی طرف سے کوئی اذیت یا زبان کا زخم نہیں پہنچے گا۔

اسی لیے فرمایا: ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم و من الذین اشرکوا اذی کثیرا۔

یعنی یہ بات طے شدہ ہے کہ تم آئندہ بھی اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔

دشمن سے ناروا باتیں سننا ان آزمائشوں کا حصہ ہے جن کا ذکر آیت کے ابتدائی حصے میں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود یہاں اس کا



ذکر خصوصیت سے ہوا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔زبان کے چرکے حساس اور شریف انسانوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے کہ تلوار کے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے۔

وان تصبروا وتتقوا فان ذلک من عزم الامور

یہاں شدید اور المناک حوادث کے موقع پر مسلمانوں کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر استقامت اور پامردی سے کام لو، صابر و بردبار رہو اور تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرو تو یہ ایسے کام ہیں جن کا نتیجہ واضح ہے۔لہٰذا ہر عقلمند آدمی کو ایسا کرنے کا مصمم ارادہ کر لینا چاہیے۔

لغت میں "عزم" کا معنی ہے "پختہ ارادہ"۔بعض اوقات ہر محکم و مضبوط چیز کو عزم کہا جاتا ہے اس لیے عزم الامور کا معنی ہے شائستہ اور مناسب کام جن کی انجام دہی کے لیے انسان کو مصمم ارادہ کر لینا چاہیے یا پھر اس کا مطلب ہے ہر قسم کے محکم اور قابلِ اطمینان کام۔

صبر اور تقویٰ کا آیت میں ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ بعض افراد استقامت و پامردی کے باوجود ناشکری کا اظہار کرتے ہیں اور زبانِ شکایت کھولے رکھتے ہیں لیکن حقیقی مومن وہ ہیں جو صبر استقامت کے ساتھ تقویٰ و پرہیزگاری کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ناشکری اور شکوہ و شکایت سے دور رہتے ہیں۔

۱۸۷۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۸۷۔ اور وہ وقت (یاد کرو) جب خدا نے اہلِ کتاب سے پیماق لیا کہ اسے لوگوں کے سامنے لازمی طور پر آشکار کریں اور چھپائیں نہیں لیکن انہوں نے اسے پسِ پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر دیا، انہوں نے کیسی بُری متاع خریدی۔

تفسیر

واذ اخذ اللّٰہ میثاق الذین اوتوا الکتٰب لتبیننہ للناس و لا تکتمونہ

اہلِ کتاب کی چند غلط کاریوں کے تذکرے کے بعد اس آیت میں ان کے ایک اور بُرے کام کی نشاندہی کی گئی ہے اور وہ ہے حقائق کو چھپانا۔فرمایا گیا ہے: وہ وقت نہ بھول جاؤ جب خدا نے اہلِ کتاب سے پیمان لیا کہ وہ آیاتِ الٰہی کو لوگوں کے سامنے آشکار کریں اور انہیں ہرگز نہ چھپائیں۔



یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "لتبیننه" میں اگرچہ لامِ قسم اور نونِ تاکیدِ ثقیلہ موجود ہے جس سے انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے پھر "ولا تکتمونه" کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے جس میں نہ چھپانے کا حکم ہے۔ ان تمام تعبیرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے گزشتہ انبیاء کے ذریعے ان سے اس بات پر نہایت تاکیدی عہد لیا کہ وہ حقائق کو بیان کریں گے لیکن ان تمام امور کے باوجود انہوں نے خدا سے باندھے گئے محکم پیمان میں خیانت کی اور آسمانی کتب کے حقائق کو چھپایا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: فنبذوہ وراء ظهورهم — یعنی انہوں نے کتابِ خدا کو پسِ پشت ڈال دیا۔ یہ جملہ عمل نہ کرنے اور اسے فراموش کر دینے کے بارے میں عمدہ کنایہ ہے کیونکہ جس پروگرام پر انسان کے عمل کا دارومدار ہوتا ہے اسے وہ اپنے سامنے رکھتا ہے اور اُسے دیکھتا رہتا ہے لیکن اگر وہ اس پر عمل نہ کرنا چاہے اور اسے فراموش کر دینا چاہے تو سامنے سے اٹھا کر اُسے پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

واشتروا به ثمنا قليلا فبئس ما يشترون۔

یہ جملہ ان کی شدید دنیا پرستی اور فکری انحطاط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: اس کام کے بدلے انہوں نے حقیر سی قیمت حاصل کی اور یہ پونجی کیسی بُری ہے جو انہوں نے حاصل کی ہے۔ اگر انہوں نے اخفائے حق کے اس جرم کے بدلے بہت بڑی قیمت حاصل کی ہوتی تو یہ کہا جاتا کہ کثرتِ مال و ثروت نے اُن کی آنکھ کو اندھا اور کان کو بہرہ کر دیا لیکن تعجب تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے یہ سب کچھ متاعِ قلیل کے بدلے بیچ دیا ہے (البتہ اس جملے سے پست ہمت علماء کا کام مراد ہے)۔

علماء کی عظیم ذمہ داری

مندرجہ بالا آیت اگرچہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے علماء کے بارے میں ہے لیکن حقیقت میں تمام مذہبی علماء کو اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کی ذمہ داری ہے کہ فرامینِ الٰہی اور معارفِ دینی کو واضح کرنے کی کوشش کریں اور خدا تعالیٰ نے ان سب سے اس سلسلے میں تاکیدی عہد و پیمان لیا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں لفظ تبیین آیا ہے۔ اس کے مادے کی طرف توجہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں مقصود صرف آیاتِ خدا کی تلاوت اور کتبِ آسمانی کی نشر و اشاعت نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے حقائق کو واضح و آشکار کر کے لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ ہر طرح کے لوگ پوری وضاحت سے ان سے آگاہ ہو سکیں اور ان کی روح اور حقیقت تک پہنچ جائیں اور جو تبیین، توضیح اور تفسیر نہ کریں گے اور مسلمانوں تک حقائق کی روشنی پہنچانے میں کوتاہی کریں گے وہ اسی انجام کے مستحق ہوں گے، جس کا ذکر زیرِ نظر آیت میں اور دیگر آیات میں یہودی علماء کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

اسلام کے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

من كتم علما عن اهله الجم يوم القيامة بلجام من نار

جو شخص علم و دانش کو اس کے اہل (اور ضرورت مند) سے چھپائے گا، قیامت کے دن خدا اُن کے منہ میں (جہنم کی) آگ کی لگام دے گا۔

حسن بن عمار راوی ہے:



ایک دن میں زہری کے پاس گیا جبکہ اُس نے لوگوں کو احادیث پہنچانے کا سلسلہ ترک کر رکھا تھا۔ میں نے اُس سے کہا: جو احادیث تم نے سن رکھی ہیں وہ مجھ سے بیان کرو۔ وہ بولا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ اب میں کسی سے حدیث بیان نہیں کرتا۔ میں نے کہا: بہر حال تم مجھ سے حدیث بیان کرو یا پھر میں تمہیں حدیث سناؤں گا۔ اُس نے کہا: تم حدیث بیان کرو۔ اس پر میں نے حضرت علیؑ کا یہ قول بیان کیا:

ما اخذ الله علی اهل الجهل ان يتعلموا حتی اخذ علی اهل العلم ان يعلموا۔

(یعنی۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جہالت سے علم و دانش کے حصول کا عہد لینے سے پہلے علماء سے عہد لیا کہ وہ انہیں علم سکھائیں)۔

جب میں نے یہ ہلا دینے والی حدیث اس کے سامنے پڑھی تو اُس نے اپنی مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا: سُنو اب میں تمہارے سامنے بیان کروں گا۔

پھر اُس نے اسی نشست میں چالیس احادیث مجھ سے بیان کیں۔[1]

علماءِ اہلِ کتاب کی خیانت کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کے لیے سورہ بقرہ آیات ۹، ۱۷۴ اور ۱۷۴ اور سورہ آلِ عمران کی آیات ۷۱ تا ۷۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۸۸۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۱۸۹۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ترجمہ

۱۸۸ یہ گمان نہ کیجئے کہ جو لوگ اپنے (بُرے) اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور (دوسری طرف یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایسے (نیک) کام کے ضمن میں ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے سرانجام نہیں دیا، وہ عذاب الٰہی سے امان میں ہیں (ایسا نہیں ہے بلکہ) ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۸۹ اور آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ کے لیے ہے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی و تفسیر مجمع البیان، زیرِ نظر آیت کے ذیل میں۔ حضرت علیؑ سے مروی حدیث کا متن نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں موجود ہے۔



شانِ نزول

محدثین و مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں کئی ایک شانِ نزول نقل کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

جب بعض یہودی اپنی آسمانی کتب کی تحریف اور ان میں موجود چیزوں کو چھپانے میں لگے ہوئے تھے اور اپنے گمان میں اس سے کوئی نتیجہ حاصل کر رہے تھے تو وہ اپنے اس عمل پر بہت ہی شاد و مسرور تھے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ لوگ انہیں حامیٔ دین، عالم اور ذمہ دار افراد سمجھیں۔

بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب بھی کوئی اسلامی جنگ درپیش ہوتی وہ طرح طرح کے بہانے کر کے جنگ میں شرکت نہ کرتے اور جب مجاہدینِ اسلام میدانِ جنگ سے واپس آتے تو یہ قسمیں کھاتے کہ اگر انہیں مجبوری نہ ہوتی تو وہ ہرگز جہاد ترک نہ کرتے اور وہ توقع رکھتے کہ اپنے "اِن کیے کاموں" پر مجاہدین اور فداکاروں کی طرح تحسین و آفرین حاصل کریں، اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔[1]

تفسیر

خود پسندی

لاتحسبن الذین یفرحون بما اتوا و یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا

بُرے کام کرنے والے لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو حقیقتاً اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں اور اپنی سرشت و جبلت کی سرکشی کی وجہ سے برائیوں اور گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نجات بہت ہی آسان ہے کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ گناہ کے بعد پشیمان ہوتے ہیں اور ان کا بیدار وجدان انہیں سرزنش کرتا ہے۔

دوسرے وہ ہیں جو نہ صرف یہ کہ احساسِ ندامت نہیں کرتے بلکہ وہ مغرور اور خود پسند ہوتے ہیں اور اپنے قبیح اور سنگین گناہوں پر خوش ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان پر فخر و مباہات کرتے ہیں اور پھر اس سے بھی آگے وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ لوگ ان کی تعریف ایسے نیک کاموں کے ضمن میں کریں جو انہوں نے انجام بھی نہیں دیے۔

مندرجہ بالا آیت کہتی ہے:

یہ گمان نہ کرو کہ ایسے لوگ جو اپنے اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ انہوں نے جو کام نہیں کیے ان (کاموں) کی وجہ سے ان کی عزت کی جائے اور شان و شوکت بیان کی جائے کہ وہ عذابِ خدا سے دور ہیں اور نجات پالیں گے حالانکہ نجات تو ان اشخاص کے لیے ہے جو کم از کم اپنے بُرے کاموں پر شرمندہ ہیں اور یہ سوچ کر کہ وہ نیک کام نہیں کر سکے پشیمان ہیں۔

---

[1] اسباب النزول از واقدی، تفسیر المنار اور تفسیر مجمع البیان زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔



و لهم عذاب اليم .

نہ صرف اس قسم کے خود پسند اور مغرور افراد نجات کے حقدار نہیں ہیں بلکہ دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے ۔

بہت ممکن ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھی جائے کہ یہ ان نیک کاموں پر اظہار مسرت کے بارے میں ہے جن کے انجام دینے کی ہمیں توفیق دی گئی ہے ۔ اگر یہ خوشی اعتدال کی حالت میں ہو اور غرور کا سبب نہ بنے تو یہ قابل مذمت نہیں ہے ۔ اسی طرح ان نیک کاموں کے سلسلے میں جو انجام پا چکے ہیں اظہار مسرت کرنا اگر وہ بھی اعتدال کی حد میں ہو اور اس کا سبب اس کے اپنے اعمال نہ ہوں تو یہ بھی مذموم نہیں ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے دوست یعنی وہ افراد جو ایمان کی بلند سطح پر فائز ہیں اور اس قسم کی سرت و شادمانی سے دور رہتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے اعمال کو کمتر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو عظمت پروردگار کے سامنے ہیچ محسوس کرتے ہیں ۔

ضمناً یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت صرف ان منافقوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جو صدر اسلام میں تھے یا اسی قسم کے اور لوگ بلکہ وہ تمام افراد جو ہمارے زمانے میں مختلف اجتماعی حالات و کیفیات میں رہتے ہیں اور اپنے بُرے اعمال پر خوش ہیں یا جو لوگوں کو ابھارتے ہیں کہ وہ قلم اور زبان سے ان کے اعمال کی تعریف کریں وہ سب کے سب اس آیت کے مفہوم و مطلب میں شامل ہیں ۔ ایسے لوگوں کا نہ صرف آخرت کا عذاب منتظر ہے بلکہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی لوگوں کے غیظ و غضب کی وجہ سے مخلوق خدا سے الگ تھلگ سے رہتے ہیں اور طرح طرح کی مشکلات کا نشانہ ہیں ۔

و لله ملك السموٰت و الارض و الله على كل شيء قدير

خدا آسمان و زمین کا مالک ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ یہ آیت مومنین کے لیے خوشخبری اور کافروں کے لیے دھمکی ہے ۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مومن ترقی کے لیے ٹیڑھے راستوں پر چلیں اور جو کام انہوں نے نہیں کیا اس کی تعریف چاہیں ۔ ہاں وہ یہ کر سکتے ہیں کہ آسمان و زمین کے مالک خدا کی قدرت کے سائے میں رہتے ہوئے جائز اور صحیح طریقوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں نیز بدکار اور منافق لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ ٹیڑھے راستوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی حیثیت اور مقام حاصل کریں تو وہ یہ تصور نہ کریں ۔ کیونکہ وہ اس خدا کے عذاب سے جس کی تمام موجودات پر حکومت ہے نجات حاصل نہ کر سکیں گے ۔

۱۹۰۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ○

۱۹۱۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

۱۹۲۔ رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ



مِنۡ اَنۡصَارٍ ۝

۱۹۳۔ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ۝

۱۹۴۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخۡزِنَا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ۝

ترجمہ

۱۹۰ بے شک زمین و آسمان کی تخلیق اور رات دن کے آنے جانے میں صاحبان عقل کے لیے (روشن) نشانیاں ہیں۔

۱۹۱ وہ لوگ خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور اس وقت جبکہ وہ پہلو کے بل لیٹے ہوں یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش کے اسرار میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں) اے خدا! تو نے ہمیں فضول پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

۱۹۲ پالنے والے جس کو تو نے (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دیا اسے تو نے ذلیل و خوار کیا اس قسم کے ظالم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں۔

۱۹۳ اے پروردگار! ہم نے توحید کے منادی کی آواز سنی ہے، جو پکار رہا تھا کہ اپنے پالنے والے پر ایمان لاؤ اور ہم ایمان لے آئے (اب جبکہ ایسا ہے) اے خدا! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ (اُن کے راستے پر) موت دینا۔

۱۹۴ اے خالق! جس چیز کا تو نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے وہ ہمیں مرحمت فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

آیات کی اہمیت

یوں تو قرآن مجید کی سب کی سب آیتیں اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ وہ سب خدا کا کلام ہیں اور نوع بشر کی تعلیم و تربیت کے لیے



نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض خاص قسم کی چمک دمک رکھتی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ بالا پانچ آیات قرآن کی دل ہلا دینے والی عبارتوں میں سے ہیں۔ یہ معارف دینی کا ایک ایسا نادر مجموعہ ہیں جن میں لطیف مناجات اور تفرع وزاری کی آمیزش ہے اور وہ ایک آسمانی سرود معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو احادیث اور روایات میں انہیں خاص اہمیت دی گئی ہے۔

عطا ابن ابی رباح کہتا ہے کہ میں ایک دن حضرت عائشہ کے پاس گیا اور ان سے سوال کیا کہ سب سے زیادہ عجیب چیز جو آپ نے پیغمبر اسلامؐ سے دیکھی ہے وہ کیا ہے؟

وہ کہنے لگیں، پیغمبرؐ کا سب کچھ تعجب خیز تھا لیکن عجیب تر یہ تھا کہ ایک رات آنحضرتؐ میرے حجرے میں استراحت کرنے لگے، ابھی آرام نہیں کیا تھا کہ کھڑے ہوگئے۔ لباس پہنا، وضو کیا اور نماز شروع کر دی۔ حالتِ نماز میں اور مخصوص جذبۂ الٰہی میں اس قدر آنسو بہائے کہ آپ کے لباس کا اگلا حصہ آپ کے اشکوں سے تر ہوگیا۔ اس کے بعد آپؐ نے سر سجدے میں رکھا اور اتنا گریہ کیا کہ زمین آپ کے آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ آپؐ طلوع صبح تک اسی طرح گریاں و منقلب رہے۔ جب بلالؓ نے آپؐ کو نماز صبح کے لیے پکارا تو آپؐ کو اشکوں سے تر بتر دیکھا تو پوچھا آپؐ اس قدر گریہ کیوں فرما رہے ہیں آپؐ کے تو لطف الٰہی شامل حال ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

افلا اکون للّٰہ عبدا شکورا

کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں اور میں کیوں گریہ نہ کروں خدا تعالیٰ نے کل رات مجھ پر ہلا دینے والی اور پریشان کر دینے والی آیات نازل کی ہیں۔

پھر آپؐ نے یہ پانچ آیات (جو زیرِ نظر ہیں) کی تلاوت شروع کی اور آخر میں فرمایا:

ویل لمن قرأھا ولم یتفکر فیھا

وائے ہو اس پر جو انہیں پڑھے لیکن ان میں غور و فکر نہ کرے[1]

روایت کا آخری جملہ آیات میں گہرے غور و فکر کا حکم دیتا ہے۔ ایسے جملے بہت سی روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہیں۔

ایک روایت میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ پیغمبر خداؐ جب بھی نماز تہجد کے لیے اٹھتے پہلے مسواک کرتے پھر آسمان کی طرف دیکھتے اور یہ آیات پڑھتے[2]

روایاتِ اہلِ بیتؑ میں حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی نمازِ تہجد کے لیے اٹھے ان آیات کی تلاوت کرے[3]

نوف بکالی حضرت علیؑ کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

ایک شب میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ ابھی مجھے نیند نہ آئی تھی میں نے دیکھا کہ امامؑ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور آپؑ نے ان آیات کی تلاوت شروع کر دی ہے۔ پھر مجھے پکارا اور فرمایا: اے نوف! سو رہے ہو یا جاگتے ہو؟

---

[1] تفسیر ابو الفتح رازی۔۔۔ زیرِ نظر آیات کے ذیل میں۔

[2] و [3] نور الثقلین و مجمع البیان



میں نے عرض کیا: میں بیدار ہوں اور اس وسیع و عریض آسمان کو دیکھ رہا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا کہنا اُن لوگوں کا جنہوں نے اس زمین کی آلودگیوں کو قبول نہیں کیا اور اس طرح سے آسمان کی طرف گئے ہیں (یعنی — جنہوں نے عالم مادہ کی چاردیواری سے پرواز کی ہے اور ان کی بلند روح ملکوتِ آسمان کی سیر کرتی ہے)۔

تفسیر

خداشناسی کا روشن ترین راستہ

ان فی خلق السمٰوٰت و الارض ......

قرآنی آیات صرف پڑھنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے سمجھنے اور ادراک کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ ان کی تلاوت تو انہیں سمجھنے کی تمہید ہے۔ اس لیے تو مندرجہ بالا آیت میں آسمان و زمین کی عظمت کا تذکرہ ہے اور فرمایا گیا ہے: آسمان و زمین کی خلقت اور روز و شب کی آمد و رفت میں صاحبانِ عقل و خرد اور اہلِ فکر و نظر کے لیے واضح نشانیاں ہیں[1] یہ کہہ کر لوگوں کو اس عظیم خلقت میں غور و فکر کے لیے ابھارا گیا ہے تاکہ ہر شخص اپنی استعداد اور پیمانۂ فکر کے مطابق اس بے کنار سمندر سے اپنا حصہ لے اور اسرارِ آفرینش کے شفاف چشمے سے سیراب ہو، یہ حقیقت ہے کہ جہانِ آفرینش کے بدیع نقوش، دلکش تصویریں اور اس پر حاکم خیرہ کرنے والا نظام ایک بہت بڑی کتاب ہے جس کا حرف حرف اور لفظ لفظ اس عالم کے پیدا کرنے والے کے وجود اور اس کی یکتائی کی بہت ہی واضح دلیل ہے[2]

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا

اس جہان کے گوشہ و کنار کی جو رعنائی اور دلکشی وسیع عالمِ ہستی میں دکھائی دیتی ہے وہ صاحبانِ عقل کے دلوں کو یوں جذب کرتی ہے کہ وہ کھڑے ہوں یا بیٹھے، بستر پر محوِ آرام ہوں یا پہلو کے بل لیٹے وہ اس نظام کے خالق اور اس کے اسرار کی یاد میں مگن ہوتے ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیت میں ارشادِ الٰہی ہے، عقلمند وہ ہیں جو قیام میں ہوں یا قعود میں یا پہلو کے بل محوِ استراحت، خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کے اسرار میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں یعنی ہمیشہ اور ہر حالت میں اس حیات بخش فکر میں غوطہ زن رہتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے ذکر کا تذکرہ ہے اور پھر فکر کا یعنی صرف خدا کو یاد کرنا کافی نہیں۔ یہ تذکر اس وقت بہترین ثمرات کا حامل

---

[1] قرآن میں "اولوالالباب" زیرِ نظر آیت کے علاوہ بعض دیگر آیات میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہ صاحبانِ عقل کے لیے لطیف اشارہ ہے کیونکہ لب دراصل ہر چیز کے خالص جوہر کو کہتے ہیں اور انسانی وجود کا جوہر عقل و فکر ہی ہے۔

[2] اختلافِ شب و روز اور اس کے اسرار کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۶۴ تفسیر نمونہ جلد اول میں بحث کی جا چکی ہے۔ کائنات کی خلقت میں جو نظم و ضبط موجود ہے وہ خداشناسی کی روشن ترین دلیل ہے۔ اس کی مزید توضیح کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے: آفریدگارِ جہان، معمائی ہستی اور جستجوی خدا۔



ہوگا اگر اس کے ساتھ غور و فکر بھی شامل ہو۔ جیسے آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرنے میں یادِ خدا شامل نہ ہو تو یہ غور و فکر بھی کسی کام کا نہیں۔ ایسے کتنے ہی صاحبانِ علم و دانش ہیں جو فلکیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور آسمانی کُرّات کی خلقت کے باہمی ربط میں عجیب و غریب نظم و ضبط کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ یادِ خدا سے غافل ہوتے ہیں اور توحید کی عینک ان کی آنکھوں پر نہیں ہے اور وہ عالم ہستی کو مبداءِ عالم کی شناسائی کے زاویے سے نہیں دیکھتے لہٰذا وہ انسانی تربیت کا لازمی نتیجہ اس مشاہدے سے اخذ نہیں کر پاتے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسی غذا کھاتا ہے جو صرف اس کے جسم کو تقویت بخشتی ہے اور اس کی فکر و نظر اور روح پر کوئی اثر نہیں کرتی۔

ربنا ما خلقت ھذا باطلا

خلقتِ آسمان و زمین میں غور و فکر کرنے سے انسان کو ایک خاص آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس تفکر کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ مخلوق بے کار، فضول اور مہمل نہیں ہے کیونکہ جب انسان اس جہان کی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی ایک عظیم مقصد کا مشاہدہ کرتا ہے تو کیا پھر وہ یہ باور کر سکتا ہے کہ سارے کا سارا جہان بغیر کسی ہدف و مقصد کے ہو۔

انسان کو گھاس کے تنکے کی مخصوص ساخت میں واضح اغراض و مقاصد دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کا دل، دل کی گہرائیاں اور دریچے ہر کوئی ایک پروگرام کا حامل ہے۔ آنکھ کے طبقوں کی ساخت کسی مقصد کے بغیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پلکوں اور ناخنوں تک ایک معین مقصد کے حامل ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ جس موجود کا ذرہ ذرہ مقصد و ہدف کا حامل ہو وہ خود مجموعی اعتبار سے بالکل بے مقصد ہو۔

اسی لیے تو صاحبانِ عقل اس زمزمہ پر سر دھنتے ہیں کہ — اے خداوند عالم تو نے اس عظیم کارخانے کو فضول پیدا نہیں کیا، بارالٰہا! یہ اتنا بڑا جہان اور یہ عجیب و غریب نظام سب کا سب یقیناً حکمت و مصلحت اور کسی صحیح ہدف و غرض کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ پروردگارا! یہ سب تیری وحدانیت کی نشانیاں ہیں اور تو عبث و فضول کام سے منزہ اور پاک ہے۔

فقنا عذاب النار

عالمِ خلقت میں مقصد کے وجود کا اعتراف کرنے کے فوراً بعد صاحبانِ عقل و خرد اپنی خلقت کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان جو اس جہان ہستی کا ثمرہ و نتیجہ ہے عبث نہیں پیدا کیا گیا اور مقصد اس کی تربیت اور تکامل کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اور وہ اس جہان کی جلد گزر جانے والی اور بے قیمت زندگی ہی کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے آگے ایک اور گھر ہے جہاں اس کے اعمال کی جزا و سزا ہو گی — جب اہل عقل یہ سوچتے ہیں تو اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور خدا سے ان کی انجام دہی کی توفیق کا تقاضا کرتے ہیں تاکہ وہ عذابِ الٰہی سے مامون ہو جائیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں: خداوندا! ہمیں آتشِ جہنم سے بچالے۔

ربنا انک من تدخل النار فقد اخزیتہ و ما للظلمین من انصار

بارالٰہا! جسے تو (اس کے اعمال کے نتیجے میں) دوزخ میں ڈال دے اسے تو نے رسوا و ذلیل کر دیا اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔



اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبانِ عقل جہنم کی آگ کی نسبت رسوائی سے زیادہ ڈرتے ہیں اور وحشت زدہ ہیں بڑے انسان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ رنج و غم اور دکھ درد تو برداشت کرنے کو آمادہ ہوتے ہیں لیکن اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کی نظر میں روزِ قیامت دردناک ترین عذاب خدا اور بندوں کے سامنے رسوا اور ذلیل ہونا ہے۔

"ما للظلمین من انصار" میں جو نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ صاحبانِ بصیرت غرضِ آفرینش سے آگاہی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی کامیابی اور نجات کا ذریعہ صرف اس کے اعمال و کردار ہیں۔ اس لیے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا کیونکہ اصلی مددگار تو نیک عمل ہے جسے وہ گنوا بیٹھے ہیں۔

لفظ "ظلم" میان پر اس لیے ہے کہ ظلم گناہوں میں زیادہ اہم گناہ ہے اور یا اس لیے ہے کہ تمام گناہوں کا مطلب اپنے اوپر ظلم کرنا ہی ہے۔

البتہ آیت شفاعت (اپنے حقیقی مفہوم میں) کے منافی نہیں ہے کیونکہ — جیسا کہ ہم شفاعت کے ضمن میں کی گئی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ شفاعت مخصوص آمادگی کی محتاج ہے اور آمادگی کچھ نیک اعمال کے ذریعے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا

صاحبانِ عقل و خرد مقصدِ تخلیق جان لینے کے بعد اس نکتے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ نشیب و فراز کے اس راستے کو خدائی رہنماؤں کی رہبری کے بغیر ہرگز طے نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے وہ ہر وقت ایمان اور صداقت کے منادیوں کی ندا سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ جب ان کی پہلی آواز ان کے کانوں میں پڑتی ہے تو وہ ان کی طرف لپکتے ہیں ضروری غور و فکر اور جستجو کے بعد وہ ان کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے پورے وجود کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے پروردگار کے سامنے عرض کرتے ہیں: بارالٰہا! ہم نے توحید کے منادی کی آواز سنی جو ہمیں ایمان کی طرف دعوت دے رہا تھا اس کے بعد ہم ایمان لے آئے۔

ربنا فاغفر لنا ذنوبنا وکفر عنا سیاتنا و توفنا مع الابرار۔

بارالٰہا! جب معاملہ اس طرح سے ہے اور ہم مکمل طور پر ایمان لے آئے ہیں لیکن ہم غرائزِ انسانی اور خواہشاتِ نفسانی کے شدید طوفانوں اور آندھیوں کی زد میں ہیں اس لیے ہم سے لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں اور ہم مختلف گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں — اس لیے ہمیں بخش دے، ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کر دے۔ ہمیں نیک اور صالح لوگوں کے راستے پر مرنے کی سعادت عطا فرما۔

اہل عقل انسانی معاشرے سے وابستہ ہیں مگر فرد پرستی سے بیزار ہیں۔ وہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ نہ صرف ان کی زندگی نیک لوگوں کے ساتھ ہو بلکہ ان کی موت بھی — چاہے وہ طبیعی موت ہو یا راہِ خدا میں شہادت — نیک لوگوں کے ساتھ ہو اور انہی کے طور طریقے کے مطابق ہو کیوں کہ بُروں کے ساتھ مرنا بھی دوبھر ہے۔

یہاں سوال پیش آتا ہے کہ گناہوں سے بخشش کے تقاضے کے ساتھ برائیوں پر پردہ پوشی اور ان کی بخشش کے کیا معنی ہیں۔ قرآن حکیم کی دیگر آیات کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۳۱ یوں ہے:



ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم

اگر گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرو تو ہم تمہاری برائیوں کی پردہ پوشی کریں گے اور انہیں محو کر دیں گے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیئات گناہانِ صغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے اہلِ عقل پہلے تو اللہ سے بڑے گناہوں کی مغفرت کا تقاضا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی گناہانِ صغیرہ کے آثار کے خاتمے کی دعا کرتے ہیں۔

ربنا واتنا ما وعدتنا علی رسلک .....

وہ لوگ آخری مرحلے میں راہِ توحید طے کرنے، روزِ قیامت پر ایمان لانے، پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے اور اپنی ذمہ داریاں انجام دینے کے بعد خدا سے تقاضا کرتے ہوئے کہتے ہیں: اب جب ہم اپنا عہد و پیمان پورا کر چکے ہیں، بارالہا! تو نے اپنے پیغمبروں کی معرفت ہم سے جو وعدہ فرمایا ہے اور خوشخبری دی ہے اُس کو پورا فرما اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا کیونکہ تو جس چیز کا وعدہ کرتا ہے اس میں وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔

رسوا نہ ہونے کی خواہش کا پھر سے اظہار اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ وہ لوگ اپنی شخصیت کی اہمیت کے قائل ہیں اس لیے وہ رسوائی کو دردناک ترین سزاؤں میں سے سمجھتے ہیں لہٰذا وہ پھر اسی پر انگشت رکھتے ہیں۔

امام صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

جس شخص کو کوئی مہم درپیش ہو اور وہ پانچ مرتبہ "ربنا" کہے تو خدا اسے اس چیز سے رہائی بخشے گا جس سے وہ خوفزدہ ہے اور وہ جس چیز کی اُمید رکھتا ہے اُسے پالے گا۔

کسی نے عرض کیا:

وہ پانچ مرتبہ کس طرح "ربنا" کہے۔

آپؑ نے فرمایا:

ان آیات کو پڑھے جن میں پانچ مرتبہ "ربنا" آتا ہے، تو فوراً ہی پروردگار کی طرف سے دعا قبول کی جاتی ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے: فاستجاب لھم ربھم۔

پھر کہے بغیر واضح ہے کہ ان آیات کی حقیقی اور گہری تاثیر اسی صورت میں ہے جب انسان کی زبان اس کے دل اور عمل سے ہم آہنگ ہو۔ اہلِ خرد کی طرزِ فکر، خدا سے ان کا عشق، ذمہ داریوں کی طرف ان کی توجہ اور نیک اعمال کی انجام دہی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دعا کرنے والوں کو یہی راہ اپنانا چاہیے اور وہی خشوع و خضوع پیدا کرنا چاہیے جو اہلِ عقل خدا سے مناجات کرتے وقت پیدا کرتے ہیں۔

۱۹۵۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ



سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○

ترجمہ

۱۹۵ خدانے ان (صاحبانِ عقل) کی درخواست قبول کرلی ہے اور فرمایا ہے کہ میں تم میں سے عمل کرنے والے کے عمل کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد ضائع نہیں کروں گا تم سب ایک ہی نوع میں سے ہو اور ایک دوسرے کی جنس ہو۔ جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور انہوں نے میری راہ میں تکلیف اور اذیت کا سامنا کیا ہے اور جنگ کی ہے اور مارے گئے ہیں میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں ان کے گناہ بخش دوں گا اور انہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے ثواب ہے اور خدا کے ہاں ہی بہترین ثواب ہے۔

شانِ نزول

یہ آیت گذشتہ آیات کا ضمیمہ ہے۔ اس میں صاحبانِ عقل و خرد کے اعمال کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ آیت کے شروع میں فاء تفریع اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ گذشتہ آیات سے مربوط ہے۔ اس کے باوجود اس کے بارے میں کئی ایک شان نزول مروی ہیں۔ لیکن یہ بات اس کے گذشتہ آیات سے مربوط ہونے کے منافی نہیں ہے۔
ایک شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ کی ایک زوجۂ محترمہ جناب اُمّ سلمہ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ قرآن میں مردوں کے جہاد، ہجرت اور فداکاری کی بہت گفتگو ہے، کیا عورتوں کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے۔ زیر نظر آیت اسی سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔
یہ بھی منقول ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے جب فاطمہ بنت اسد، فاطمہ بنت رسول اللہ اور فاطمہ بنت زبیر (جنہیں فواطم کہا گیا ہے) کے ہمراہ ہجرت کی اور اُمّ ایمن جو ایک صاحب ایمان خاتون تھیں راستے میں آپ سے آملیں تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔
جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ شانہائے نزول اس بات کے منافی نہیں کہ زیر نظر آیت گذشتہ آیات سے مربوط ہے جیسے دونوں شانہائے نزول بھی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔



تفسیر

اہلِ خرد کے اعمال کا نتیجہ

گذشتہ آیات میں اہلِ خرد کے ایمان، اعمال، دعاؤں اور تفرع وزاری کا ذکر تھا۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے:

فاستجاب لھم ربھم — یعنی اُن کے پروردگار نے ان درخواستوں کو فوراً قبول کر لیا۔ ربھم (اُن کا پروردگار) — یہ تعبیر اُن پر پروردگار کے انتہائی لطف وکرم کی حکایت کرتی ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: انی لا اضیع عمل عامل منکم — اس بناء پر کہ کہیں اشتباہ نہ ہو اور نجات وکامرانی کو انسان کے اعمال وکردار سے الگ نہ سمجھ لیا جائے فرمایا گیا: تم میں سے عمل کرنے والے کے کسی عمل کو میں ہرگز ضائع نہیں کروں گا۔ اس میں عمل کا ذکر بھی ہے اور عامل کا بھی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قبولیتِ دعا کا محورِ اصلی وہ اعمالِ صالح ہیں جو ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ایسی درخواستیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں جن کی ڈھال عملِ صالح ہو۔

من ذکر او انثی بعضکم من بعض۔

اس بناء پر کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خدا کا یہ وعدہ کسی خاص گروہ سے مخصوص ہے، فرمایا گیا ہے کہ یہ عمل کرنے والا چاہے مرد ہو یا عورت اس میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ تم سب خلقت میں ایک دوسرے سے وابستہ ہو تم میں سے بعض، بعض دوسروں سے پیدا ہوتے ہیں، عورتیں مردوں سے اور مرد عورتوں سے۔

بعضکم من بعض — ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ تم سب کے سب ایک دین کے پیرو اور ایک ہی حقیقت کے طرفدار ہو اور ایک دوسرے سے ہم کاری رکھتے ہو لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ خدا تمہارے درمیان تبعیض روا رکھے۔

فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیاٰتھم — اس سے پھر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس بناء پر وہ تمام لوگ جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی ہے اور اپنے گھر اور وطن سے نکالے گئے ہیں انہوں نے راہ خدا میں تکلیفیں اٹھائی ہیں جہاد کیا ہے اور جانیں دی ہیں۔

پہلا احسان جو خداوند عالم کی طرف سے ان پر ہوگا وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ ان کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان کی تکالیف اور شدائد کو گناہوں کا کفارہ قرار دے گا تاکہ وہ گناہوں سے بالکل پاک ہو جائیں۔

ولا دخلنھم جنات تجری من تحتھا الانھٰر

اس کے بعد فرماتا ہے کہ میں گناہوں کو بخشنے کے علاوہ یقیناً انہیں ایسی جنت میں جگہ دوں گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں جو گوناگوں نعمتوں سے بھری پڑی ہیں۔

ثوابا من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب

یہ وہ جزا وثواب ہے جو ان کی جانثاری کی وجہ سے خداوند عالم ان کو مرحمت فرمائے گا، بے شک بہترین ثواب اور اجر اسی کے پاس ہے۔ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ دنیا والوں کے لیے خدا کے اجر وثواب کی تعریف وتوصیف مکمل طور پر نہیں کی جا سکتی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اس کی ذاتِ والاصفات ہر ثواب اور جزاء سے بالاتر ہے۔



آیتِ مندرجہ بالا سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو اعمالِ صالح کے سائے میں گناہوں سے پاک ہونا چاہیے اس کے بعد قربِ خدا اور بہشت اور اس کی نعمتوں کی طرف رُخ کرنا چاہیے کیونکہ ابتدا میں فرماتا ہے: لاکفرن عنهم سیئاتهم اور اس کے بعد ولادخلنهم جنات یعنی بہشت پاک لوگوں کا مقام ہے اور جب تک انسان پاک نہ ہو وہ جنت کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔

مرد اور عورت کی روحانی قدر و قیمت

آیۂ مذکورہ بھی قرآن کی دوسری بہت سی آیات کی طرح عورت اور مرد کو خدا کی درگاہ کے باطنی اور روحانی مقامات تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے کے برابر قرار دیتی ہے۔ آیت کی نظر میں جنس کا اختلاف، جسمانی ساخت کا فرق اور ان کے لیے بعض اجتماعی ذمہ داریوں کا فرق، مرد اور عورت دونوں کے لیے کمالِ انسانی کے حصول میں کسی فرق کی دلیل نہیں۔ بلکہ آیت اس حیثیت سے دونوں کو مکمل طور پر ایک ہی سطح پر رکھتی ہے۔ اسی لیے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک ادارے کے انتظام کے لیے ایک شخص کو رئیسِ ادارہ بنا دیتے ہیں اور دوسرے کو معاون یا رکن۔ رئیس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے کام میں زیادہ تجربہ اور اطلاعات وغیرہ رکھتا ہو، لیکن یہ فرقِ مراتب ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ رئیس ادارہ انسانی شخصیت اور قدر و قیمت میں اپنے ماتحتوں سے زیادہ ہے۔

قرآن مجید وضاحت کے ساتھ فرماتا ہے:

ومن عمل صالحًا من ذكر او انثى وهو مومن فاولٓئك يدخلون الجنة يرزقون فيها بغير حساب۔ (سورہ المومن آیت ۴۰)

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک عمل کرے اور ایماندار ہو وہ بہشت میں داخل ہوگا اور اُسے بے حساب روزی دی جائے گی (اور وہ اس جہان کی روحانی اور جسمانی نعمتوں سے فیض یاب ہوگا)۔

اسی طرح دوسری آیت میں ہے:

من عمل صالحًا من ذكر او انثى وهو مومن فلنحيينه حيوة طيبة ولنجزينهم اجرهم باحسن ما كانوا يعملون۔ (سورۂ نحل آیت ۹۷)

مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک کام کرے اور مومن ہو، ہم اُسے پاکیزہ زندگی دیں گے اور بہت اچھی جزا دیں گے۔
یہ آیت اور اسی قسم کی دوسری متعدد آیتیں اس زمانے میں نازل ہوئیں جب دنیا کی تمام قومیں عورت کے انسانی نوع اور جنس بشر ہونے کے متعلق ڈانواں ڈول تھیں اور اُسے حقیر و ذلیل مخلوق اور گناہ اور موت کا سرچشمہ سمجھتی تھیں۔
بہت سی گذشتہ قومیں یہ اعتقاد بھی رکھتی تھیں کہ عورت کی عبادت درگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی۔ بہت سے اہلِ یونان تو عورت کو گندی مخلوق اور شیطانی عمل جانتے تھے۔ رومی اور بعض یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اصولی طور پر عورت میں انسانی روح کارفرما نہیں ہے۔ روحِ انسانی تو صرف مردوں کو دی گئی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ماضی قریب میں ہسپانیہ کے



عیسائی عالم اس بارے میں بحث کر رہے تھے کہ کیا عورت مرد کی طرح روحِ انسانی رکھتی ہے اور کیا اس کی روح موت کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ آخر وہ بہت سی بحث اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ چونکہ عورت کی روح انسان اور حیوان کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے سوائے حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی روح کے کسی عورت کی روح ہمیشہ نہیں رہے گی لے

مندرجہ بالا آراء سے یہ امر بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ بعض جاہل اور بے خبر لوگ جو کبھی کبھی اسلام پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ تو مردوں کا دین ہے نہ کہ عورتوں کا، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ اگر اسلام کے کچھ قانون عورت اور مرد کے جسمانی اور نفسانی فرق کی وجہ سے معاشرے کی ذمہ داریوں کے حوالے کسی قدر مختلف ہیں، تو وہ کسی صورت میں بھی عورت کی حقیقی اور باطنی قدر و منزلت کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ اس لیے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کے لیے نیک بختی اور سعادت کے دروازے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ہم اس آیت کی بحث میں پڑھ چکے ہیں بعضکم من بعض (تم سب کے سب ایک ہی جنس اور ایک ہی معاشرے کے فرد ہو)۔

۱۹۶۔ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝

۱۹۷۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

۱۹۸۔ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ ۝

ترجمہ

۱۹۶ کافروں کا شہروں میں (کامیابی سے) آنا جانا تمہیں دھوکا نہ دے۔

۱۹۷ یہ متاعِ ناچیز ہے پھر ان کے لیے رہنے کی جگہ دوزخ ہے اور (دوزخ) کتنی بری جگہ ہے۔

۱۹۸ لیکن وہ لوگ (جو ایمان لے آئے ہیں اور) اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے لیے باغات بہشت ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ان کے لیے خدا کی طرف سے پہلی پذیرائی ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مشرکین مکہ تجارت پیشہ تھے۔ اس تجارت سے انہیں بہت سی دولت میسر آئی اور وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کرتے

لے کتاب درد و مرگ مارک، عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمدؐ، حقوق زن در اسلام اور سلسلے کی دیگر کتب ملاحظہ فرمائیے۔



تھے۔ مدینہ کے یہودی بھی تجارت میں مہارت رکھتے تھے۔ تجارتی سفروں سے اکثر وہ بھرے ہاتھوں واپس لوٹتے تھے مسلمان ان دنوں مخصوص حالات کی وجہ سے مادی طور پر بڑی زحمتوں اور مشکلوں میں گرفتار تھے۔ ان مشکلات کی وجوہ میں مکہ سے مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت اور طاقتور دشمن کی طرف سے اقتصادی محاصرہ اور بائیکاٹ شامل ہیں مسلمان عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بعض لوگ جب یہ دو مختلف حالتوں کی طرف دیکھتے تو سوچتے کہ بے ایمانوں کے لیے یہ ناز و نعمت اور اہل ایمان کے لیے یہ رنج والم آخر کیوں ہے؟ مسلمان کیوں فقر و پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات اسی سوال کا جواب ہیں۔

تفسیر

ایک تکلیف دہ سوال

شانِ نزول میں جو سوال سامنے آیا ہے وہ زمانۂ پیغمبرؐ کے مسلمانوں کے حسب حال ہے۔ یہ دراصل ایک عمومی سوال ہے جو ہر دور میں اکثر لوگ پوچھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ظالموں، سرکشوں، فرعونوں کی خوشحالی اور ناز و نعمت سے معمور زندگی کا موازنہ ایسے اہلِ ایمان سے کرتے ہیں جن کی زندگی مشقت و زحمت ہی سے بھری ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بُرے لوگ اپنی ظالمانہ اور گناہ آلود زندگی کے باوجود خوشحال کیوں ہیں لیکن اہلِ ایمان اپنے ایمان و تقویٰ کے باوصف سختی و تنگی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ چیز کمزور ایمان والوں میں شک و شبہ پیدا کرتی ہے۔

اس سوال کا اگر بغور جائزہ لیا جائے اور اس کے دونوں پہلوؤں پر گہری نظر کی جائے تو واضح اور روشن جوابات سامنے آئیں گے جن میں سے بعض کی طرف آیۂ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مزید توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو دوسرے جوابات بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

آیت کہتی ہے: لا یغرنک تقلب الذین کفروا فی البلاد ــ مختلف شہروں میں کافروں کی کامیابی سے آمد و رفت تجھے ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے۔ اگرچہ ظاہراً آیت میں رسول اللہؐ مخاطب ہیں لیکن واضح ہے کہ مقصود تمام مسلمان ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے: متاع قلیل ــ یہ کامیابیاں اور یہ بلاشرط مادی فائدے جلد گزر جانے والے اور ناچیز ہیں۔

ثم مأوٰھم جھنم و بئس المھاد ــ ان کامیابیوں کے پیچھے ان کے لیے انجامِ بد اور ایسی ذمہ داریاں ہیں جو ان کا دامن پکڑے رہیں گی اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ کیسا بُرا ٹھکانا ہے۔

مندرجہ بالا آیت درحقیقت دو نکتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے:

پہلا یہ کہ سرکشوں اور ظالموں کی بہت سی کامیابیوں کا دائرہ محدود ہے۔ جیسے بہت سے اہلِ ایمان کی محرومیاں اور تکلیفیں بھی محدود ہیں۔ اس امر کا گواہ اسلام کا ابتدائی دور ہے۔ اس میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کی حالت ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت حکومتِ اسلامی بالکل نوساختہ تھی۔ طاقتور دشمنوں کی طرف سے ان پر طوفان آپڑے تھے۔ انہیں ڈرایا دھمکایا جاتا تھا۔ اس لیے حکومتِ اسلامی کے پر و بال سمٹے ہوئے تھے۔ خصوصاً مکہ کے مسلمانوں کی ہجرت کی وجہ سے وہ مسلمان جو انتہائی کم تعداد میں



تھے بالکل ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ کیفیت صرف انہی سے مخصوص نہ تھی بلکہ وہ تمام لوگ جو کسی ایک بنیادی اور روحانی انقلاب کے حامی ہوں اور ایک فاسد معاشرے میں رہتے ہوں انہیں محرومیت کے ایک شدید دور سے گزرنا پڑتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ حکومتِ اسلامی کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور اس کی شاخیں قوی ہو گئیں۔ اسلامی ملک میں دولت کا سیلاب امنڈ آیا اور عیش و عشرت میں رہنے والے بدترین دشمن خاکِ سیاہ پر جا بیٹھے۔ آیت میں اسی صورت حال کو "متاع قلیل" کہا گیا ہے۔

دوسرا یہ کہ بعض بے ایمانوں کی مادی ترقی اس لیے بھی ہے کہ وہ دولت سمیٹنے میں کسی اصول اور قانون کے قائل نہیں ہوتے اور اور جائز ناجائز ہر طریقے سے، یہاں تک کہ بے کسوں کا خون چوس کر بھی دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں جبکہ اہلِ ایمان حق و عدالت کے اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹنے پر پابندیاں ہونا بھی چاہئیں۔ اس لیے دونوں کے حالات کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اہلِ ایمان کو ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے جبکہ بے ایمانوں کی نظر میں کوئی ذمہ داری نہیں اور چونکہ یہ دنیا ارادہ و اختیار کی آزادی کی دنیا ہے اس لیے خدا تعالیٰ نے دونوں گروہوں کو آزاد چھوڑ رکھا ہے تاکہ ہر ایک کا انجام اس کے عمل کی روشنی میں مرتب ہو سکے۔ اسی امر کی طرف آیۂ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے ـــ

ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ

قوت اور ضعف کے پہلو

بعض بے ایمان افراد کی ترقی اور بعض ایمان والوں کی پسماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایمان نہ رکھنے کے باوجود پہلے گروہ میں قوت کے بعض پہلو موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ اہم کامیابیاں حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے گروہ میں ایمان کے باوجود کمزوری کے بعض پہلو موجود ہیں جو ان کی پسماندگی کا سبب ہیں۔

مثلاً ہم بعض ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو خدا سے بیگانہ ہیں لیکن امورِ زندگی میں جدوجہد اور استقامت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور حالاتِ زمانہ سے آگاہی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ یقیناً مادی زندگی میں کامیابیاں حاصل کریں گے۔ درحقیقت یہ لوگ دین سے وابستہ ہوئے بغیر اس کے کچھ بنیادی اصولوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ان کے مقابلے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو عقائدِ مذہبی کے تو پابند ہیں لیکن اس کے بہت سے عملی احکامات کو بھولے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کم حوصلہ، بے حال، استقامت سے عاری، بالکل منتشر اور ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ لہٰذا مسلّم ہے کہ ایسے لوگوں کو دنیاوی زندگی میں پے در پے شکستوں کا سامنا ہوگا۔ ان کی یہ شکست ایمان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کمزور پہلوؤں کی بنا پر ہے جو ان میں موجود ہیں۔ بعض اوقات وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فقط نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے انہیں تمام کاموں میں کامیابی حاصل ہو جانا چاہیے۔ جبکہ دین زندگی کی پیش رفت کے لیے عملی پروگرام لے کر آیا ہے۔ جسے فراموش کر دینے سے شکست اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دونوں گروہوں کے کچھ قوی اور کچھ ضعیف پہلو ہیں جن میں سے ہر ایک کے اپنے اثرات ہیں البتہ کبھی کبھار محاسبہ کرتے وقت یہ اثرات ایک دوسرے سے مشتبہ ہو جاتے ہیں۔



مثلاً ایک بے ایمان شخص جو مسلسل محنت و مشقت کرتا ہے وہ اطمینان قلب و روح، اعلیٰ انسانی مقاصد اور پاکیزہ خیالات و جذبات سے عاری ہوتا ہے لیکن چونکہ شوق اور استقامت سے کام کرتا ہے لہٰذا مادی زندگی میں آگے نکل جاتا ہے۔

یہاں بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ بے ایمان شخص دنیاوی زندگی میں کیوں کامیاب ہوگیا ہے گویا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کامیابی کا کوئی اور عامل تھا۔

اب یہ بات جیسے ایک فرد پر صادق آتی ہے اسی طرح اسے ایک ملک پر بھی منطبق کیا جاسکتا ہے ضمنی طور پر یہ امر بھی واضح رہنا چاہیے کہ بے ایمان اشخاص کی کامیابی کے تینوں مذکورہ عوامل یعنی جدوجہد، ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور حالاتِ زمانہ پر نظر، سب ایک ہی جگہ صادق نہیں آتے بلکہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص موقع و محل کے ساتھ مخصوص ہے۔

لکن الذین اتقوا ربھم لھم جنات تجری من تحتھا الانھر خالدین فیھا۔

گذشتہ آیت میں بے ایمان افراد کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس آیت میں پرہیزگاروں کے انجام کا تذکرہ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: لیکن وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی (اور انہوں نے مادی سرمائے کے حصول کے لیے حق و عدالت کے اصول ملحوظِ نظر رکھے یا خدا پر ایمان رکھنے کی بناء پر اپنے وطن سے نکال دیے گئے اور اجتماعی و اقتصادی مشکلات کا شکار ہوئے) انہیں ان مشکلات کے صلے میں خدا تعالیٰ نے باغاتِ بہشت عطا کیے ہیں کہ جن کے درختوں تلے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

نزلا من عند اللہ و ما عند اللہ خیر للابرار

لغت میں " نزل " کا معنی ہے " ایسی چیز جو مہمان کی ضیافت کے لیے پیش کی جائے "۔ بعض کہتے ہیں اس کا معنی ہے " وہ پہلی چیز جو مہمان کی پذیرائی کے لیے پیش کی جائے " (مثلاً شربت یا پھل جو ابتداء میں مہمان کو پیش کیے جاتے ہیں)، اس لیے مندرجہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے: باغِ جنت میں مادی نعمتیں پرہیزگاروں کی ضیافت کا آغاز ہیں۔ باقی رہی اہم ترین اور عالی ترین ضیافت تو وہ روحانی اور معنوی نعمتیں ہیں جن کی طرف وما عند اللہ خیر للابرار (خدا کے پاس جو نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے) کے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۹۹- وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ

۱۹۹ اہل کتاب میں بعض ایسے افراد ہیں جو خدا پر اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے ایمان رکھتے ہیں، وہ خدا کے (حکم کے) سامنے خضوع کرتے ہیں اور آیاتِ الٰہی کو کم قیمت پر نہیں بیچتے۔ ان کا اجر و ثواب ان کے پروردگار



کے پاس ہے، خدا سریع الحساب ہے (وہ ان کے نیک اعمال کا جلدی سے حساب کرتا ہے اور انہیں اجر دیتا ہے)۔

شانِ نزول

بہت سے مفسّرین کے قول کے مطابق یہ آیت اہلِ کتاب کے مومنین کے بارے میں ہے، جنہوں نے ناروا تعصب سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اور مسلمانوں کی صفوں میں آشامل ہوئے ہیں۔ یہ لوگ عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک معقول تعداد پر مشتمل تھے۔

کچھ مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ آیت حبشہ کے رعیت پرور بادشاہ نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے اگرچہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

ماہ رجب ۹ھ ہجری میں نجاشی کی وفات کی خبر ایک خدائی الہام کے ذریعے روزِ وفات ہی آنحضرتؐ کو پہنچی۔ رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے فرمایا:

> تمہارا ایک بھائی سرزمینِ حجاز سے باہر دنیا سے چل بسا ہے۔ تم جمع ہو جاؤ تاکہ مسلمانوں کے حق میں اُس نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اُس کے صلے میں اس کی نمازِ جنازہ پڑھیں۔

بعض نے سوال کیا: وہ کون ہے؟

آپؐ نے فرمایا: نجاشی۔

پھر آپ مسلمانوں کے ہمراہ قبرستان جنت البقیع میں آئے اور اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی اور اس کے لیے دُعائے مغفرت کی۔ آپؐ نے اپنے اصحاب کو بھی حکم دیا اور انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

بعض منافقین کہنے لگے: محمد (ص) نے ایک ایسے کافر کی نمازِ جنازہ پڑھی ہے جسے کبھی نہیں دیکھا، حالانکہ اس نے ان کا دین قبول نہیں کیا۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا[1]

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجاشی نے مکمل طور پر اسلام قبول کر لیا تھا اگرچہ وہ اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

تفسیر

سب اہلِ کتاب ایک جیسے نہیں

---

[1] اسباب النزول از واحدی

وان من اھل الکتاب لمن یؤمن باللہ

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں جو گفتگو ہے اس میں کبھی بھی سب کو ایک جیسا قرار نہیں دیا گیا۔ قرآن کا یہ طریق کار ہے کہ وہ کسی قوم یا جماعت کے بارے میں ضد اور تعصب کا رنگ اختیار نہیں کرتا بلکہ اس کا فیصلہ ان کے لائحہ عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اس اقلیت کو فراموش نہیں کرتا جو ایمان اور عملِ صالح کی حامل ہو اور گمراہ اکثریت کے درمیان زندگی گزار رہی ہو۔ یہاں بھی اہلِ کتاب کو بہت زیادہ سرزنش کی گئی کیونکہ وہ آیاتِ خدا کو چھپاتے تھے اور سرکشی اختیار کرتے اور پھر ان میں سے اُس اقلیت کا تذکرہ ہے جس نے پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کو قبول کر لیا تھا۔ ان لوگوں کی پانچ ممتاز صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔

۱ یؤمن باللہ ــــ وہ ایسے لوگ ہیں جو دل و جان سے خدا پر ایمان لے آتے ہیں۔

۲ وما انزل الیکم ــــ اور قرآن پر اور جو کچھ تم مسلمانوں پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں۔

۳ وما انزل الیھم ــــ درحقیقت پیغمبر اسلامؐ پر ان کے ایمان لانے کی وجہ اپنی آسمانی کتاب پر ان کا حقیقی ایمان ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بشارتیں موجود ہیں۔

۴ خاشعین للہ ــــ فرمانِ خدا کے سامنے وہ سرِ تسلیم خم کیے ہوتے ہیں اور یہ ان کا خشوع و خضوع ہی ہے جس نے حقیقی ایمان اور جاہلانہ تعصبات میں حدِ فاصل کھینچی ہے۔

۵ لا یشترون بایٰت اللہ ثمنا قلیلا ــــ وہ آیاتِ الٰہی کو کبھی کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے اور وہ ایسے علماءِ یہود کی طرح نہیں جو اپنے منصب کے تحفظ کے لیے لوگوں پر اپنے اقتدار کی بقاء کے لیے اور رشوت لے کر آیاتِ خدا میں تحریف کر دیتے ہیں۔ واضح ہے کہ مطلب یہ نہیں کہ کم قیمت پر فروخت نہیں کرتے بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرتے۔ کم قیمت کی طرف اشارے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان علماء کی طرح نہیں ہیں جو دنیا پرست اور کم ہمت ہیں۔ علاوہ ازیں ان آیات کے مقابلے میں جو کچھ بھی وصول کیا جائے بے وقعت ہے۔

اولٰئک لھم اجرھم عند ربھم

جن لوگوں کا اپنے پروردگار کے ہاں واضح و زندہ لائحہ عمل اور اعلیٰ انسانی صفات کی بنا پر اجر و ثواب ہے ان کے لیے یہاں "ربھم" کا لفظ ان پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا مظہر ہے نیز یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ راہِ ہدایت میں اللہ تعالیٰ ان کی تربیت اور مدد کرتا ہے۔

ان اللہ سریع الحساب

خدا تعالیٰ بڑی تیزی سے بندوں کا حساب بے باق کر دے گا۔ نہ نیکوکاروں کو اپنا اجر و ثواب معلوم کرنے کے لیے مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اور نہ بدکاروں کی سزا میں تاخیر ہوگی۔ یہ جملہ نیکوں کے لیے بشارت اور بدکاروں کے لیے تنبیہ و تہدید کی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

---

[1] اس جملے کی مزید توضیح کے لیے سورہ بقرہ آیہ ۲۰۲ کی تفسیر کی طرف رجوع کریں۔



۲۰۰۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ ع

ترجمہ

۲۰۰ اے ایمان والو! (مشکلات اور ہوا و ہوس کے مقابلے میں) استقامت و پامردی دکھاؤ اور دشمنوں کے مقابلے میں (بھی) استقامت کا مظاہرہ کرو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور خدا سے ڈرو شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔

تفسیر

یہ سورہ آل عمران کی آخری آیت ہے۔ اس میں چار نکات پر محیط ایک جامع لائحہ عمل تمام مسلمانوں کے لیے پیش کیا گیا ہے، اسی لیے اس کا آغاز "یاایھا الذین امنوا" سے ہوا ہے۔

۱ اصبروا — یہ اس پروگرام کا پہلا نکتہ ہے جو کہ مسلمانوں کی سربلندی اور کامیابی کا ضامن ہے۔ اس کا مطلب استقامت و صبر اور حوادث کے مقابلے میں ڈٹ جانا ہے۔ دراصل صبر و استقامت ہی ہر قسم کی مادی و روحانی کامیابی کی حقیقی جڑ ہے۔ اجتماعی و انفرادی پیش رفت کے لیے اس کی جس قدر اہمیت بیان کی جائے وہ کم ہے اسی کو حضرت علیؑ نے کلمات قصار میں بدن کے ساتھ سر سے تشبیہ دی ہے فرماتے ہیں:

ان الصبر من الایمان کالراس من الجسد

یعنی — صبر کا ایمان سے وہی تعلق ہے جو سر کا بدن سے ہے۔

۲ وصابروا — یہ "مصابرہ" سے مفاعلہ کے باب سے ہے۔ اس کا معنی ہے دوسروں کے صبر و استقامت کے مقابلے میں صبر و استقامت دکھانا۔

اس طرح خدا تعالیٰ پہلے تو صاحبانِ ایمان کو صبر و استقامت کا حکم دیتا ہے (جس میں ہر طرح کا جہاد نفس اور مشکلات حیات شامل ہیں) اور دوسرے مرحلے میں دشمن کے مقابلے میں استقامت کا حکم دیتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم جہاد بالنفس اور اندرونی کمزوری کے پہلوؤں کی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوتی دشمن پر اس کی کامیابی ممکن نہیں ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں ہماری زیادہ تر شکستیں اسی وجہ سے ہیں کہ جہاد بالنفس نہیں کیا گیا اور اپنے کمزور پہلوؤں کی اصلاح نہیں کی گئی جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

ضمنی طور پر اس حکم (صابروا) سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن جس قدر زیادہ استقامت کا مظاہرہ کرے ہمیں اس سے بڑھ کر استقامت و پامردی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

۳ ورابطوا — اس لفظ کا مادہ "رباط" ہے۔ اس کا معنی ہے "کسی چیز کو کسی مکان میں باندھ دینا (مثلاً گھوڑے



کو کسی جگہ باندھنا)، اسی لیے سرائے یا کاروانوں کے ٹھہرنے کی جگہ کو رباط کہتے ہیں۔ ربط قلب کا مطلب ہے دل کا اطمینان اور سکونِ خاطر، گویا وہ کسی جگہ بندھا ہوا ہے۔ مرابطہ کا معنی ہے سرحدوں کی نگرانی کرنا کیونکہ وہاں سپاہی، سواریاں اور جنگی وسائل فراہم کیے جاتے ہیں اور انہیں وہاں رکھا جاتا ہے۔

یہ لفظ مسلمانوں کو دشمن کے مقابلے کے لیے تیار رہنے اور اسلامی ملکوں کی سرحدوں کی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ دشمن ان پر بے خبری کے عالم میں اچانک حملہ نہ کردے۔ نیز انہیں شیطان اور سرکش ہوا و ہوس کے مقابلے کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہنے اور ان کے ہتھکنڈوں سے چوکنا رہنے کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ غفلت میں نہ پڑ جائیں۔

اسی لیے بعض روایتوں میں ہے کہ امیر المومنین علیؑ نے اس لفظ کی تفسیر ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی پابندی اور انتظار کی ہے کیونکہ جو شخص عبادت کے ذریعے اپنے دل و جان کو ہمیشہ اور لگاتار بیدار رکھے وہ ایسے سپاہی کی مانند ہے جو ہر وقت دشمن سے مقابلے کے لیے تیار (ATTENTION) ہو۔

غرضیکہ رابطہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو اپنی ذات اور اسلامی معاشرے کے دفاع کی تیاری پر محیط ہے۔ چنانچہ فقہ اسلامی کے باب جہاد میں ایک بحث "مرابطہ" (یعنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے دشمن کے احتمالی حملے کے مقابلہ کے لیے آمادگی) کے عنوان سے ہے۔ جس میں خاص خاص احکام بیان کیے گئے ہیں۔

بعض روایات میں علمائے کرام کو بھی "مرابط" کہا گیا ہے چنانچہ ایک روایت کے مطابق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

علماء شیعتنا مرابطون فی الثغر الذی یلی ابلیس وعفاریتہ ویمنعون عن الخروج علی ضعفاء شیعتنا وعن ان یتسلط علیھم ابلیس

ہمارے شیعہ علماء سرحدوں کی حفاظت اور نگرانی کرنے والوں کی طرح ہیں، جو شیطان کی فوج کے سامنے صف باندھے کھڑے ہیں اور ان لوگوں کا شیطان اور اس کی فوج کے حملے کا دفاع کرتے ہیں جو ان کے حملہ کی تاب نہیں لا سکتے [1]

اس حدیث کے ذیل میں علمائے کرام کا مرتبہ اور شان سرحدوں کی حفاظت کرنے والے افسروں اور سپاہیوں کے مقابلے میں جو اسلام کے دشمنوں سے جنگ کر رہے ہیں کہیں بڑھ کر بیان کی گئی ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ علماء، عقائد و ثقافتِ اسلامی کے نگہبان ہیں۔ جبکہ فوج جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے اور یہ طے شدہ امر ہے کہ جس قوم کے عقیدے، فرہنگ اور ثقافت دشمنوں کے حملے کی زد میں ہو اور وہ ان کا قرار واقعی دفاع نہ کر سکے تو وہ جلد ہی سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے بھی شکست کھا جائے گی۔

۴ واتقوا اللہ اور آخری حکم جو تمام احکامات پر سایہ فگن ہے وہ پرہیزگاری کا حکم ہے۔ استقامت، صبر اور رابطہ

---

[1] احتجاج طبرسی جلد اول۔



کے ساتھ ساتھ تقوٰی اور پرہیزگاری کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے تاکہ ہر قسم کی خود پسندی، ریاکاری اور شخصی اغراض قریب تک نہ پائیں۔ لعلکم تفلحون تم ان چاروں حکموں کی پابندی کے سائے میں فلاح و کامیابی حاصل کرسکتے ہو اور ان سے روگردانی کرکے کامیابی کا راستہ تم پر بند ہو جائے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے جملے لفظ "لعل" سے کیوں شروع ہوتے ہیں مثلاً "لعلکم تفلحون" شاید تم کامیاب ہو جاؤ "لعلکم تتقون"۔ شاید تم پرہیزگار بن جاؤ۔ "لعلکم ترحمون" شاید رحمتِ خدا تمہارے شاملِ حال ہو۔

جبکہ لفظ لعل تردید اور شک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ تو ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس لیے اس کی ذات اقدس کے لیے مناسب نہیں۔ یہ جملہ بعض دشمنانِ اسلام نے بھی دستاویز بنا رکھا ہے۔ وہ اس کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اسلام کسی سے قطعی اور یقینی نجات کا وعدہ نہیں کرتا، اس کے وعدے میں شک و شبہ پایا جاتا ہے کیونکہ اس کے اکثر وعدے "لعل" سے شروع ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر قرآن مجید کی عظمت حقیقت مبنی اور اظہار حق کی ایک واضح دلیل ہے کیونکہ قرآن یہ لفظ ایسی جگہ استعمال کرتا ہے جہاں نتیجہ حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط کی پابندی ضروری ہو اور وہ لفظ "لعل" کے ذریعے ان شرطوں کی طرف اجمالی اشارہ کرتا ہے مثلاً آیات قرآن سننے کے وقت خاموش رہنا اور آیات کے مضمون کو کان لگا کر سننا انسان کے لیے رحمت خداوندی کا مستحق ہونے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے علاوہ آیتوں کا سمجھنا اور ان پر کاربند ہونا لازمی اور ضروری ہے اسی لیے قرآن فرماتا ہے:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون (اعراف: ۲۰۴)

جس وقت قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموشی اختیار کرو، ہو سکتا ہے کہ خدا کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہو جائے۔

اگر قرآن یہ کہتا کہ یقیناً تم رحمتِ الٰہی کے مستحق ہو جاؤ گے تو یہ حقیقت سے دور ہوتا۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے تحریر کرچکے ہیں کہ اس امر کی کچھ اور بھی شرطیں ہیں۔ لیکن جب وہ "لعلکم" فرماتا ہے تو باقی شرطوں کا حصہ محفوظ رہ جاتا ہے اس حقیقت کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے اعتراض کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ یہاں تک کہ بعض ہمارے علماء بھی اس بات کے معتقد ہوگئے کہ لفظ "لعل" ایسے موقعوں پر "شاید" کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ قرآن کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

زیرِ بحث آیت میں بھی باوجودیکہ اسلام کے اعلیٰ ترین احکام میں سے چار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر بھی اس بنا پر کہ کہیں دوسرے اسلامی اصلاحی منصوبوں سے غفلت نہ برتی جائے، لفظ "لعل" استعمال کیا گیا ہے۔

بہر حال اگر آج کے مسلمان مندرجہ بالا آیت کو ایک شعار اسلامی کے حوالے سے اپنی زندگی کے پروگراموں میں شامل کرلیں تو



بہت سی مشکلیں دُور ہو جائیں گی جن کا انہیں اس وقت سامنا ہے۔ آج اسلام اور مسلمانوں پر جو حملے کیے جا رہے ہیں وہ سب ان چاروں یا ان میں سے بعض احکام سے غفلت برتنے یا انہیں بھلا دینے کی وجہ سے ہیں اور یہ ایک انتہائی تکلیف دہ صورت حال ہے۔ اگر مسلمانوں میں استقامت و استقلال کی روح زندہ و بیدار ہو جائے، تو وہ دشمنوں کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر کوشش کر سکیں گے۔

حکم خداوندی کے مطابق مرابطہ یعنی جغرافیائی، ثقافتی اور اعتقادی سرحدوں کی بھرپور دیکھ بھال اور حفاظت کریں۔ ہر وقت دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں اور ان سب باتوں کے علاوہ انفرادی و اجتماعی طور پر تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعے گناہ و فساد کو اپنے معاشرے سے ختم کر دیں تو یقیناً ان کی کامیابی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

اے خدائے بزرگ و برتر ہم سب کو یہ توفیق عطا فرما کہ ہم تیری آسمانی کتاب کے ان حیات بخش احکام کو اپنی چند روزہ زندگی میں اپنا لیں اور اپنی غیر محدود رحمت اور الطاف بے پایاں کو ہمارے شامل حال فرما۔ آمین۔





سورۃ نساء

مدنی سورۃ ہے جس کی ایک سو ستتر ۱۷۷ آیات ہیں



سُورۃ نساء

آیاتِ سورہ کی تفسیر سے پہلے چند نکات پر توجہ ضروری ہے۔

۱۔ سورۂ نساء کا محلِ نزول

بعض مفسّرین کے مطابق اس سورہ کی تمام آیتیں (سوائے آیت ۵۸ کے) مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں۔ ترتیب ونزول کے لحاظ سے یہ سورہ سورۂ ممتحنہ کے بعد ہے۔ قرآن مجید پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی سورتوں کی موجودہ ترتیب ان کے نزول کے مطابق نہیں ہے۔ چنانچہ بہت سی سورتیں جو مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہیں وہ قرآن کے آخر میں ہیں اور بہت سی ایسی سورتیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں وہ قرآن مجید کے شروع میں ہیں۔ البتہ جس طرح ہم جلد اوّل کے شروع میں لکھ چکے ہیں کہ ایسے مدارک اور اسناد ہمارے پاس موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن کی سورتوں کی جمع اور موجودہ ترتیب خود حضرت رسول اکرمؐ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ اس بنا پر قرآن کو جمع کرتے وقت خود حضرت ختمی مرتبت نے مختلف وجوہات کی وجہ سے جن میں سے ایک مطالب کی اہمیت اور ان کی ترتیب طبعی ہے، موجودہ ترتیب میں جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس ترتیب کے مطابق پہلی سورت "الحمد" اور آخری سورۃ "الناس" ہے۔ اس میں کوئی لفظ بلکہ حرف تک کسی آیت یا سورت میں کم و بیش نہیں ہوا۔ یہ سورہ آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد کے لحاظ سے سورۂ بقرہ کے بعد طویل ترین سورت ہے اور ۱۷۶ آیات پر مشتمل ہے۔ اس امر کے پیش نظر کہ اس میں بہت سے مباحث عورتوں کے احکام اور حقوق کے بارے میں ہیں اس کا نام "سورۂ نساء" رکھا گیا ہے۔

۲۔ اس سورہ کے اہم موضوعات

ہم یہ تحریر کر چکے ہیں کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ یعنی عین اس وقت جب رسالت مآبؐ حکومتِ اسلامی کی تاسیس اور ایک صحیح انسانی معاشرے کی تشکیل میں مصروف تھے۔ اسی بنا پر بہت سے قوانین جو معاشرے کو راہِ راست پر لانے کے لیے مؤثر تھے، اس سورت میں نازل ہوئے ہیں۔ چونکہ وہ افراد جو اس معاشرے کی تار و پود کی تشکیل میں لگے ہوئے تھے کل ایسے بت پرست تھے جو زمانہ جاہلیت کی تمام آلودگیوں میں ملوث رہ چکے تھے، اس لیے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ پہلی رسوماتِ بد کو ان کی روح اور دماغ سے نکالا جائے اور ان کی بجائے ایسے قانون اور منصوبے جو ایک فرسودہ نظام کی بجائے ضروری ہیں، بنائے جائیں۔

اس سورہ کی مباحث کو تین عمومی حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایمان وعدالت، [illegible] اور بدترین دشمنوں کا بائیکاٹ۔

۲۔ بُرے معاشرے کا نتیجہ اور انجام بھانے کے لیے گزرے ہوئے لوگوں کے حالاتِ زندگی سے روشناس کرانا۔

۳۔ امداد کے مستحق افراد کی حمایت مثلاً یتیم اور ان کے حقوق کے متعلق ضروری احکامات۔



۴۔ میراث کا قانون طبیعی، فطری اور عادلانہ طریقے کی بنیاد پر اس صورت کے خلاف جو اس زمانے میں رائج تھی، جس کے ذریعے نہایت تکلیف دہ حیلے بہانوں سے کمزور لوگوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔

۵۔ شادی بیاہ کے متعلق قانون اور عام پاک دامنی کی حفاظت کے لیے لائحۂ عمل۔

۶۔ اموال کی حفاظت کے لیے کلی اور عمومی قوانین۔

۷۔ معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی خاندان کی حفاظت اور بہبودی کا پروگرام۔

۸۔ لوگوں کے ایک دوسرے کے مقابلے میں متقابل حقوق اور ذمہ داریاں۔

۹۔ اسلامی معاشرے کے دشمنوں کا تعارف اور ان کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو بیدار رہنے کی تلقین۔

۱۰۔ حکومت اسلامی اور حکومت اسلامی کے رہبر کی اطاعت اور فرمانبرداری کا لزوم۔

۱۱۔ مسلمانوں کو واضح دشمنوں سے مقابلے اور ان سے جنگ کے لیے ابھارنا۔

۱۲۔ ایسے دشمنوں کی پہچان جو ڈھکے چھپے سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

۱۳۔ ہجرت کی اہمیت اور اس کا ضروری ہونا جبکہ فاسد اور بُرے معاشرے کا سامنا کرنا پڑے۔

۱۴۔ میراث کے متعلق مباحث اور جمع شدہ دولت کی وارثوں میں تقسیم۔

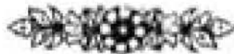
اس سورت کی تلاوت کی فضیلت

ایک روایت کے مطابق حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص سورۂ نساء کی تلاوت کرے گویا اس نے اس قدر مال وزر راہ خدا میں دیا ہے جتنا کہ سورہ نساء کے لحاظ سے بطور وارث ہر ایک مسلمان کا حصہ ہے اور اسی طرح اُسے اس شخص کے برابر ثواب دیا جائے گا جس نے ایک غلام آزاد کیا ہو۔

واضح ہے کہ اس روایت میں اور اس قسم کی دوسری تمام روایتوں میں صرف آیتوں کا پڑھنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ پڑھنا تو سمجھنے کے لیے مقدمہ اور تمہید ہے اور وہ بھی اپنے مقام پر۔

یہ ایک قدم ہے اُسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنانے کے لیے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس سورہ کی آیات سے اپنی زندگی میں عملی نصیحت حاصل کرے تو وہ یہ تمام اجر وثواب دنیاوی نتائج کے علاوہ حاصل کرے گا۔





بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیۡكُمۡ رَقِیۡبًا ○

ترجمہ

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۱۔ اے لوگو! اپنے پالنے والے سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی انسان سے پیدا کیا اور اس کی بیوی کو بھی اس کی جنس سے خلق فرمایا اور ان دونوں سے ان گنت مرد اور عورتیں (روئے زمین پر) پھیلا دیں۔ اس خدا سے ڈرو جس کی عظمت اور بزرگی کا تم سب اعتراف کرتے ہو اور جب کوئی چیز ایک دوسرے سے مانگتے ہو تو اسی کے نام سے لیتے ہو۔ (نیز) اپنے رشتہ داروں کے بارے میں (قطع تعلق کرنے سے) پرہیز کرو۔ کیونکہ خداوند عالم تمہارا نگہبان ہے۔

تفسیر

طبقاتی تقسیم اور گروہ بندی کے خلاف جہاد

یاایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ

اس سورہ کی پہلی آیت میں تمام انسانی افراد سے خطاب ہے کیونکہ یہ سورہ ایسے مسائل پر مشتمل ہے جن کے تمام لوگ اپنی زندگی میں محتاج ہیں۔

اس کے بعد تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت ہے جو کسی معاشرے کو صحیح و سالم اور صحت مند بنانے کے پروگراموں کی بنیاد ہے ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، میراث کی عادلانہ تقسیم، یتیموں کی حمایت، گھریلو حقوق کی حفاظت اور اسی طرح کے منصوبے ایسے ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی مدد کے بغیر کامیابی کی بلندی کو نہیں چھو سکتے۔



اسی لیے اس سورت کو جو ایسے تمام مسائل پر محیط ہے تقویٰ کی دعوت سے شروع کیا گیا ہے۔
وہ خدا تعالیٰ جو انسان کے سب اعمال کو دیکھنے والا اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا ہے اس سورہ کو تقویٰ کی دعوت کے ساتھ شروع کرتا ہے۔
وہ خدا جو انسان کے تمام اعمال کا ناظر ہے تعارف کے طور پر انسان کی ایک ایسی صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسانی معاشرے کی وحدت و یگانگی کی جڑ ہے۔

الذی خلقکم من نفس واحدۃ

وہ خدا جس نے تمام انسانوں کو ایک انسان سے پیدا کیا۔ اس بنا پر وہ خیالی اور وہمی امتیاز و افتخار جو ہر ایک جماعت نے اپنے لیے گھڑ رکھے ہیں مثلاً امتیازات نسلی، لسانی، علاقائی، قبائلی اور اس قسم کے دوسرے امتیاز جو آجکل دنیا کی سوسائٹی میں ہزاروں خرابیوں کا سبب بنے ہوئے ہیں، ایک اسلامی معاشرے میں نہیں پائے جانے چاہئیں کیونکہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں اور ایک ہی گوہر سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس امر کو پیش نظر رکھا جائے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا معاشرہ چونکہ سب کا سب قبائلی تھا تو اس بات کی اہمیت خوب ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی تعبیرات قرآن حکیم کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں جن کی طرف اپنے اپنے مقام پر اشارہ کیا جائے گا۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ "نفس واحدہ" سے کون مراد ہے۔ کیا اس سے مراد ایک فرد شخص ہے یا ایک فرد نوعی یعنی (مذکر کی جنس)۔ اس میں شک نہیں کہ اس تعبیر کا ظاہری مفہوم تو واحد فرد کے بارے میں ہے اور یہ اس پہلے انسان کی طرف اشارہ ہے جسے قرآن آدم کے نام سے آج کے انسانوں کے باپ کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ بنی آدم کی تعبیر جو متعدد آیات قرآنی میں کی گئی ہے وہ بھی اسی طرف اشارہ ہے اور یہ احتمال کہ اس سے مراد وحدت نوعی ہے بعید معلوم ہوتا ہے۔

وخلق منها زوجها

یہ جملہ بظاہر یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی زوجہ محترمہ انہی سے پیدا ہوئی ہیں بعض مفسرین اس سے یہ سمجھے ہیں کہ حضرت آدمؑ کی بیوی حوا حضرت آدمؑ کے بدن سے پیدا ہوئی ہیں۔ کچھ معتبر روایتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ حضرت حوا آدمؑ کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں اور اس پر اس آیت کو گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔ (تورات کے سفر تکوین کی دوسری فصل بھی ان ہی معنوں کی وضاحت کرتی ہے) لیکن قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں شک و شبہ دور ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کی بیوی کو انہی کی جنس (جنس بشر) سے پیدا کیا۔
چنانچہ سورۂ روم کی آیت ۲۱ میں ہے:

ومن اٰیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها

قدرت خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری بیویاں تمہاری ہی جنس میں سے پیدا کی ہیں تاکہ تمہیں ان کی وجہ سے سکون حاصل ہو۔
سورۂ نحل کی آیت ۷۲ میں فرماتا ہے:



و اللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا

خدا نے تمہاری بیویاں تمہاری جنس میں سے بنائی ہیں۔

واضح ہو کہ ان دونوں آیتوں میں تمہاری بیویوں کو تم میں سے قرار دیا کے یہ معنی ہیں کہ انہیں تمہاری جنس سے قرار دیا نہ کہ تمہارے اعضائے بدن میں سے۔

اور اس روایت کے مطابق جو تفسیر عیاشی میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے حضرت حوّا کو حضرت آدمؑ کی پسلیوں میں سے خلقت کو غلط قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت حوا حضرت آدمؑ کی بچی ہوئی مٹی سے پیدا ہوئی ہیں۔

حضرت آدمؑ کے بچوں کی شادیاں کس طرح ہوئیں

و بث منھما رجالا کثیرا و نساء

یہ جملہ بتاتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کے بیٹوں کی نسل کی بہتات حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کے طریقہ سے ہی ظاہر ہوئی تھی اور اس میں کسی تیسرے وجود کا عمل دخل نہ تھا۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ کی اولاد (بھائی بہن) نے ایک دوسرے سے شادی کی۔ کیونکہ اگر انہوں نے کسی اور نسل کی بیویوں سے شادی کی ہو تو لفظ منھما ان دونوں پر صادق نہیں آتا۔

یہ موضوع بہت سی حدیثوں میں بھی آیا ہے اور کوئی زیادہ تعجب خیز بھی نہیں ہے۔

کیونکہ اس استدلال کے مطابق جو بعض حدیثوں میں ائمہ اہل بیتؑ سے مروی ہے یہ شادی بیاہ اس وقت مباح تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں بھائی بہن کی شادی کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ واضح ہے کہ کسی کام کی ممانعت کا دارو مدار اسی بات پر ہے کہ خدا کی طرف سے اس کی حرمت کا حکم آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے ایک کام ایک زمانے میں جائز ہو اور اس کے بعد حرام۔

مگر یہ بھی ہے کہ بعض دوسری حدیثوں میں اس مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت آدمؑ کے بیٹے بیٹیوں کی ایک دوسرے سے شادیاں نہیں ہوئیں۔ اور جو لوگ ایسے شادی بیاہ کا اعتقاد رکھتے ہیں ان پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

اگر یہ بنا ہو کہ حدیثیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اس لئے جو حدیث قرآن کے مطابق ہو اُسے درست سمجھا جائے تو پھر پہلی ہی بات کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان حدیثوں کا مفہوم مندرجہ بالا آیت کے عین مطابق ہے۔ یہاں ایک احتمال اور بھی ہے کہ یہ سوچا جائے کہ حضرت آدمؑ کے بیٹوں نے اپنے سے پہلے بچے کھچے انسانوں میں شادیاں کی تھیں۔

کیونکہ بعض روایات کے لحاظ سے حضرت آدمؑ روئے زمین کے پہلے انسان نہیں تھے۔ آج کا علمی مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ نوع انسانی تقریباً چند ملین سال پہلے کرۂ زمین پر زندگی بسر کرتی تھی جبکہ حضرت آدمؑ کی تاریخ پیدائش سے لے کر اب تک کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ بنا بریں ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے بھی دوسرے انسان زمین پر رہتے تھے جو ان کی پیدائش کے وقت ختم ہو رہے تھے تو اس امر میں کیا رکاوٹ ہے کہ حضرت آدمؑ کے بیٹوں نے اپنے سے پہلے باقی رہنے والے لوگوں میں سے کسی ایک خاندان میں



شادیاں کی ہوں [1]

لیکن ہم تحریر کر چکے ہیں کہ یہ احتمال بھی آیہ مندرجہ بالا کی ظاہری صورت کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ بہت بحث طلب معاملہ ہے۔ جو تفسیری بحث کی گنجائش سے خارج ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ

وہ اہمیت جو تقویٰ کو کسی صحیح معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے حاصل ہے۔ وہ اس بات کا سبب بنی ہے کہ لوگوں کو دوبارہ پرہیزگاری اور تقویٰ کی طرف بلایا جائے۔ البتہ یہاں پر ایک جملہ بڑھایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: خدا سے ڈرو، جو تمہاری نگاہ میں عظمت اور بزرگی کا مالک ہے اور تم جب کسی سے کوئی چیز مانگتے ہو تو اس کا نام لیتے ہو [2]

پھر کہتا ہے: والارحام

یہ لفظ اللہ پر عطف ہے۔ اسی لیے مشہور قرأت میں مفتوح و منصوب پڑھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے: واتقوا الارحام یعنی رشتہ داروں کی قطع رحمی سے ڈرو اور یہاں موضوع کا ذکر پہلے تو صلہ رحمی کی انتہائی اہمیت کا پتہ دیتا ہے کہ قرآن اس کا اس قدر قائل ہے کہ اس نے ارحام کا نام خداوند عالم کے نامِ نامی اور اسم گرامی کے ساتھ ساتھ لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس مطلب کی طرف اشارہ ہے جس کا آیت کے شروع میں ذکر ہوا ہے۔ وہ یہ کہ تم سب کا باپ اور ماں ایک ہی ہیں۔ درحقیقت سب آدمؑ کی اولاد آپس میں ایک دوسرے کی رشتہ دار ہے۔ یہ رشتہ اور ربط ضبط اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ تم سب انسانوں کے ساتھ چاہے وہ کسی نسل اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں اپنے کنبہ کے افراد کی طرح محبت کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔

رقیب اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بلند جگہ سے حالات کا جائزہ لے۔ اس کے بعد کسی چیز کے محافظ و نگہبان کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ نگہبانی کے لیے دیکھنا اور دیکھ بھال کرنا ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رقیب کی جگہ کی بلندی ظاہری نگاہ کے لحاظ سے ہو کہ وہ ایک بلند مقام پر بیٹھا ہوا نگرانی کر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ معنوی لحاظ سے ہو۔ مندرجہ بالا جملہ میں فرماتا ہے: خدا تمہارا رقیب ہے اور وہ تمہارے تمام اعمال اور نیتوں کو دیکھتا اور جانتا ہے۔ اور ضمناً یہ مفہوم بھی ہے کہ حوادث میں وہی تمہارا نگہبان بھی ہے۔

"کان" مندرجہ بالا جملے میں یہ لفظ جو کہ فعل ماضی ہے تاکید کے لیے ہے۔

---

[1] اجمالی طور پر دوسرے یا تیسرے نظریہ کو ترجیح دینا چاہیے خصوصاً جبکہ روایات بھی موجود ہیں۔ مزید برآں بہن بھائی کی شادی کسی معاشرے میں اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ یہاں تک کہ وہ معاشرے جو کسی دین کے پیرو بھی نہیں ہیں۔ آیت بھی نص نہیں ظاہر ہی ہے۔ ادھر موافقت اور رضا لغتِ عامہ کا اصول بھی ہے (مترجم)۔

[2] تسائلون تسائل کے مادہ سے ہے۔ جس کے معنی ایک دوسرے سے سوال کرنے کے ہیں۔ تسائل باللہ کے معنی یہ ہیں کہ لوگ جب ایک دوسرے سے کوئی چیز مانگیں تو اسئلک باللہ تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہتے ہیں اور یہ ان کی نظروں میں خداوند عالم کی عظمت کی نشانی ہے۔



۲۔ وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَھُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۝

ترجمہ

۲۔ یتیموں کے مال (جب وہ بالغ ہو جائیں) انہیں دے دو اور (اپنے) بُرے مال (یتیموں کے) اچھے مال سے تبدیل نہ کرو اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر یا تبدیل کر کے نہ کھاؤ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

شانِ نزول

بنی غطفان قبیلے کے ایک شخص کا بھائی بہت دولت مند تھا۔ وہ دنیا سے چل بسا تو اس کے بھائی نے اپنے یتیم بھتیجوں کی سرپرستی کے نام پر اس کے مال میں تصرف کیا۔ جس وقت اس کا بھتیجا بالغ ہو گیا تو اس نے اس یتیم کا حق دینے سے انکار کر دیا۔

جب یہ مقدمہ حضرت رسول اکرمؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس غاصب نے آیت سننے کے بعد توبہ کر لی اور مال اس کے مالک کو واپس کرتے ہوئے کہا:

اعوذ باللہ من الحوب الکبیر

میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ کہیں بڑے گناہ میں آلودہ نہ ہو جاؤں۔

تفسیر

یتیموں کے مال میں خیانت حرام ہے۔ ہر معاشرے میں نت نئے حوادث کی وجہ سے باپ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے رہ جاتے ہیں۔

البتہ بُرے معاشرے جو داخلی جنگ میں پھنسے رہتے ہیں۔ جیسے زمانہ جاہلیت کا عرب معاشرہ تھا ان میں یتیم بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، جنہیں حکومتِ اسلامی اور ہر ایک مسلمان کی حمایت اور سرپرستی میں رہنا چاہیے۔

آیت مذکورہ بالا میں یتیموں کے مال کے بارے میں تین اہم حکم دیئے گئے ہیں۔

۱۔ واٰتوا الیتامیٰ اموالھم۔ اس جملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب یتیم بالغ ہو جائیں تو ان کے مال ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یعنی ان کے اموال میں تمہارا تصرف صرف امین، ناظر اور وکیل کی حیثیت سے ہے نہ کہ مالک کے طور پر۔

۲۔ ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب۔ اور کبھی ان کے اعلیٰ اور پاکیزہ مال کو اپنے گھٹیا اور ناپاک مال سے تبدیل نہ کرو۔ یہ حکم تو اصل میں ظلم و ستم سے بچنے کے لیے ہے کیونکہ بعض اوقات یتیموں کے سرپرست اس بہانے سے کہ مال کی تبدیلی یتیم کے فائدے میں ہے یا اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر پڑ رہا ہے تو صحیح ہو جائے گا یہ کہہ کر یتیموں کے اچھے

اور خالص مال لے لیتے اور اپنے بُرے اور ناپسندیدہ مال ان کی جگہ رکھ دیتے تھے۔

۳۔ ولا تاکلوا اموالھم الی اموالکم اور ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ نہ کھاؤ۔ یعنی یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط ملط نہ کرو کہیں اس طریقے سے مقصد سب کو اپنی ملک بنانا ہو یا یہ کہ اپنے بُرے مال کو ان کے اچھے مال میں نہ ملاؤ کہ جس کا نتیجہ یتیموں کے حق کی پائمالی ہو۔

جملہ بالا میں "لفظ" الی دراصل "مع" (ساتھ) کے معنی میں ہے۔

انه کان حوبا کبیرا۔

آیت کے آخر میں اس امر کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے تاکید فرماتا ہے کہ یتیموں کے مال میں اس قسم کی ہیرا پھیری بہت بڑا گناہ ہے۔ راغب کتاب مفردات میں کہتا ہے: دراصل الحوبة ایسی ضرورت کے معنی میں ہے جو انسان کو گناہ کی طرف کھینچتی ہے۔

چونکہ سرپرستوں کے ظلم و ستم یتیموں کے مال پر زیادہ تر ضرورت و احتیاج کی وجہ سے یا اس بہانے سے ہوتے ہیں، اس لیے آیت مذکورہ میں لفظ "اثم" (گناہ) کی بجائے لفظ "حوب" استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو جائے۔

قرآن مجید کی مختلف آیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام اس امر کی بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے۔ چنانچہ وہ یتیموں کے مال میں خیانت کرنے والوں کو بڑی شدت کے ساتھ سزا کی دھمکی دیتا ہے۔ وہ قطعی، واضح اور محکم عبارتوں کے ساتھ سرپرستوں کو یتیموں کے اموال کی کڑی دیکھ بھال کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کی تفصیل چند آیتوں کے بعد اسی سورت میں اور سورۂ انعام کی آیت ۱۵۲ اور سورۂ اسریٰ کی آیت ۳۴ کے ذیل میں آئے گی۔

ان آیتوں کے سخت لب و لہجہ نے مسلمانوں کے دلوں پر اتنا اثر کیا کہ وہ اس سے بھی ڈرنے لگے کہ اپنے اور یتیموں کے لیے مشترکہ کھانا پکائیں۔ اس وجہ سے ان کا کھانا اپنے اور اپنے بچوں کے کھانے سے الگ پکواتے تھے اور یہ امر دونوں کی تکلیف کا سبب بنتا تھا۔ اس لیے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں انہیں یہ اجازت دی گئی کہ اگر ان کا مقصد اپنے مال یا کھانے کے ساتھ یتیموں کے مال اور کھانے کو مخلوط کرنے سے خیر خواہی اور اصلاح ہو تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مزید توضیح کے لیے سورۂ بقرہ کی اسی آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی دوسری جلد ملاحظہ فرمائیے۔

۳۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ

ترجمہ

۳ اور اگر تم کو اس بات کا ڈر ہو (کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کی صورت میں) ان سے انصاف نہ کر سکو گے تو (ان سے شادی



کرنے سے صرف نظر کرلو اور) دوسری پاک عورتوں سے نکاح کرو، دو یا تین یا چار بیویاں اور اگر تم کو ڈر ہو (کہ متعدد بیویوں کے بارے میں) عدل ملحوظ نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر قناعت کرو اور یا جن عورتوں کے تم مالک ہو ان سے استفادہ کرو۔ یہ طریقہ بہتر طور پر ظلم و ستم سے محفوظ رکھتا ہے۔

شانِ نزول

اس آیت کے بارے میں ایک خاص شانِ نزول منقول ہے اور وہ یہ کہ قبل از اسلام اہلِ حجاز کفالت و سرپرستی کے لیے یتیم بچیوں کو اپنے گھر لے جاتے تھے اور پھر ان سے شادی کرکے ان کے مال کو اپنی ملکیت بنا لیتے تھے کیونکہ سب کچھ انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کا حق مہر بھی معمول سے کم مقرر کرتے تھے۔ اور اگر ان سے معمولی سی تکلیف بھی پیدا ہوتی تو آسانی سے انہیں چھوڑ دیتے اور وہ اس بات پر تیار نہ ہوتے کہ ایک عام بیوی کی حیثیت سے ہی ان سے تعلق باقی رکھیں۔

ان حالات میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں یتیموں کی سرپرستی کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ اگر وہ یتیم لڑکیوں سے شادی کریں تو ان کے بارے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں اور اگر ایسا نہ کرسکیں تو پھر ان سے شادی نہ کریں اور دوسری عورتوں میں سے شادی کے لیے کسی کو منتخب کریں۔

و ان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا......

گذشتہ آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں ان کے ایک اور حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ: اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کے وقت تم حقوقِ زوجیت اور ان کے مال کے بارے میں عدل و انصاف نہ کرسکو گے تو ان سے شادی نہ کرو اور دوسری عورتوں میں سے انتخاب کرو۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس پر نظر رکھتے ہوئے آیت کی تفسیر مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس سے اس اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ آیت کے شروع میں یتیموں کا ذکر ہے اور اس کے آخری حصے میں ازدواج کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور یہ دونوں ظاہراً ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے ذیل میں شادی بیاہ کا تذکرہ ہے البتہ آیت کی ابتدا میں کہا گیا ہے کہ اگر تم یتیموں سے شادی کے سلسلے میں عدل و انصاف سے کام نہیں لے سکتے تو پھر کیا ہی اچھا ہے کہ اس سے صرف نظر کرلو اور شادی کے لیے ان یتیم لڑکیوں کی بجائے دوسری عورتوں میں سے کسی کو منتخب کرو۔

مفسرین نے اگرچہ اس سلسلے میں بہت سی مختلف باتیں کی ہیں لیکن جو کچھ خود آیت سے سمجھ میں آتا ہے وہ وہی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں یعنی آیت یتیموں کے سرپرستوں سے مخاطب ہے جنہیں گذشتہ آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت کے بارے میں مختلف احکام دیے جاچکے ہیں اور اس آیت میں ان سے یتیموں سے شادی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ جیسے انہیں یتیموں کے اموال میں عدل و انصاف سے کام لینا چاہیے اسی طرح یتیم لڑکیوں سے شادی کی صورت میں بھی انتہائی توجہ سے ان کے حقوق کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے ورنہ ان سے شادی نہیں کرنا چاہیے اور دوسری عورتوں کو منتخب کرنا چاہیے۔



اس آیت کی تفسیر کے بارے میں دیگر شواہد کے علاوہ اس سورہ کی آیت ۱۲۷ بھی ہے جس میں صراحت سے یتیم لڑکیوں سے شادی کرنے کے لیے عدل کو ملحوظ خاطر رکھنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت اُسی آیت کے ضمن میں آئے گی۔ اس سلسلے میں مذکورہ روایات بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہیں[1]

رہی وہ روایت جو امیرالمومنین حضرت علیؑ کے حوالے سے بیان کی گئی ہے کہ اس آیت کے اوّل و آخر کے درمیان قرآن کا نی مقدار میں تھا جو حذف ہو گیا ہے ــــ تو اس سلسلے میں واضح رہے کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے کسی طرح بھی معتبر نہیں ہے۔

ایسی احادیث جو قرآن کی تحریف یا اس کے بعض حصوں کے خرد برد ہو جانے کے بارے میں ہیں دراصل قرآن کا اعتبار گھٹانے کے لیے اسلام دشمنوں اور منافقوں کی طرف سے گھڑی گئی ہیں یا بعض افراد جو آیت کے آغاز و انجام کو نہیں سمجھ سکے انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ بیچ میں سے کچھ حذف یا ضائع ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ ان کا یہ مفروضہ روایت کی شکل اختیار کر گیا ہے جبکہ ہم جان چکے ہیں کہ آیت کے جملے ایک دوسرے سے مکمل ربط رکھتے ہیں۔

مثنیٰ وثلاث ورباع

لغت میں مثنیٰ کا معنی ہے دو دو، ثلاث کا تین تین اور رباع کا چار چار۔ آیت میں روئے سخن چونکہ تمام مسلمانوں کی طرف ہے اس لیے اس کا معنی یوں ہوگا: یتیم لڑکیوں پر ظلم و ستم سے بچنے کے لیے تم ان سے شادی کرنے سے اجتناب کرو اور ان کی بجائے ایسی عورتوں سے شادی کرو جن کی معاشرتی اور خاندانی حیثیت ایسی ہو کہ تمہیں ان پر ظلم کرنے کی اجازت نہ دے اور تم ان میں سے دو، تین یا چار عورتوں سے شادی کر سکتے ہو۔ البتہ مخاطب چونکہ تمام مسلمان ہیں اس لیے دو دو یا تین تین یا چار چار کہا گیا ہے ورنہ اس میں شک نہیں کہ زیادہ سے زیادہ بیویوں کی تعداد (وہ بھی خاص شرائط کی موجودگی میں) چار ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں واؤ دراصل "او" (یا) کے معنی میں ہے اور اس کا مقصد یہ نہیں کہ دو کے بعد مزید تین اور تین کے بعد مزید چار کیونکہ اس طرح تو نو ۹ بن جاتی ہیں اور اگر مقصود یہی ہوتا تو صراحت سے نو کہا جاتا نہ کہ اس طرح سے ایک دوسرے سے الگ اور پیچیدہ طریقے پر ہوتا۔ علاوہ ازیں فقہ اسلامی میں یہ مسئلہ ضروریاتِ دین میں سے ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت تعددِ ازدواج کے لیے صریح دلیل ہے البتہ ان شرائط کے ساتھ جن کی طرف جلد اشارہ کیا جائے گا۔

فان خفتم الا تعدلوا فواحدة

اس کے بعد فوراً کہا گیا ہے کہ یہ اجازت مکمل عدالت کو ملحوظ رکھنے سے مشروط ہے اور اگر عدالت نہیں کر سکتے تو اسی ایک بیوی پر اکتفاء کرو تاکہ دوسروں پر ظلم و ستم کرنے سے بچ سکو۔

---

[1] نورالثقلین، جلد اوّل صفحہ ۴۳۸ اور تفسیر المنار زیر نظر آیت کے ذیل میں۔



اوما ملکت ایمانکم — یا کسی اور بیوی کے انتخاب کی بجائے جو کنیز تمہاری ملکیت ہے اس سے استفادہ کرو کیونکہ ان کی شرائط آسان سی ہیں (اگرچہ انہیں بھی ان کے حقوق ادا کیے جانا چاہیئں)۔

ذلك ادنیٰ الا تعولوا — یہ (بیوی یا کنیز کے چناؤ کا) کام ظلم و ستم اور عدالت سے انحراف سے بہتر بچاؤ کرتا ہے۔ غلامی کے مسئلے کے بارے میں اور اس سلسلے میں اسلام کے نظریے کے متعلق متعلقہ آیات میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

بیویوں سے عدالت کا مفہوم

اس سے قبل کہ ہم اسلام میں بیویوں کی تعداد کے فلسفہ پر بات کریں ضروری ہے کہ اس امر پر بحث کی جائے کہ 'بیویوں سے عدالت' کا کیا مفہوم ہے کیونکہ اسے بیویوں کی تعداد کے سلسلے میں ایک شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

کیا یہ عدالت امورِ زندگی سے مربوط ہے، مثلاً ہم بستری، وسائل زندگی کی فراہمی، سہولت اور آسائش و آرام مہیا کرنا یا اس سے مراد حریم دل اور جذباتِ انسانی کی عدالت بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محبت و الفت کے معاملے میں عدالت کرنا قدرتِ انسانی سے خارج معاملہ ہے۔ کون ایسا شخص ہے جو جذبۂ محبت پر ہر لحاظ سے دسترس رکھے جب کہ اس کے عوامل اس کی اپنی ذات سے باہر ہیں۔ اس بناء پر خدا تعالیٰ نے اس بارے میں عدالت کو واجب قرار نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ اسی سورہ نساء کی آیہ ۱۲۹ میں فرماتا ہے:

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم

تم جس قدر بھی کوشش کرو اپنی بیویوں کے درمیان (قلبی میلانات کے لحاظ سے) عدالت و مساوات برقرار نہیں رکھ سکتے۔

لہٰذا اندرونی محبت جب تک عملی پہلوؤں کی بناء پر بعض بیویوں کی ترجیح کا سبب نہ بنے ممنوع نہیں ہے۔ مرد پر جو ذمہ داری ہے وہ عملی اور خارجی پہلوؤں کے بارے میں عدالت سے متعلق ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ زیر بحث آیت — وان خفتم الا تعدلوا فواحدة اور آیت ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم کو آپس میں ملا کر اور منسلک قرار دے کر یہ نتیجہ نکالیں کہ تعدد ازدواج اسلام میں مطلقاً ممنوع ہے، وہ بہت ہی بڑے اشتباہ کا شکار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک آیت میں عدالت کو اس سلسلے میں شرط قرار دیا گیا ہے اور دوسری میں اس سلسلے میں مردوں کے لیے عدالت کرنا محال قرار دیا گیا ہے اس لیے ایک سے زیادہ شادی ممنوع ہے اور یہی ان کا اشتباہ ہے کیونکہ جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ وہ عدالت جو انسان کے بس میں نہیں ہے وہ قلبی میلانات سے متعلق ہے اور یہ تعدد ازواج کی شرائط میں شامل نہیں اور جو عدالت شرائط میں سے ہے وہ عملی پہلوؤں سے متعلق ہے۔ اس کی شاہد سورہ نساء کی آیت ۱۲۹ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقة

اب جب کہ تم محبت کے سلسلے میں اپنی بیویوں سے مکمل مساوات نہیں کر سکتے تو کم از کم سب میلان ایک



ہی کی طرف نہ رکھو کہ کہیں دوسری کو معلق بنا کر ہی رکھ دو۔
خلاصہ یہ کہ ان لوگوں نے آیت کے کچھ حصے کو تو سامنے رکھا ہے اور کچھ کو فراموش کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تعددِ ازواج کے ضمن میں ایسے اشتباہ کو شکار ہو گئے ہیں جو ہر محقق کے لیے باعث تعجب ہے۔
علاوہ ازیں فقۂ اسلامی اور اس کے مختلف منابع و مصادر کے لحاظ سے اہلِ تشیع اور اہلِ سنت میں تعددِ ازدواج اور اس کی شرائط کے بارے میں کوئی اختلاف و نزاع نہیں ہے بلکہ اس کا شمار فقۂ اسلامی کی ضروریات اور بدیہات میں ہوتا ہے۔ اب ہم اس اسلامی حکم کی حکمت و فلسفے کی طرف لوٹتے ہیں۔

تعددِ ازواج ایک اجتماعی ضرورت

مندرجہ بالا آیت میں تعددِ ازواج کو (سخت شرائط اور معین حدود کے ساتھ) جائز قرار دیا ہے۔ اب ہم ان سوالات اور حملوں کا سامنا کریں گے جو مخالفین نے بغیر مطالعہ اور بے شعور احساسات کے باعث کیے ہیں۔ اہلِ مغرب بالخصوص اس سلسلے میں بہت اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے مردوں کو حرم سرا بنانے اور لاتعداد بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی ہے حالانکہ اسلام نے اس طرح سے حرم سرا کی تشکیل کی اجازت نہیں دی جیسے ان کا خیال ہے اور نہ ہی لاتعداد اور غیر مشروط بیویوں کی اجازت دی ہے۔
اس کی وضاحت یہ ہے کہ قبل از اسلام کے مختلف معاشروں کی کیفیت کا مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ غیر محدود طور پر تعددِ ازواج ان میں ایک عام سی چیز تھی۔ یہاں تک کہ بعض بت پرست جب مسلمان ہوئے تو ان کی دس سے بھی زیادہ بیویاں تھیں لہٰذا تعددِ ازواج کی بنیاد اسلام نے نہیں رکھی اور نہ یہ کوئی نئی ایجاد ہے۔ بلکہ اسلام نے تو اسے انسانی زندگی کے تقاضوں کی روشنی میں محدود کر دیا ہے اور مزید یہ کہ اس کے لیے سخت قسم کی شرائط اور قیود مقرر کر دی ہیں۔
اسلامی قوانین انسان کی حقیقی ضروریات کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ قوانین پراپیگنڈا اور جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں بنائے گئے۔ تعددِ ازواج کا معاملہ بھی اسلام نے اپنے اسی مزاج کے مطابق پیش کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ زندگی کے گوناگوں حوادث میں مرد عورتوں کی نسبت موت کے خطرات سے زیادہ دوچار ہوتے ہیں۔ جنگوں اور دیگر حوادث میں زیادہ تر مرد ہی موت کا شکار ہوتے ہیں۔ نیز اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عورت کی نسبت مرد کی جنسی زندگی کہیں زیادہ طولانی ہوتی ہے۔ کیونکہ عورتیں ایک معین عرصے کے بعد اپنی جنسی آمادگی کھو بیٹھتی ہیں جبکہ مردوں کا معاملہ مختلف ہے نیز ایام ماہواری اور وضع حمل کے کچھ دنوں میں عملی طور پر عورتوں کے لیے جنسی ملاپ ممنوع ہے جبکہ مردوں کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں۔
ان تمام باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بعض پہلو اور بھی قابلِ توجہ ہیں۔ بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے شوہروں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس صورت میں وہ مردوں کے لیے اس پہلو سے قابلِ توجہ نہیں ہوتیں کہ وہ ان کے پہلے شوہر ہوں ۔ اب اگر تعددِ ازواج کی سہولت نہ ہو تو وہ ساری عمر بغیر شوہر کے بیٹھی رہیں۔ اکثر اخبارات و جرائد میں ایسی خبریں چھپتی ہیں کہ بعض ایسی بیوہ عورتیں ہیں جو تعددِ ازواج کے محدود ہونے کے باعث اپنی زندگی کی بے سروسامانی پر شکوہ کناں ہیں اور مردوں کی طرف سے ایک سے زیادہ شادیاں نہ کرنے کو اپنے ساتھ ایک ظالمانہ سلوک تصور کرتی ہیں۔



ان حقائق کو ایسے مواقع پر سامنے رکھیں کہ جہاں مرد اور عورت کے درمیان توازن ختم ہو جاتا ہے تو ہم مجبور ہیں کہ ذیل کی تین صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جائے۔

۱۔ ہر صورت میں مرد ایک ہی بیوی پر قناعت کریں اور جو عورتیں بچ جائیں وہ تمام عمر بغیر شوہر کے گزار دیں اور تمام فطری تقاضوں اور اندرونی خواہشات کو دبائے رکھیں۔

۲۔ مرد قانونی طور پر تو ایک ہی بیوی رکھیں لیکن آزاد اور غیر شرعی جنسی روابط بے شوہر عورتوں سے رکھیں اور انہیں داشتہ بنا کر رکھیں۔

۳۔ جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتے ہیں اور جسمانی، مالی اور اخلاقی لحاظ سے انہیں کوئی اور مشکل درپیش نہ ہو نیز وہ اپنی بیویوں اور بچوں کے درمیان کامل عدالت قائم رکھ سکیں انہیں اجازت دی جائے کہ وہ اپنے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کا انتخاب کر لیں۔

یہ مسلم ہے کہ ان تین راستوں کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود نہیں۔

پہلے راستے کے انتخاب کا مطلب یہ ہے کہ ہم انسان کی فطرت، سرشت اور روحانی و جسمانی ضروریات کے خلاف جنگ کریں اور ایسی عورتوں کے جذبات و احساسات کی پرواہ نہ کریں اور یہ وہ جنگ ہے جس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں اور اگر فرض کریں کہ ایسا ہو جائے تو اس طرزِ عمل کے غیر انسانی پہلو کسی سے مخفی نہیں ہیں۔

دوسرے لفظوں میں تعددِ ازدواج کا مسئلہ ضرورت کے مواقع پر صرف پہلی بیوی کی آنکھ کے دریچہ سے نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ اس کا مطالعہ دوسری بیوی کی آنکھ کے دریچہ سے کیا جانا چاہیے جو لوگ پہلی بیوی کی مشکلات کو دوسری بیوی کے معاملے میں مثال بناتے ہیں وہ دراصل تین زاویوں والے مسئلے کو صرف ایک زاویے سے دیکھتے ہیں کیونکہ تعددِ ازدواج کا مسئلہ مرد کی نگاہ کے زاویے سے، پہلی بیوی کی نگاہ کے زاویے سے اور دوسری بیوی کی نگاہ کے زاویے سے دیکھا جانا چاہیے اور ان تینوں کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بارے میں فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

دوسری راہ کے انتخاب کا مطلب ہے کہ فحش اور قبیح کاموں کو قانونی حیثیت دے دی جائے اور عورتوں کو داشتہ کی حیثیت سے جنسی لذتوں کے لیے استعمال کیا جائے، ان کے لیے نہ اطمینان و سکون ہو اور نہ ان کا کوئی مستقبل اور دراصل ان کی شخصیت کو روند ڈالا جائے۔ یہ کوئی ایسا طریقہ نہیں جسے کوئی عقلمند انسان تجویز کرے۔

لہٰذا صرف تیسرا طریقہ باقی رہ جاتا ہے جو عورتوں کی فطری خواہشات اور طبعی ضروریات کا حل بھی ہے اور فحش و قبیح امور کے برے نتائج اور تباہ کن زندگی سے عورتوں کی نجات کا راستہ بھی ہے۔ اس طرح سے عورت معاشرے کو بھی گردابِ گناہ سے نکال لے گی۔

البتہ توجہ رہے کہ تعددِ ازدواج کا جواز اگرچہ معاشرے کی ایک ضرورت ہے اور اسلام کے مسلم احکام میں سے ہے لیکن موجودہ زمانے میں اس کی شرائط کی تکمیل گذشتہ زمانے سے بہت مختلف ہے کیونکہ گذشتہ زمانے میں زندگی سادہ اور بسیط سی تھی لہٰذا عورتوں میں کامل مساوات کا لحاظ رکھنا آسان تھا اور زیادہ تر لوگ اس سے عہدہ برآ ہو لیتے تھے لیکن ہمارے زمانے



میں جو شخص اس قانون سے استفادہ کرنا چاہے اُسے چاہیے کہ ہر لحاظ سے عدالت کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ اگر وہ ایسا کرسکے تو یہ اقدام کرے اور بنیادی طور پر یہ قدم ہوا و ہوس کی بناء پر نہیں ہونا چاہیے۔

تعجب کی بات ہے کہ اہل مغرب کی طرح جو لوگ تعددِ ازواج کے مخالف ہیں اپنی تاریخ میں ایسے حوادث کا شکار رہے ہیں جن سے ان کی یہ ضرورت مکمل طور پر واضح ہو گئی ہے مثلاً دوسری عالمی جنگ کے بعد جنگ زدہ ممالک میں خصوصاً جرمنی میں اس کی سخت ضرورت کا احساس ہوا۔ یہاں تک کہ ان کے بعض مفکرین تعددِ ازواج کے ممنوع ہونے پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہوئے تاکہ مشکل کا کوئی حل نکل سکے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے "الازہر" سے رجوع کیا اور ان سے تعددِ ازواج کے بارے میں اسلامی حکم کی تفصیلات منگوائیں اور اس پر تحقیق و مطالعہ شروع کیا لیکن کلیسا نے ان پر سخت حملے اور تنقیدیں کیں جن سے مجبور ہو کر انہیں یہ پروگرام چھوڑنا پڑا اور پھر اس کا نتیجہ وحشتناک فحاشی اور وسیع بے راہ روی کی صورت میں نکلا کہ جس نے تمام جنگ زدہ ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے، اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض مرد ایک سے زیادہ بیویوں کی طرف میلان و رغبت رکھتے ہیں۔ اگر یہ میلان صرف ہوا و ہوس کی بناء پر ہو تو ٹھیک ہے اعتناء نہیں کرنا چاہیے لیکن بعض اوقات بیوی بانجھ ہوتی ہے اور مرد کو اولاد کی شدید خواہش ہوتی ہے اس صورت میں مرد کی خواہش منطقی ہوتی ہے یا بعض اوقات مرد کی خواہشات جنسی شدید ہوتی ہے جبکہ اس کی پہلی بیوی مرد کی اس فطری خواہش کی تکمیل کی طاقت نہیں رکھتی لہٰذا مرد دوسری شادی کے لیے اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے یہاں تک کہ جائز طریقے سے تکمیلِ خواہش نہ ہونے کی صورت میں وہ غیر شرعی قدم اٹھاتا ہے ان مواقع پر بھی دوسری شادی کے لیے مرد کی خواہش کے منطقی ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس بناء پر جن ممالک میں قانوناً ایک سے زیادہ شادیاں ممنوع ہیں عملاً مختلف عورتوں سے مختلف صورتوں میں ارتباط بالکل موجود ہے اور ایک ہی مرد ایک ہی وقت میں مختلف عورتوں سے ناجائز تعلقات استوار کیے ہوتا ہے۔

مشہور فرانسیسی مورخ گوستا ولوبون تعددِ ازواج کے بارے میں اسلامی قانون کو جو کہ محدود و مشروط ہے کو دین اسلام کی خوبیوں میں سے شمار کرتا ہے۔ وہ یورپ کے مردوں کے متعدد عورتوں سے آزادانہ ناجائز روابط کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> مغرب میں بھی جہاں کی آب و ہوا اور وضع طبیعت اگرچہ اس رسم (تعددِ ازواج) کو قبول نہیں کرتی پھر بھی ایک بیوی کا ہونا ایک ایسی چیز ہے جو صرف قانون کی کتاب میں دکھائی دیتی ہے ورنہ مجھے یہ گمان نہیں کہ اس بات کا انکار کیا جائے کہ ہمارے معاشرے میں اس رسم کے آثار نہیں ہیں۔ واقعاً میں حیران ہوں اور میں نہیں جان سکا کہ مشرق کے جائز اور محدود تعددِ ازواج کے نظریے میں مغرب کے مکارانہ اور فریب دھندہ تعددِ ازواج کے حوالے سے کیا کمی ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلا طریقہ دوسرے کی نسبت ہر لحاظ سے بہتر اور زیادہ شائستہ ہے۔

البتہ اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض مسلمان نما لوگ اس اسلامی قانون کی روح کے منافی اس سے سوءِ استفادہ



کرتے ہیں اور شرمناک طریقے سے اپنے لیے بیویاں مہیا کرتے ہیں اور اپنی بیویوں کے حقوق میں تجاوز کرتے ہیں لیکن یہ قانون کی خرابی نہیں اور ان لوگوں کے کردار کو اسلامی قوانین کے کھاتے میں نہیں ڈالنا چاہیے کون سا ایسا قانون ہے جس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جاتا ہو ۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا حالات وکوائف بعض عورتوں کے لیے پیدا ہو جائیں تو کیا اس صورت میں عورت کو بھی دو شوہروں کی اجازت دی جا سکتی ہے ۔

اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ (عوام میں مشہور بات کے برعکس) مردوں میں عورتوں کی نسبت جنسی میلان کہیں زیادہ ہوتا ہے ——— علمی کتابوں میں جنسی مسائل سے مربوط بیماریاں زیادہ تر عورتوں کے بارے میں بیان کی گئی ہیں ۔ ان میں سے ایک عورتوں کی سرد مزاجی بھی ہے جبکہ مردوں میں معاملہ اس کے برعکس ہے یہاں تک کہ دوسرے جانداروں میں سے دیکھا گیا ہے کہ جنسی خواہش کا اظہار عموماً پہلے نر کی طرف سے ہوتا ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ تعددِ ازواج مرد کے بارے میں کوئی اجتماعی اور حقوق سے متعلق مشکل پیدا نہیں کرتا جبکہ عورتوں کے لیے اگر بالفرض دو شوہر ہوں تو بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی ۔ ان میں سے ایک سادہ سا مسئلہ یہ ہے کہ بچے کا نسب مجہول ہو جاتا ہے اور اس کے بارے میں علم نہیں ہوتا کہ وہ کس شوہر کا ہے اور مسلم ہے کہ ایسا بچہ ان میں سے کسی مرد کی شفقت کا مرکز نہیں بن سکے گا یہاں تک کہ بعض علماء کا نظریہ ہے کہ جس بچے کا باپ مجہول ہو اسے ماں کی محبت بھی بہت کم میسر آئے گی ۔ ایسے بچے محبت و شفقت سے تو بالکل محروم رہیں گے ہی ، حقوق کے لحاظ سے بھی ان کی کیفیت بالکل مبہم ہو جائے گی ۔

شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ انعقادِ نطفہ سے بچنے کے لیے برتھ کنٹرول کے طریقوں سے استفادہ مثلاً گولیاں وغیرہ استعمال کرنا کبھی بھی اطمینان بخش نہیں ہے اور یہ طریقے بچہ نہ ہونے کی یقینی دلیل نہیں بن سکتے کیونکہ بہت سی ایسی عورتیں ہیں جنہوں نے ان طریقوں کو استعمال کیا ہے یا طریقۂ استعمال میں اشتباہ کیا ہے اور اس کے باوجود بچہ پیدا ہو گیا ہے ۔ لہٰذا کوئی عورت بھی اعتماد سے تعددِ ازواج کے لیے تیار نہیں ہو سکتی ۔

ان وجوہات کی بناء پر عورتوں کے لیے مختلف شوہروں کا ہونا منطقی نہیں ہو سکتا جبکہ مردوں کے لیے ان حالات کو سامنے رکھتے ہوئے منطقی بھی ہے اور عملی بھی ۔

۴۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــٴًـا مَّرِیْٓــٴًـا ○



ترجمہ

۴ اور عورتوں کا حق مہر (اپنے اوپر بالکل) ایک قرض سمجھتے ہوئے (یا ایک عطیہ کے طور پر) انہیں ادا کر دو اور اگر وہ راضی خوشی اس میں سے کوئی چیز تمہیں بخش دیں تو اسے حلال اور مناسب سمجھتے ہوئے استعمال کر لو۔

تفسیر

"نحلۃ" لغت میں قرض کے معنی میں بھی آیا ہے اور بخشش و عطیہ کے معنی میں بھی۔

راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتا ہے:

میرے نظریے کے مطابق یہ لفظ نحل (جس کا معنی شہد کی مکھی ہے) کے مادہ سے ہے کیونکہ بخشش و عطیہ شہد کی مکھیوں کے کام یعنی شہد دینے سے شباہت رکھتا ہے۔

"صدقاتھن" "صداق" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "مہر"۔

گذشتہ آیت میں بیوی کے انتخاب کے بارے میں گفتگو تھی اب اس آیت میں عورتوں کے ایک مسلم حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت تاکید کرتی ہے کہ عورتوں کا حق مہر بالکل ایک قرض کی طرح ادا کرو یعنی جیسے دوسرے قرضوں کی ادائیگی کا خیال رکھتے ہو کہ ان میں سے کوئی چیز کم نہ ہو، حق مہر ادا کرتے وقت بھی تمہاری یہی حالت ہونا چاہیے (یہ اس صورت میں ہے اگر نحلۃ کا معنی قرض لیا جائے) اور اگر اس کا معنی عطیہ اور بخشش کیا جائے تو پھر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی: حق مہر جو کہ ایک عطیۂ الٰہی ہے اور خدا نے اس لیے مقرر کیا ہے کہ معاشرے میں عورت کے حقوق زیادہ ہوں اور اس کی جسمانی کمزوری کی اس طرح سے تلافی ہو جائے، اسے مکمل طور پر ادا کرو۔

فان طبن لکم عن شیء منہ نفسا فکلوہ ھنیئا مریئا

آیت کی ابتدا میں حقوقِ نسواں کی حفاظت کے لیے صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ تمام حق مہر انہیں ادا کرو لیکن آیت کے ذیل میں طرفین کے احساسات کا احترام کرتے ہوئے، قلبی رشتوں کے استحکام اور باہمی محبت کے فروغ کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے: اگر عورتیں پوری رضا و رغبت سے اپنے مہر میں سے کچھ مقدار بخش دیں تو وہ تمہارے لیے حلال اور شائستہ ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ باہمی زندگی میں صرف خشک قانون اور کلیے ہی نہ چلتے رہیں بلکہ متوازی طور پر محبت و الفت کے جذبے حکم فرما ہوں۔

حق مہر عورت کے لیے ایک معاشرتی سہارا ہے

زمانۂ جاہلیت میں چونکہ لوگ عورت کی قدر و قیمت کے قائل نہیں تھے اس لیے اکثر اوقات حق مہر جو کہ عورت کا مسلم حق ہے وہ اس کے والیوں کو دے دیتے تھے اور اسے ان کا مسلم حق سمجھتے تھے۔ بعض اوقات ایک عورت کا حق مہر دوسری عورت کی شادی کو قرار دیتے تھے مثلاً ایک بھائی اپنی بہن کی شادی کسی سے کرتا تو اُسے بھی مقابلے میں اپنی بہن اسے دینا پڑتی اور



ان دونوں عورتوں کا یہی حق مہر ہوتا۔

اسلام نے ان تمام ظالمانہ رسوم پر خطِ بطلان کھینچ دیا اور حق مہر کو مخصوص طور پر عورت کا مسلم حق قرار دیا اور آیاتِ قرآنی میں بار ہا مردوں کو اس حق کی مکمل ادائیگی کی نصیحت کی۔

اسلام میں حق مہر کے لیے کوئی مقدار معین نہیں کی گئی اور اس کا انحصار میاں بیوی کی باہمی رضامندی پر ہے اگرچہ بہت سی روایات میں تاکید کی گئی ہے کہ حق مہر زیادہ نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ کوئی لازم و واجب حکم نہیں ہے بلکہ مستحب حکم ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد اور عورت شادی اور مباشرت سے یکساں طور پر بہرہ مند ہوتے ہیں اور میاں بیوی کا رشتہ طرفین کے باہمی فائدے میں قائم ہوتا ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مرد کم یا زیادہ مال عورت کو حق مہر کے طور پر دے۔ کیا اس طرح اس حکم سے عورت کے مقام پر زد نہیں پڑتی اور شادی بیاہ میں خرید و فروخت کی صورت نہیں بن جاتی؟

اسی وجہ سے بعض لوگ حق مہر کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ مغرب میں چونکہ اس کا معمول نہیں ہے اس لیے مغرب زدہ لوگ خاص طور پر یہ مخالفت کرتے ہیں حالانکہ حق مہر کے نہ ہونے سے عورت کے مقام میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا لیکن اس طرح وہ خطرے سے ضرور دوچار ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ عورت اور مرد یکساں طور پر ازدواجی زندگی سے فائدے اٹھاتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علیحدگی کی صورت میں عورت کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بلحاظ جسمانی استعداد کی بنا پر مرد عموماً معاشرے میں زیادہ نفوذ اور تسلط کا حامل ہوتا ہے اگرچہ بعض لوگ بات کرتے وقت اس واضح حقیقت کا انکار کر دیتے ہیں لیکن انسان کی اجتماعی زندگی کی کیفیت جو آنکھوں کو نظر آتی ہے یہ ہے کہ زیادہ آمدنی والے کام زیادہ تر مردوں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ خود یورپ کی بھی یہی حالت ہے جہاں اصطلاحی طور پر عورتیں مکمل آزادی سے ہمکنار ہیں۔

علاوہ ازیں مردوں کے لیے نئی بیوی کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں لیکن بیوہ عورتیں خصوصاً جب ان کی عمر کا کچھ حصہ گزر جائے اور وہ جوانی و زیبائی کا سرمایہ ختم کر بیٹھیں تو نئے شوہر کے لیے ان کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں حقیقت میں حق مہر ایک ایسی چیز ہے جو عورت کے لیے اس کے خسارے کی تلافی کا ذریعہ ہے اور آئندہ زندگی کے محفوظ رکھنے کا وسیلہ ہے۔

علاوہ ازیں حق مہر عموماً مرد کو علیحدگی اختیار کرنے اور اسے طلاق دینے کے میلانات سے روکنے کے لیے ایک بریک (BRAKE) کا کام دیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ قوانینِ اسلام کی رو سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہی حق مہر مرد کے ذمے ہو جاتا ہے اور عورت فوراً ہی اس کے مطالبے کا حق رکھتی ہے لیکن چونکہ عموماً وہ قرض کی صورت میں مرد کے ذمہ رہ جاتا ہے لہٰذا یہ عورت کے لیے ایک پس انداز بچت کی حیثیت رکھتا ہے اور رشتۂ تزویج نہ ٹوٹنے کے لیے ایک سہارے کا کام دیتا ہے۔

اس مسئلے کے کچھ استثنائی پہلو بھی ہیں لیکن ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر مقامات پر صادق آتا ہے۔

اب اگر بعض لوگوں نے حق مہر کی غلط تفسیر کی ہے اور اسے عورت کی ایک طرح سے قیمت خیال کیا ہے، اس کا



قوانین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اسلام میں کسی طرح بھی حق مہر مال تجارت کی قیمت کا پہلو نہیں رکھتا اور اس کی بہترین دلیل نکاح کے صیغے ہیں جن میں قانونی طور پر مرد اور عورت ہی اس بیان کے دو بنیادی رکن شمار ہوتے ہیں اور حق مہر ایک اضافی چیز ہے اور کتاب کے حاشیے کے مترادف ہے۔ اسی بناء پر اگر صیغۂ نکاح میں حق مہر کا تذکرہ نہ کیا جائے تو عقد باطل نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں شوہر کی ذمہ داری ہے کہ مباشرت سے قبل اس جیسی عورتوں کا سا حق مہر ادا کرے)۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حق مہر نقصان کی تلافی اور عورت کے حقوق کے احترام کے پیش نظر ہے نہ کہ اس کی قیمت ہے اور شاید نحلۃ (بمعنی عطیہ) اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

۵. وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ○

۶. وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۚ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ○

ترجمہ

۵ اور اپنے اموال کہ جنہیں خدا نے تمہاری زندگی کا وسیلہ قرار دیا ہے انہیں بے وقوفوں کے ہاتھ میں نہ دے دو اور انہیں اس میں سے روزی دے دو اور انہیں لباس پہناؤ اور ان سے شائستہ طریقے سے گفتگو کرو۔

۶ اور یتیموں کو آزما کر دیکھو یہاں تک کہ جب (تم دیکھو کہ) وہ بلوغ کو پہنچ گئے ہیں تو اگر ان میں (کافی) رشد و شعور پاؤ تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دو اور ان کے بڑے ہونے سے پہلے ان کے اموال اسراف اور فضول خرچی کے طور پر نہ کھاؤ اور (سرپرستوں میں سے) جو شخص بے نیاز ہے وہ (حقِ زحمت لینے سے) اجتناب کرے اور جو شخص ضرورت مند ہے وہ شائستہ طریقے سے (اور جو زحمت اس نے اٹھائی ہے اس کے مطابق) اس میں سے کھائے اور جب ان کا مال انہیں دے دو تو اس (ادائیگی) پر گواہ بنا لو (اگرچہ) خدا محاسبہ کے لیے کافی ہے۔



تفسیر

مندرجہ بالا آیات یتیموں سے مربوط مباحث کی تکمیل کرتی ہیں۔ کچھ بحث گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے۔

ولا تؤتوا السفهاء اموالكم

اپنا مال و دولت بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو اور انہیں رہنے دو یہاں تک کہ وہ اقتصادی معاملات میں شعور حاصل کرلیں تاکہ تمہاری دولت خطرے اور نقصان کی زد سے بچ جائے۔

سفیہ کسے کہتے ہیں

راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ سفہ (بروزن تب) اصل میں ایک طرح کی کم وزنی اور بدن کا ہلکا ہونا ہے جس میں یہ حالت ہو کر چلتے وقت اعتدال کو برقرار نہ رکھا جا سکے۔ اسی لیے اس افسار[1] کو سفیہ کہتے ہیں جو ناموزوں ہو اور ہمیشہ ہلتی جلتی رہے۔ بعد ازاں یہ لفظ اسی مناسبت سے ان افراد کے لیے استعمال ہونے لگا جو سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں چاہے ان کا ہلکا پن امور مادی میں ہو یا امور معنوی میں۔

لیکن واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سفاہت کا تعلق خصوصیت سے مالی امور میں کافی سوجھ بوجھ نہ ہونے سے ہے۔ اور یہاں سفیہ سے مراد وہ شخص ہے جو اموال کی سرپرستی اپنے ذمہ نہ لے سکے اور مال و دولت کے لین دین میں اپنے فائدے کو نہ سمجھ سکے۔ اصطلاح میں کہتے ہیں کلاہ سرش برود (یعنی — لوگ اس کا سر مونڈ لیں) اس مفہوم کی شاہد اگلی آیت ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

فان انستم منهم رشدا فادفعوا اليهم اموالهم۔

اگر انہیں سمجھدار پاؤ تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔

اس بناء پر اگرچہ زیر نظر آیت یتیموں کے بارے میں بحث کر رہی ہے لیکن اس کا ایک عمومی مفہوم تمام لوگوں کے لیے ہے اور وہ یہ کہ انسان کو کسی حالت میں اور کسی صورت میں وہ مال جو اس کی سرپرستی میں ہو یا کسی طرح سے اس سے وابستہ ہو نافہم اور ناسمجھ افراد کے سپرد نہیں کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں اموالِ عمومی (اموالِ حکومتِ اسلامی) میں بھی کوئی امتیاز نہیں۔ اس مفہوم کا شاہد لفظ "سفیہ" کا وسیع مفہوم بھی ہے اور اس کے علاوہ وہ روایات بھی ہیں جو ہادیانِ اسلام سے اس سلسلے میں منقول ہیں مثلاً امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے —

ایک شخص ابراہیم بن عبدالحمید کہتا ہے کہ میں نے امام سے آیت ولا تؤتوا السفهاء اموالكم کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا:

---

[1] افسار اس رسی کو کہتے ہیں جو گھوڑے یا گدھے کے سر اور گردن پر باندھی جائے (مترجم)۔



شراب خور سفیہ ہیں اپنے اموال ان کے سپرد نہ کرو [1]

ایک اور روایت میں بھی شرابی کو مالی امور میں امین بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بار بار روایات میں شرابی کو سفیہ قرار دیا گیا ہے اور یہ تعبیر شاید اس بناء پر ہے کہ شرابی اپنا مادی سرمایہ بھی ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے اور معنوی بھی۔ اس سے بڑھ کر بے وقوفی کیا ہوگی کہ انسان پیسے بھی دے اور اس کے ساتھ اپنی عقل و ہوش بھی دے دے اور دیوانگی خرید لے، اپنے بدن کے مختلف قوٰی بھی اس کام میں لگا دے اور بہت سے اجتماعی نقصانات بھی کرے۔

ایک اور روایت میں ان سب لوگوں کو جو کسی لحاظ سے بھی بھروسہ کے قابل نہ ہوں سفیہ کہا گیا ہے اور (شخصی اور عمومی) اموال ان کے سپرد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

یونس بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیۂ و لا تؤتوا السفھاء اموالکم کی تفسیر پوچھی۔ تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

من لا تثق بہ

سفیہ وہ شخص ہے جو قابلِ اعتماد نہ ہو [2]

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آیت یتیموں کے بارے میں ہے تو "اموالکم" (تمہارے اموال) کیوں فرمایا ہے۔ "اموالھم" ان کے مال کیوں نہیں فرمایا۔

ممکن ہے اس تعبیر کا مقصد اس اجتماعی اور اقتصادی مسئلے کو بیان کرنا ہو کہ اسلام انسانی معاشرے کے تمام افراد کو ایک سمجھتا ہے۔ اس بناء پر کہ ایک شخص کی بہتری اور بھلائی دوسروں کے نفع سے جدا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح ایک شخص کا نقصان پورے معاشرے کا نقصان ہے۔

اسی وجہ سے اس خیال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ضمیر غائب کی بجائے "ضمیر مخاطب" استعمال کی گئی ہے یعنی حقیقت میں ان اموال کا تعلق صرف یتیموں سے نہیں بلکہ تمہارے ساتھ بھی ہے۔ اگر انہیں کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ کسی نہ کسی صورت میں تمہاری طرف لوٹے گا۔ اس لیے اس کے مال کی پوری طرح نگرانی کرنا چاہیے۔

اس سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کوتاہ نظر لوگ کمزور اور بزدل افراد کو مذہبی اور تبلیغی عہدوں کے لیے ان کی مدد کے بہانے ازراہِ ہمدردی چنتے ہیں، ان کا یہ ایک سراسر غلط اور مجنونانہ فعل ہے۔

الّتی جَعَلَ اللہ لکم قیاما

اس جملے میں قرآن نے مال و ثروت کے لیے ایک عجیب و غریب تعبیر بیان فرمائی ہے، تمہاری زندگی اور سوسائٹی کا قیام سرمایہ پر ہی منحصر ہے اس کے بغیر تم آزادی سے اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوسکتے۔ اسے سفیہ اور فضول خرچ لوگوں

---

[1] تفسیر برہان جلد اوّل زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۱، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں، تفسیر نور الثقلین بھی دیکھ سکتے ہیں۔



کے سپرد نہ کرو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اقتصادی اور مالی اہمیت کا قائل ہے۔

اس کے برعکس موجودہ انجیل[1] میں ہے کہ مالدار آدمی جنت میں نہیں جا سکے گا۔ اسلام کہتا ہے کہ جو قوم فقیر و نادار ہو وہ کبھی اپنی کمر سیدھی نہیں کر سکتی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ عیسائی اپنی غلط تعلیمات کے باوجود دنیا میں اوجِ کمال پر پہنچے ہوئے ہیں اور ہم ان اعلیٰ اسلامی تعلیمات کے باوجود ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

اصل میں انہوں نے خرافات چھوڑ دی ہیں، اس لیے وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں اور کیونکہ ہم نے ان اعلیٰ و ارفع تعلیمات سے دوری اختیار کر لی ہے اس لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔

وارزقوھم فیھا واکسوھم و قولوا لھم قولا معروفا

آیت کے آخر میں یتیموں کے بارے میں دو اہم حکم دیے گئے ہیں:

۱۔ ان کی خوراک اور پوشاک انہی کے مال سے مہیا کرو تاکہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ پروان چڑھیں اور بالغ ہوں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں لفظ "فیھا" (ان کے مال میں) آیا ہے "منھا" (ان کے مال سے) نہیں آیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یتیموں کی گزر اوقات ان کے مال اور سرمایہ کے نفع سے پوری کرو کیونکہ اگر یہ کہا جاتا کہ ان کے اخراجات ان کے سرمائے سے پورے کرو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا کہ اصل سرمایہ سے آہستہ آہستہ اخراجات پورے کیے جائیں اور یہ فطری امر ہے کہ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سرمائے کا زیادہ تر حصہ ہاتھ سے کھو بیٹھے ہوں۔ لیکن قرآن الفاظ کی تبدیلی سے سرپرستوں کو یہ نصیحت و وصیت کرتا ہے کہ وہ یتیموں کے مال کے نفع اور آمدنی سے ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کا اصل سرمایہ محفوظ رہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ آیت کہتی ہے کہ یتیموں کے ساتھ شائستگی سے گفتگو کرو۔ یعنی دل کو خوش کرنے والی اچھی اچھی باتوں سے ان کی نفسیاتی کمی کو دور کرو اور ان کو نصیحت کرتے رہو تاکہ وہ سنِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے اچھے خاصے سمجھدار ہو جائیں اسی طرح یتیموں کی تشکیلِ سیرت اور تعمیرِ کردار بھی سرپرستوں کی ذمہ داری ہے۔

وابتلوا الیتامٰی حتی اذا بلغوا النکاح۔

یہاں یتیموں اور ان کے مال کے بارے میں ایک اور حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: یتیموں کی آزمائش کرو، انہیں تجربے میں ڈالو یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں تو اس وقت اگر ان میں معاملہ فہمی اور مال کی حفاظت کی سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال انہیں واپس کر دو۔

چند اہم نکات

۱۔ لفظ حتّٰی سے معلوم ہوتا ہے کہ سنِ رشد تک پہنچنے سے پہلے یتیموں کی لگاتار آزمائش ہونی چاہیے یہاں تک کہ

---

[1] انجیل متی باب ۱۹ آیہ ۲۳



وہ بلوغت کی منزل میں داخل ہو جائیں اور عقلی طور پر مکمل طریقے سے اپنے مال کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ضمنی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش سے مراد یتیموں کی تدریجی تربیت ہے۔ یعنی انہیں آزاد نہ چھوڑ دیں یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اس کے بعد مال ان کے حوالے کر دیں۔ بلکہ بلوغت سے پہلے پہلے انہیں مستقل زندگی گزارنے کے لیے عملی تربیت دیں۔

باقی رہا یہ کہ یتیموں کی آزمائش کس طرح کی جائے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ مال ان کو دے دیا جائے تاکہ وہ اس سے تجارت کریں۔ لیکن ان کے اعمال کی نگرانی اس خوبی سے کی جائے کہ ان کے کام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہ کام بخیر و خوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور لین دین میں دھوکا نہیں کھاتے تو ان کے اموال انہیں دے دیے جائیں یا لگاتار تعلیم و تربیت کے ذریعے ان کی اس طرح پرورش کی جائے کہ وہ آئندہ زندگی کی باگ ڈور سنبھال لیں۔

۲۔ "اذا بلغوا النکاح" میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ زندگی کی اس حد میں قدم رکھیں کہ ازدواج کی قدرت رکھتے ہوں اور ظاہر ہے کہ جو شادی بیاہ کی اہلیت رکھتا ہے، گھریلو ذمہ داریوں کو بہتر طور پر انجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور ایسا شخص سرمایہ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بنابریں ازدواجی زندگی مستقل اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یتیموں کی ثروت و دولت انہیں واپس کر دی جائے تاکہ جب وہ جسمانی طور پر بالغ ہو جائیں اور انہیں مال کی بہت زیادہ ضرورت ہو تو اس کے ساتھ ان کی سوچ میں بھی پختگی آ جائے جس سے وہ اپنے مال کی بخوبی حفاظت کر سکیں۔

۳۔ "انستم منهم رشدا" یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا رشد (سوجھ بوجھ) پوری طرح واضح ہو۔ کیونکہ "انستم" مادۂ "ایناس" سے ہے۔ جس کے معنی مشاہدہ کرنے اور دیکھنے کے ہیں اور یہ مادہ مادۂ انسان سے ہے جس کے ایک معنی آنکھ کی پتلی کے بھی ہیں۔ حقیقت میں مشاہدہ اور دیکھنے کے وقت انسان یعنی آنکھ کی پتلی سے مدد لی جاتی ہے۔ اسی لیے مشاہدہ کرنے کو ایناس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ولا تاکلوها اسرافا وبدارا ان یکبروا۔

اس کے بعد پھر سرپرستوں کو تاکید کر رہا ہے کہ کسی طرح سے بھی یتیموں کے مال میں خیانت اور بے ایمانی نہ کریں اور ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ان کا سرمایہ ضائع نہ کریں۔

ومن کان غنیا فلیستعفف ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف

یعنی اگر یتیموں کے سرپرست صاحب حیثیت اور مالدار ہیں تو پھر کسی طریقے سے بھی ان کے مال سے فائدہ نہ اٹھائیں اور اگر فقیر و نادار ہیں تو صرف ان ذمہ داریوں کے بدلے جو انہوں نے یتیم کے مال کی حفاظت کے لیے اٹھائی ہیں عدل و انصاف کرتے ہوئے ان کے مال میں سے اپنی کارکردگی کے مطابق لے سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں کئی روایتیں بھی ہیں جنہوں نے اس آیت کے مضمون کی وضاحت کی ہے۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں۔



ان میں سے ایک روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

فذٰلک رجل یحبس نفسہ عن المعیشۃ فلا بأس ان یأکل بالمعروف اذا کان یصلح لھم فان کان المال قلیلا فلا یأکل منہ شیئا۔

اس سے تو وہ شخص مراد ہے جس کو یتیم کے مال کی حفاظت اپنا مستقبل سنوارنے سے روک دے تو وہ اس صورت میں یتیم کے مال سے مناسب اندازے کے مطابق لے سکتا ہے اور یہ اسی صورت میں ہے جبکہ یتیم کے لیے اس میں فائدہ ہو اور اگر یتیم کا مال کم ہو (اور اس کی سرپرستی میں زیادہ وقت بھی صرف نہ ہوتا ہو) تو اس حالت میں یتیم کے مال سے ذرہ بھر بھی نہ لے۔

فاذا دفعتم الیھم اموالھم فاشھدوا علیھم۔

آخری حکم جو یتیموں کے سرپرستوں کے متعلق اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنا چاہو تو گواہ بنالو تاکہ اتہام، نزاع اور کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے۔

وکفیٰ باللہ حسیبا۔

البتہ یہ جان لو کہ حقیقی حساب کرنے والا تو خداوند عالم ہی ہے اور ہر چیز سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ تمہارا حساب کتاب اس (خدا) کے ہاں واضح ہو کیونکہ خدا وہ ہے کہ اگر تم سے کوئی ایسی بے ایمانی ہوئی ہوگی جو گواہوں کی نظروں سے بھی اوجھل ہو تو وہ اس کا حساب کرے گا۔

۷۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ○

ترجمہ

۷۔ مردوں کے لیے اس میں سے جو کچھ ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی جو ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں حصہ ہے۔ چاہے وہ مال کم ہو کہ زیادہ یہ حصہ مقرر اور لازمی ہے۔

شانِ نزول

زمانۂ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ (مشرک) صرف مردوں کو وارث سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو شخص مسلح ہو کر



لڑنے اور اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی ڈاکہ ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا اسے ترکہ نہیں مل سکتا۔ اسی وجہ سے وہ عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم کر دیتے تھے اور میت کا مال بہت دور کے مردوں میں بانٹ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک انصاری جس کا نام اوس بن ثابت تھا فوت ہو گیا اور اپنے بعد چھوٹی چھوٹی بچیاں اور بچے چھوڑ گیا۔ اس کے چچازاد بھائی جن کے نام خالد اور ارفطہ تھے وہ آئے۔ انہوں نے اس کا مال آپس میں بانٹ لیا اور اس کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو کچھ بھی نہ دیا تو اس کی بیوی نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں شکایت کی اس وقت تک اس سلسلے میں اسلام میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا۔ چنانچہ حضرت رسول اکرمؐ نے ان دونوں کو بلایا کہ وہ اس مال میں بالکل چھینا جھپٹی نہ کریں اور اسے پہلے طبقے کے پس ماندگان یعنی اولاد اور اس کی بیوی کے سپرد کر دیں۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان اس کی تقسیم کا طریقہ آیات آئندہ میں واضح ہوا۔

تفسیر

عورت کی حفاظت کے لیے ایک اور قدم

حقیقت میں یہ آیت غلط عادتوں اور رسموں کے خلاف ایک اقدام ہے کیونکہ وہ عورتوں اور بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیتے تھے۔ اس لیے یہ آیت ان حقوق کی تکمیل کرتی ہے جو آیات گذشتہ میں ہوئی ہیں۔ کیونکہ عرب اپنی غلط اور ظالمانہ رسموں کی وجہ سے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو میراث کے حق سے محروم کر دیتے تھے۔ آیت نے اس باطل قانون کو غلط قرار دیا اور فرمایا کہ مرد اس مال سے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جاتے ہیں حصہ رکھتے ہیں اور عورتیں بھی۔ چاہے وہ کم ہو کہ زیادہ۔ اس وجہ سے کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ وہ دوسرے کا حصہ ہڑپ کر جائے۔ (للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه اوکثر)

اس کے بعد آیت کے آخر میں اس مقصد کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ تعین شدہ حصہ ہے اور اس کا ادا کرنا واجب ہے تاکہ اس بحث میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے (نصیبا مفروضا)۔

ضمناً جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آیت مندرجہ بالا تمام صورتوں کے لیے عام حکم کا ذکر کر رہی ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر انبیاء اور مرسلین کوئی مال و دولت وغیرہ چھوڑ جائیں تو وہ میراث کے طور پر ان کے وارثوں کو نہیں ملتی، یہ آیت مذکورہ کے خلاف ہے۔ ہاں اس سے پیغمبر کا ذاتی مال مراد ہے ورنہ بیت المال جو تمام مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے وہ بیت المال کے قانون کے مطابق اپنے مصارف میں خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح اس آیت کے عمومی پہلو اور دوسری آیتوں سے جو بعد میں میراث کے بارے میں آئیں گی واضح ہوتا ہے کہ "تعصیب" کا قائل ہونا یعنی بعض حالات میں مال کا پدری رشتہ داروں کے ساتھ مخصوص ہونا جیسا کہ علمائے اہل سنت قائل ہیں، وہ بھی تعلیمات قرآن کے خلاف ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض موقعوں پر عورتیں میراث سے



محروم رہ جاتی ہیں۔ جس کی اسلام آیت مندرجہ بالا اور اسی طرح کی دوسری آیات کی روشنی میں نفی کرتا ہے۔ (غور فرمایئے گا)۔

۸۔ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○

ترجمہ

۸۔ اگر میراث کی تقسیم کے وقت رشتہ دار (اور اس طبقہ کے لوگ جن کا میراث سے کوئی تعلق نہیں ہے) اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس مال میں سے کچھ تھوڑا بہت انہیں بھی دے دو اور ان سے اچھے طریقے سے بات کرو۔

تفسیر

ایک اخلاقی حکم

واذا حضر القسمة اولوا القربی والیتامٰی والمساکین فارزقوھم منه۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ آیت قانون تقسیم وراثت کے بعد نازل ہوئی ہے کیونکہ یہ بتاتی ہے کہ جب تقسیم میراث کی مجلس میں رشتہ دار، یتیم اور مسکین موجود ہوں تو اس میں سے کچھ نہ کچھ انہیں بھی دے دو۔ بنابریں اس آیت کا مفہوم ایک مستحب اور اخلاقی حکم ہے ان طبقات کے بارے میں جو زیادہ نزدیکی ہوتے ہوئے بھی میراث سے محروم ہیں۔ آیت کہتی ہے: اگر تقسیم میراث کی مجلس میں کچھ دوسرے یا تیسرے درجے کے رشتہ دار اور اسی طرح بعض یتیم اور مسکین ہوں تو کچھ نہ کچھ مال انہیں بھی دے دو۔

اس طریقے سے حسد اور کینہ کا احساس جو میراث سے محرومی کی وجہ سے ممکن ہے ان کے دل میں موجزن ہو دور کر دو۔ اور اس ذریعے سے انسانی رشتے کے پیوند کو مستحکم کر دو۔

اگرچہ لفظ "یتامٰی" اور "مسکین" مطلق کے طور پر استعمال کیا گیا ہے لیکن ظاہراً اس سے مراد کنبہ اور خاندان کے یتیم و مسکین ہیں کیونکہ قانونِ میراث کے مطابق قریب ترین طبقات (رشتہ داروں) کے ہوتے ہوئے دور تر طبقات میراث لینے سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ اس طرح کے اجتماع میں موجود ہوں تو مناسب ہے کہ عمدہ ہدیہ (جس کی مقدار کا مقرر کرنا صرف وارثوں کے ارادے سے وابستہ ہے جو بڑے وارثوں کے مال میں سے



ہوگی، انہیں دیا جائے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں یتیموں اور مسکینوں سے مراد ہر قسم کے یتیم اور ضرورت مند ہیں، چاہے وہ میت کے رشتہ دار ہوں یا ان کے علاوہ غیر۔ لیکن یہ احتمال بعید دکھائی دیتا ہے کیونکہ بیگانے اور غیر اس قسم کے خاندانی اجتماع میں نہیں آسکتے۔

بعض مفسرین یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ یہ آیت ایک واجب حکم بیان کر رہی ہے نہ کہ مستحب لیکن یہ بھی بعید ہے کیونکہ اگر واجب حق ہوتا تو ضروری تھا کہ اس کی مقدار اور حدود کا تعین کیا جاتا، حالانکہ یہاں یہ اختیار حقیقی وارثوں کو دیا گیا ہے۔

وقولوا لھم قولا معروفا

آیت کے آخر میں یہ حکم ہے کہ ان میراث سے محروم رہنے والوں سے میٹھی زبان اور شائستہ طریقے سے گفتگو کرو۔ یعنی مادی امداد کے علاوہ اپنے اخلاقی سرمایے سے بھی ان کی محبت حاصل کرو تاکہ ان کے دل میں کسی قسم کی تکلیف نہ رہنے پائے اور یہ حکم مندرجہ بالا حکم کے مستحب ہونے کی دوسری دلیل ہے۔

جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے یہ مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ آیت مندرجہ بالا سرمایہ اور میراث کو متعین کرنے والی آیات کی وجہ سے منسوخ ہو گئی ہے کیونکہ ان آیتوں اور اس آیت کے درمیان کسی قسم کا بالکل تضاد نہیں ہے۔

۹۔ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝

ترجمہ

۹ جو لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے بعد نابالغ اولاد چھوڑ جائیں گے تو ان کا آنے والے دور میں کیا حشر ہوگا، انہیں چاہیے کہ وہ یتیموں پر ظلم کرنے سے ڈریں اور خدا کی مخالفت سے بچیں اور یتیموں سے محبت اور نرمی سے گفتگو کریں۔

تفسیر

یتیموں پر لطف و کرم کی بارش

و لیخش الذین لو ترکوا

قرآن یتیموں کی حالتِ زار کے بارے میں لوگوں کے جذباتِ کرم ابھارنے کے لیے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے کبھی کبھی لوگ غافل ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہ تم عام یتیموں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم چاہتے ہو کہ کل لوگ تمہارے یتیموں کے ساتھ کریں۔



اپنے بے یار و مددگار اور لاوارث بچوں کی بری حالت پیش نظر رکھو جبکہ وہ ایک ظالم اور بے ایمان شخص کی سرپرستی میں ہوں، جو نہ ان کے جذبات و احساسات پر نظر کرے اور نہ ان کے مال میں عدالت کا خیال رکھے۔ تو یہ دردناک منظر تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ ہو گا اور تم اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے کتنے فکرمند ہو گے۔ اسی طرح دوسرے کی اولاد اور یتیموں کے لیے فکر کرو۔ ان کی تکلیف کا احساس کرو۔ اس بنا پر آیت کا مطلب کچھ یوں ہو گا: وہ لوگ جو اپنی اولاد کی آئندہ زندگی کے متعلق حیران و پریشان ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ یتیموں سے خیانت کرنے اور انہیں ستانے سے پرہیز کریں۔

اجتماعی مسئلے اصولی طور پر ہمیشہ ایک سنت کی شکل میں آج سے کل اور کل سے آئندہ زمانے تک اثر کرتے اور پھیلتے ہیں۔ جو لوگ معاشرے میں کسی ظلم کی بنیاد ڈالتے ہیں، مثلاً یتیموں کو ستانے کی رسم ڈالتے ہیں، دراصل وہ خود اس بات کی دعوت اور عملی نمونہ ہوتے ہیں کہ کل ان کی اولاد کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے۔ اس لیے وہ نہ صرف دوسروں کی اولاد پر مشق ستم کرتے ہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی ظلم و ستم کی راہ ہموار کر دیتے ہیں۔

فلیتقوا الله و لیقولوا قولا سدیدا

اب جبکہ یہ حال ہے تو یتیموں کے سرپرستوں کو چاہیے کہ وہ خداوند عالم کے احکام کی مخالفت نہ کریں اور یتیموں کے ساتھ میٹھے لہجے میں بات کریں اور ان سے شفقت آمیز سلوک کریں تاکہ ان کے باطنی دکھ دور ہو جائیں اور دل کے زخم بھر جائیں۔

اسلام کا یہ بلند پایہ حکم جو مندرجہ بالا جملے میں موجود ہے ایتام کی پرورش کے سلسلے میں ایک نفسیاتی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو نہایت قابل غور ہے اور وہ یہ کہ ایک ننھے منے یتیم کی ضرورت صرف خوراک اور پوشاک تک محدود نہیں بلکہ ہمدردی اور مہربانی سے اس کے احساسات قلبی کی تسکین بھی ضروری ہے جو اس کی آئندہ تعمیر و تربیت میں اثر انداز ہو گی کیونکہ یتیم بھی دوسروں کی طرح انسان ہے اور چاہیے کہ اُسے اس مہربانی کے برتاؤ سے ایک روحانی غذا ملے اور اس محبت اور پیار سے اسے وہ راحت ملے جو ایک بچے کو ماں باپ کی گود میں ملتی ہے۔ وہ ایک بھیڑ کے بچے کی مانند نہیں ہے کہ صبح کے وقت ریوڑ کے ساتھ چراگاہ میں چلا جائے اور شام کے وقت واپس آ جائے۔ جسمانی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس کے نفسیاتی میلانات کی بھی خاطر خواہ تعلیم و تربیت کا خیال رکھا جائے ورنہ وہ ایک ظالم، معاشرے کا باغی، برا اور خطرناک شخص بنے گا۔

ایک ضروری وضاحت

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی سے منقول ہے کہ ایک دن چھٹے امامؑ نے فرمایا: جو شخص کسی پر ظلم کرے خداوند عالم کسی شخص کو اس پر مسلط کر دے گا تاکہ وہ اس پر اور اس کی اولاد پر اسی طرح کا ظلم و ستم کرے۔

صحابی کہتا ہے، میں نے دل ہی دل میں سوچا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ ظلم تو باپ کرے اور اس کے کیے کی سزا اولاد بھگتے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی (اس بات کو) بیان کروں، امام عالی مقامؑ نے فرمایا:-

قرآن فرماتا ہے:

ولیخش الذین لو ترکوا من خلفھم ذریۃ ضعفا خافوا علیھم لہ

حاشیہ اگلے صفحہ پر



جو سوال حدیث کے راوی کے دل میں پیدا ہوا تھا بہت سے لوگ وہی سوال کرتے ہیں کہ خداوند عالم کا ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لینا کس طرح جائز ہے؟ اصولی طور پر ظالم کی اولاد نے کون گناہ کیا ہے کہ وہ اس ظلم و ستم کا شکار ہو؟ اس سوال کا جواب مندرجہ بالا تحریر سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے کے افراد جو کام بھی کرتے ہیں وہ آہستہ آہستہ ایک رسم و رواج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور آنے والی نسلوں کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے جو لوگ معاشرے میں ظلم و ستم کی بنیاد رکھتے ہیں آخر ایک دن یہ بدعت ان کی اولاد پر بھی اثرانداز ہوگی۔ اصل میں یہ بات ان کے اعمال کے وضعی اور تکوینی آثار میں سے ہے۔ اگر اسے خدا کی طرف نسبت دی جائے تو وہ صرف اس بنا پر ہے کہ سب کے سب تکوینی اثرات اور علت و معلول کے خواص اُسی سے منسوب ہیں۔ غرض کسی طرح بھی خداوند عالم کی طرف سے کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں ظلم و ستم کی بنیاد رکھی گئی وہ ظالم اور اس کی اولاد کے لیے زنجیر پا بن گئی۔

۱۰۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ○

ترجمہ

۱۰۔ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم و ستم سے کھاتے ہیں وہ صرف آگ کھا رہے ہیں اور بہت جلد جلانے والی آگ میں جلیں گے۔

تفسیر

ہمارے اعمال کا باطنی چہرہ

ان الذین یاکلون اموال الیتمٰی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا

ہم اس سورہ کے شروع میں تحریر کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی آیتیں ایک صحیح و سالم معاشرے کی بنیاد قائم کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ اس لیے پہلے پہل جہالت کے زمانے کی رسموں اور مجرمانہ غلط کاریوں کو جو بعض نسلوں کے دلوں میں تھیں دور کر کے ایک صحیح و سالم معاشرے کے لیے زمین ہموار کرتی ہیں اور یتیم کا مال کھانے سے زیادہ بدتر عمل کونسا ہوگا۔ اسی لیے اس سورت کے شروع میں یتیموں کے مال میں بے جا تصرف کرنے کے خلاف سخت قسم کے احکام دکھائی دیتے ہیں، جن میں آیت مذکورہ بالا سب سے زیادہ واضح ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ہیرا پھیری کر کے کھاتے ہیں وہ درحقیقت آگ کھاتے ہیں۔ سارے قرآن میں اس قسم

حاشیہ صفحہ سابقہ ؎ تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۳۴۶



کی تعبیر صرف ایک مقام پر نظر آتی ہے اور وہ ایسے لوگوں کے متعلق ہے جو حقائق چھپا کر آیات الٰہی میں ردو بدل کر کے نفع کماتے ہیں۔ ان کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب و یشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یأکلون فی بطونھم الا النار

جو لوگ خداوند عالم کی آیتوں کو چھپاتے ہیں اور ان کے ذریعے معمولی سا فائدہ اٹھاتے ہیں وہ آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۷۴)۔

و سیصلون سعیرا

"سیصلی" اصل میں صلی (بروزن درد) کے مادے سے آگ میں داخل ہونے اور جلنے کے معنی میں ہے اور سعیر کے معنی ہیں بھڑکتی ہوئی آگ۔

قرآن اس آیت میں بتاتا ہے کہ اس دنیا میں آگ کھانے کے علاوہ وہ بہت جلد آخرت میں بھی بھڑکتی ہوئی آگ میں جائیں گے جو انہیں بری طرح جلائے گی۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال کا ظاہری چہرے کے علاوہ ایک حقیقی چہرہ بھی ہے، جو اس دنیا میں ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے لیکن یہ باطنی چہرے آخرت میں ظاہر ہو جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمل مجسم حالت میں پیش ہوں گے۔

قرآن فرماتا ہے: جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں اگرچہ ان کے عمل کا ظاہری چہرہ رنگین و لذیذ غذاؤں سے فائدہ اٹھاتے دکھائی دیتا ہے لیکن ان غذاؤں کا اصلی چہرہ جلانے والی آگ ہے اور یہی وہ چہرہ ہے جو قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ حقیقی چہرہ ہمیشہ اس عمل کی ظاہری حالت کے ساتھ خاص مناسبت رکھتا ہے۔ جس طرح یتیم کا مال کھانا اور اس کے حقوق چھیننا، اس کے دل کو جلاتا اور اس کی روح کو تڑپاتا ہے (اسی طرح) اس عمل کا حقیقی چہرہ جلانے والی آگ ہے۔ اس امر کی طرف (اعمال کے حقیقی چہرے) ان لوگوں کے لیے جو ان حقائق پر ایمان رکھتے ہیں، توجہ دینا غلط کام کرنے سے روکنے کے لیے بہت ہی کارگر ہے۔ کیا کوئی ایسا شخص ہے جو اپنے ہاتھ سے آگ کے انگارے اٹھا کر اپنے منہ میں رکھے اور نگل جائے؟ اسی طرح ایماندار لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ یتیم کا مال کھائیں۔ اگر ہم یہ دیکھتے کہ خدا والے گناہ کا تصور تک نہیں کرتے تھے تو اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ وہ علم و ایمان کی طاقت اور اخلاقی تعلیم و تربیت کے اثر سے اعمال کے اصلی چہروں کو دیکھتے تھے، اس لیے کبھی بُرا کام کرنے کا خیال تک نہ کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک نادان اور بے خبر بھولا بھالا بچہ جلانے والی آگ کے انگارے کی دل خوش کرنے والی روشنی دیکھ کر اس پر ایسا لٹو ہو جائے کہ اُسے اچانک ہاتھ میں لے لے لیکن ایک سمجھدار انسان جو آگ کے جلانے کی صفت کو بار ہا آزما چکا ہے وہ یہ حماقت نہیں کرتا۔ وہ کبھی اس کا تصور بھی نہ کرے گا۔ یتیموں کے مال میں دست درازی کرنے کے بارے میں بہت زیادہ دل ہلا دینے والی احادیث و روایات ہیں۔ یہاں تک کہ یتیموں کے مال میں تھوڑی سے تھوڑی زیادتی بھی ان احکام کی روشنی میں قابل گرفت ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقرؑ یا حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ کسی نے سوال کیا کہ یہ آگ کی سزا یتیم کا کتنا مال غصب کرنے پر ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا:



دو درہم کے برابر ہے

۱۱۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

۱۲۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ○

حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے



ترجمہ

۱۱ خدا تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ (میراث میں سے) ایک بیٹے کا دو بیٹیوں کے برابر حصّہ ہے اگر تمہاری (دو یا) دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو میراث کی دو تہائی ان کے لیے ہے اور اگر ایک ہو تو اس کے لیے آدھی میراث ہے۔ اور (مرنے والے کے) باپ اور ماں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصّہ ہے اگر اس کی اولاد ہو۔ (بصورت دیگر) اگر اس کے اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ اس کی میراث لیں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصّہ ہے اور اگر اس کے بھائی موجود ہوں تو اس کی ماں چھٹا حصّہ لے گی (اور باقی چھ میں سے پانچ حصّے اس کے باپ کے لیے ہیں) یہ سب کچھ اس وصیت پر عمل کر چکنے کے بعد ہے جو مرنے والا کر گیا ہے، قرض ادا کرنے کے بعد۔ تم نہیں جانتے کہ باپ اور ماؤں اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔ یہ خدائی حکم ہے اور وہ دانا اور حکیم ہے۔

۱۲ اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں کی میراث میں سے آدھا ہے اگر ان کے ہاں اولاد نہ ہو اور اگر انکی اولاد ہو تو ان کی وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد چوتھا حصہ ہے اور تمہاری بیویوں کے لیے تمہاری میراث کا چوتھا حصّہ ہے، اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کا تمہاری وصیت کی تکمیل اور قرض کی ادائیگی کے بعد آٹھواں حصّہ ہے اور اگر کوئی ایسا شخص ہو کہ کلالہ (ایک بہن یا ایک بھائی) اس کی میراث لے یا کوئی عورت ہے کہ جس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصّہ ہے (اگر بھائی اور بہنیں مادری ہوں) اور ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ وصیت کو پورا کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد تیسرے حصّہ میں برابر برابر شریک ہیں۔ بشرطیکہ (وصیت کے طریقے اور قرض کا اقرار) انہیں نقصان نہ پہنچائے۔ یہ خدا کی سفارش ہے اور وہ جاننے والا اور حکیم ہے۔

شانِ نزول

صدر اسلام کے مشہور شاعر حسان بن ثابت کا بھائی عبدالرحمٰن بن ثابت انصاری فوت ہو گیا۔ اس کی ایک بیوی اور پانچ بھائی تھے عبدالرحمٰن کے بھائیوں نے میراث اپنے درمیان تقسیم کرلی اور اس کی بیوی کو کچھ نہ دیا۔

گذشتہ صفحہ کا حاشیہ
۱۔ تفسیر برہان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔



یہ واقعہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا گیا اور میراث لینے والوں کی شکایت کی گئی۔ اس پر آیاتِ مندرجہ بالا نازل ہوئیں۔ ان میں شوہر اور بیوی کی میراث کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ نیز حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

> میں بیمار ہوگیا تھا۔ جب حضورؐ میری عیادت کے لیے تشریف لائے تو میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ نے پانی منگوایا کچھ پانی سے وضو فرمایا، باقی مجھ پر چھڑک دیا تو میں ہوش میں آگیا۔ میں نے عرض کیا: اے خدا کے رسول! میرے بعد میرے مال کا کیا ہوگا۔ آپ خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں وارثوں کے حصے معین ہوگئے۔

میراث ایک فطری حق ہے

اس سے پہلے کہ ہم ان آیات کی تفسیر قلم بند کریں چند ایک نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ یہ خیال کریں کہ بہتر ہے کہ کسی کی وفات کے بعد اس کے مال کو عام مال کا حصہ قرار دے کر اُسے بیت المال میں جمع کرا دیا جائے۔ لیکن غور و فکر کرنے کے بعد یہ امر کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ یہ کام بالکل عدالت کے خلاف ہے۔ کیونکہ میراث کا مسئلہ سو فی صد ایک فطری اور منطقی مسئلہ ہے۔ جب ماں باپ اپنی بعض جسمانی اور روحانی صفات قانونِ وراثت کے مطابق اپنی اولاد میں منتقل کرتے ہیں تو پھر ان کے مال کو اس قانون سے کس طرح مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ جائز مال ہر شخص کی محنت و مشقت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر وہ جو کوشش کرتا ہے اور طاقت صرف کرتا ہے وہ مال سے ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسی بنا پر ہم ہر شخص کو اس کے ہاتھ کی محنت کا فطری طور پر مالک سمجھتے ہیں اس لیے جب موت کے وقت انسان کا ہاتھ اپنے مال تک نہیں پہنچ سکتا تو عدل کا یہی تقاضا ہے کہ یہ مال ان افراد کے پاس چلا جائے جو مرنے والے کے نزدیک ترین رشتہ دار ہوں حقیقت میں ان اشخاص کا وجود اس کے اپنے وجود کی بقا شمار ہوگا۔

اسی لیے بہت سے لوگ اتنا سرمایہ رکھنے کے باوجود جو ان کی زندگی کے لیے بخوبی کافی ہو سکتا ہے پھر بھی اپنے کاروبار کو بڑھانے کی لگاتار کوشش کرتے رہتے ہیں، ان کا مقصد اپنی اولاد کے مستقبل کی حفاظت کرنا اور اُسے روشن کرنا ہے۔ یعنی قانونِ وراثت ملک کی اقتصادی گاڑی کو زیادہ متحرک اور فعال بنا سکتا ہے۔ اگر ہر شخص کا مال اس کی موت کے بعد اس سے بالکل الگ کر دیا جائے اور اُسے عام مال قرار دے دیا جائے تو ممکن ہے کہ اقتصادی سرگرمیاں اور چہل پہل ختم ہو کر رہ جائے۔ اس گفتگو کا شاہد وہ واقعہ ہے جو فرانس میں پیش آیا ہے۔ کہتے ہیں: اب سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ فرانس کی پارلیمینٹ کے نمائندوں نے میراث کے قانون کو لغو قرار دیا۔ اس کی بجائے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کوئی چھوڑ جائے اسے پبلک کا مال سمجھ کر ضبط کر لیا جائے اور اسے عوام الناس کی ضروریات میں اس طرح خرچ کیا جائے کہ اس شخص سے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی کو کچھ بھی نہ دیا جائے لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد اس قانون کے بُرے اقتصادی اثرات ظاہر ہو گئے اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس قانون نے ملک کی درآمد اور برآمد پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اس سے اقتصادی سرگرمیوں میں بہت کمی واقع ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان حالات نے اقتصادیات کے ماہرین کو پریشان کر دیا۔



انہوں نے اس کا بنیادی سبب قانونِ میراث پر غلط عمل قرار دیا۔ اس لیے اس پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ بنابریں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قانونِ میراث حکمِ شرعی کے علاوہ ایک فطری اور طبعی امر بھی ہے۔ یہ اقتصادی سرگرمیوں کی فعالیت میں ایک گہرا اثر رکھتا ہے۔

میراث گذشتہ اقوامِ عالم میں

وراثت کا قانون فطری بنیادوں پر قائم ہے اس لیے وہ گزری ہوئی قوموں میں بھی مختلف شکلوں میں دکھائی دیتا ہے اگرچہ بعض لوگ یہودیوں کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں قانونِ وراثت کا وجود نہیں تھا لیکن موجودہ تورات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون بڑی تفصیل کے ساتھ سفر "اعداد" میں موجود ہے۔ اس میں ہے:

اور بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے بیٹا نہ ہو تو اس کی میراث بیٹی کو دے دو اگر بیٹی بھی نہ ہو تو اس کا ورثہ اس کے بھائیوں کو دے دو اگر بھائی بھی نہ ہو تو اس کی میراث اس کے باپ کے بھائیوں کو دے دو اگر اس کے باپ کا کوئی بھائی نہیں ہے تو اس کے پس ماندگان میں سے جو بھی اس کا زیادہ نزدیکی رشتہ دار ہے اُسے ترکہ دے دو۔ تاکہ وہ اس کا وارث بن جائے اور یہ امر بنی اسرائیل کے لیے واجب ہے۔ اس لیے کہ خداوند عالم نے موسیٰ کو یہ حکم دیا ہے[1]

مندرجہ بالا فقروں سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل میں میراث کا تعلق صرف اہلِ نسب ہی سے تھا کیونکہ اس میں شروع سے آخر تک بیوی اور شوہر کا نام نہیں ہے۔

دینِ مسیحی میں اس قانون کو معتبر سمجھا جائے گا کیونکہ موجودہ انجیل میں منقول ہے کہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

میں اس لیے نہیں آیا کہ تورات کے احکامات میں کوئی ردوبدل کروں۔

اسی لیے ان کی موجودہ کتب و رسائلِ مذہبی میں میراث کی کوئی بحث نہیں پائی جاتی۔ صرف چند مقامات پر لفظ ارث کے مشتقات پر گفتگو کی گئی ہے جو سب کی سب معنوی یا اخروی میراث کے بارے میں صحیح ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں تین طریقوں سے میراث ملتی تھی:

۱۔ نسب اس سے مراد ان کے ہاں صرف بیٹے اور مرد تھے۔ بچے اور عورتیں ترکے سے قطعی طور پر محروم تھیں۔

۲۔ متبنیٰ۔ یعنی ایسا بیٹا جسے ایک خاندان نے دھتکار دیا ہو اور دوسرے نے اُسے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو یہ دراصل منہ بولا بیٹا ہوتا تھا۔ اس صورت میں اس منہ بولے بیٹے اور اس کے منہ بولے باپ کے درمیان قانونِ وراثت جاری ہو جاتا تھا۔

۳۔ عہد و پیمان۔ دو آدمی آپس میں معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ زندگی بھر ایک دوسرے کا دفاع کریں گے اور مرنے کے بعد ایک دوسرے کے رازدار اور وارث رہیں گے۔

اسلام نے میراث کے فطری اور طبعی قانون کو ان خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور ظالمانہ تفریقات جو ایک طرف عورت مرد

---

[1] سفر اعداد آیات ۸ - ۱۱



اور دوسری طرف چھوٹے بڑے کے درمیان تھیں، انہیں دور کر دیا۔

اسلام نے تین چیزوں کو میراث کا سرچشمہ قرار دیا۔ اسلام سے پہلے یوں نہ تھا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

۱۔ نسب اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ یعنی ہر قسم کا تعلق جو تولد کے ذریعے دو اشخاص کے درمیان مختلف سطحوں میں ظاہر ہو۔ چاہے وہ مرد عورت ہوں چاہے چھوٹے بڑے۔

۲۔ سبب یعنی ایسے روابط جو شادی کے ذریعے مختلف افراد کے درمیان پیدا ہو جائیں۔

۳۔ ولاء اس سے مراد ایسے روابط ہیں جو نسبی یا سببی رشتہ داری کے علاوہ دو اشخاص میں پیدا ہوں مثلاً عتق یعنی اگر کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر دیتا ہے اور موت کے بعد غلام اپنا کوئی نسبی یا سببی رشتہ دار نہیں چھوڑتا تو اس کا مال آزاد کرنے والے کو مل جائے گا اور یہ خود غلام آزاد کرنے کی ایک جزا اور ترغیب ہے۔

اسی طرح ولاء ضمان جریرہ ہے یہ ایک خاص معاہدہ تھا جو دو افراد کے درمیان ان کی خواہش اور ارادے سے قائم ہو جاتا تھا اور طرفین یہ امر اپنے ذمے لیتے تھے کہ وہ مختلف مواقع پر ایک دوسرے کا دفاع کریں گے اور مرنے کے بعد (جبکہ ان کے درمیان کسی قسم کی نسبی یا سببی رشتہ داری بھی نہ ہو) ایک دوسرے کی میراث لیں گے۔

اسی طرح ولاءِ امامت ہے یعنی اگر کوئی شخص دنیا سے چل بسے اور اپنے بعد کسی قسم کا نسبی اور سببی رشتہ دار نہ چھوڑے تو اس کی میراث امام کو یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے بیت المال کو ملے گی۔ البتہ مندرجہ بالا طبقات کے لیے شرطیں اور احکام ہیں جو کتبِ فقہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

تفسیر

یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔

اس آیت میں وارثوں کے پہلے طبقے (اولاد اور ماں باپ) کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ واضح ہے کہ ربط و تعلق کی رو سے کوئی رشتہ اولاد، ماں اور باپ سے زیادہ قریبی نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن نے انہیں میراث کے دیگر طبقات پر مقدم رکھا ہے۔ پہلی آیت میں فرماتا ہے: خدا تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں سفارش اور وصیت کرتا ہے کہ بیٹوں کو بیٹیوں کی نسبت دوگنا حصہ دو۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ترتیبِ آیت اور طرزِ بیان کے لحاظ سے بیٹیوں کی میراث کو جڑ قرار دیا گیا ہے اور بیٹوں کے ورثے کو شاخ۔ کیونکہ (بیٹیوں کا حصہ مقرر) کر کے بیٹوں کا حصہ مقرر کیا گیا ہے کہ بیٹے بیٹیوں سے دوگنا حصہ لیں گے اور یہ بیٹیوں کو میراث دینے کے لیے ایک طرح کی تاکید ہے اور زمانہ جاہلیت کی بدعتوں کا مقابلہ ہے کیونکہ وہ بیٹی کو بالکل محروم کر دیتے تھے۔ باقی رہا ان دونوں کی میراث کے تفاوت و فرق کا فلسفہ تو وہ عنقریب بیان کیا جائے گا۔

فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک۔

اگر مرنے والے کی اولاد صرف دو لڑکیاں یا ان سے زیادہ ہوں تو انہیں مال کا دو تہائی (⅔) ملے گا۔

وان کانت واحدۃ فلھا النصف



لیکن اگر ایک بیٹی ہو تو اُسے مال کا نصف ملے گا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں قرآن فرماتا ہے: "فوق اثنتین" یعنی اگر دو بیٹیوں سے زیادہ ہوں تو دو تہائی مال ان کا ہے اس بنا پر یہ آیت دو لڑکیوں کے حکم سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے کیونکہ اس نے صرف ایک یا چند بیٹیوں کا حکم بیان کیا ہے۔

اس سوال کا جواب آیت کے پہلے حصے پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

للذکر مثل حظ الانثیین

یعنی — لڑکا لڑکی سے دوگنا حصہ لے گا۔

اگر کسی مرنے والے کے پس ماندگان میں فقط ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہو تو بیٹی کا حصہ ایک تہائی اور بیٹے کا دو تہائی ہوتا ہے۔ بنا بریں اس کے مطابق دو بیٹیوں کا حصہ دو تہائی ہوگا۔ شاید اسی وجہ سے بعد میں آنے والے جملے میں دو بیٹیوں کے حصہ کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ چند بیٹیوں کے حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دو تہائی سے نہیں بڑھتا (غور فرمائیے گا)۔

نیز سورۂ نسا کی آخری آیت پر غور و فکر کرنے سے بھی یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس آیت میں ایک بہن کا حصہ (ایک بیٹی کی طرح) آدھا قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں دو تہائی مال ملے گا۔ اس حکم سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ دو بیٹیوں کا حصہ بھی دو تہائی ہے۔

اس کے علاوہ یہ تعبیر عربی ادب میں دکھائی دیتی ہے، وہ کبھی کہتے ہیں "فوق اثنتین" جس سے مراد ہوتا ہے (اثنتان وما فوق) یعنی دو یا دو سے زیادہ۔

ان تمام امور کو چھوڑتے ہوئے حکم مذکور فقہِ اسلامی اور منابعِ حدیث کے لحاظ سے تسلیم شدہ ہے فرض کیجئے کہ مندرجہ بالا جملے میں شک و شبہ کی گنجائش ہے تو وہ مصادرِ حدیث پر ایک نگاہ ڈالنے سے دور ہو جاتا ہے۔

مرد کی میراث عورت سے دوگنی کیوں ہے؟

بظاہر تو مرد کا ورثہ عورت سے دوچند ہے لیکن غور کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ایک لحاظ سے عورت کی میراث مرد سے دوگنی ہے اور یہ اس حمایت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہے جو اسلام نے عورت کے حقوق کی فرمائی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مردوں کی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھا جائے تو مرد کی آدھی آمدنی عملی طور پر عورتوں پر خرچ ہوتی ہے۔ جبکہ عورت کے ذمہ ایسی کوئی چیز نہیں۔ مرد کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کی زندگی کے لوازمات اس کی ضرورت کے مطابق مکان، لباس، خوراک اور دیگر ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ چھوٹے بچوں کی زندگی کی ضروریات بھی مرد کے ذمہ ہیں۔ جبکہ عورتوں کے ذمہ یہ لوازم نہیں ہیں یہاں تک کہ اپنی ضروریاتِ زندگی بھی ان کے ذمہ نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ایک عورت یہ کر سکتی ہے کہ وہ اپنی تمام میراث کو اپنی بچت کے طور



پر رکھے جبکہ مرد اپنے اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کے لیے مجبور ہے اس کا عملی نتیجہ یہی نکلے گا کہ مرد کی آدھی آمدنی عورت پر اور آدھی اپنے پر خرچ ہوگی جبکہ عورت کا حصہ جوں کا توں باقی رہ جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل مثال کی طرف توجہ فرمائیے:

فرض کیجئے کہ دنیا کی کل دولت ۳۰ ارب روپے ہے۔ جو میراث کی رو سے عورتوں، مردوں، بیٹیوں اور بیٹوں میں بانٹی جاتا ہے اب دنیا کے تمام مردوں کی آمدنی کا عورتوں کی آمدنی کے ساتھ بلحاظ میراث حساب کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس رقم میں سے ۲۰ ارب مردوں کے ہیں اور دس ارب عورتوں کے۔ جب معمول کے مطابق عورتوں کی شادی ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ ان کے لوازماتِ زندگی کا تمام تر بوجھ مردوں پر ہوگا۔ اس طرح عورتیں اپنے حصہ کا دس ارب روپیہ بچا سکتی ہیں کیونکہ وہ عملی طور پر مردوں کے ۲۰ ارب روپے میں شریک ہیں وہ ان پر اور ان کی اولاد پر خرچ ہوگا۔

اس طرح مردوں کا آدھا حصہ (دس ارب روپے) عورتوں پر خرچ ہوگا۔ اب اگر اس کے ساتھ اس دس ارب روپے کو بھی جمع کیا جائے جو انہوں نے بچایا ہے تو یوں یہ رقم مجموعی طور پر ۲۰ ارب روپے بنتی ہے۔ جو پوری دنیا کے سرمایہ کا دو تہائی ہے جبکہ مرد عملی طور پر ۱۰ دس ارب روپے سے زیادہ اپنے پر خرچ نہیں کر سکتے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خرچ اور فائدہ اٹھانے کے لحاظ سے عورتوں کا اصلی حصہ مردوں کے حقیقی حصہ سے دوگنا ہے یہ فرق اس لیے ہے کہ عموماً عورتوں میں روپیہ کمانے کی صلاحیت کم ہے۔ یہ اسلام کی طرف سے عورتوں کی منطقی اور عادلانہ حمایت ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر عورتوں کا حصہ آدھا ہے۔ مگر ان کا حقیقی حصہ مردوں سے زیادہ مقرر کیا گیا ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ آثارِ اسلامی کی طرف رجوع کرنے سے ہمیں اس نکتے کا سراغ ملتا ہے کہ مندرجہ بالا سوال اسلام کے شروع میں ہی لوگوں کے ذہن میں تھا اور وہ کبھی کبھار اس سلسلے میں رہبرانِ اسلام سے سوالات بھی کر لیا کرتے تھے۔ جو جوابات ان بزرگانِ اسلام (ائمہ اہلِ بیتؑ) نے اس سوال کے دیئے ہیں، غالباً وہ سب ایک ہی مضمون کے ہیں اور وہ یہ کہ:

> خداوندِ عالم نے زندگی کے اخراجات اور حقِ مہر مردوں کے ذمہ لگایا ہے۔ اس بنا پر ان کا حصہ بھی زیادہ مقرر کیا گیا ہے۔

کتاب "معانی الاخبار" میں حضرت علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:

> یہ جو میراث میں عورتوں کا حصہ مردوں کی نسبت آدھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عورت کی شادی ہوتی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ لیتی ہے اور مرد مجبور ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ دے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے اخراجات مردوں کے کندھے پر ہیں۔ جبکہ عورت مرد کے اخراجات اور اپنے اخراجات سے بے فکر ہے۔

ماں باپ کی میراث

باقی رہا ماں باپ کا ورثہ جو پہلے طبقہ کا حصہ ہیں اور ورثہ کے لحاظ سے اولاد کے برابر ہیں (یعنی طبقہ اول سے تعلق رکھتے ہیں)۔

ان کی میراث وہی ہے جو مندرجہ بالا آیت میں آچکی ہے۔ اس کی تین حالتیں ہیں:



پہلی یہ کہ مرنے والے کی ایک یا کئی بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو اس صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصّہ ملے گا
(ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک ان کان لہ ولد)۔

دوسری یہ کہ مرنے والے کی کوئی اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔ اس صورت میں ماں کا حصّہ کل مال کا ایک تہائی ہے (فان لم یکن لہ ولد و ورثہ ابواہ فلامہ الثلث)۔ یہاں باپ کے حصّہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا حصّہ واضح ہے یعنی دو تہائی ($\frac{2}{3}$) ہے۔ البتہ اگر مرنے والے کی بیوی ہو یا مرنے والی کا شوہر موجود ہو تو اس صورت میں بیوی یا شوہر کا حصّہ باپ کے حصّہ میں سے منہا ہو جائے گا۔ یعنی اس صورتِ حال میں باپ کا حصّہ دوسری شق میں تبدیل ہو جائے گا۔

تیسری یہ ہے کہ صرف ماں باپ وارث ہوں۔ اولاد نہ ہو۔ لیکن مرنے والے کے پدری مادری (سگے بھائی) یا صرف پدری (سوتیلے) بھائی موجود ہوں۔ تو اس صورت میں ماں کا حصّہ ایک تہائی کی بجائے چھٹا ($\frac{1}{6}$) ہو جائے گا۔ حقیقت میں اگرچہ بھائی میراث نہیں لیں گے لیکن اس صورت میں ماں اضافی مقدار نہ لے سکے گی۔ اسی بنا پر انہیں "حاجب" کہتے ہیں (فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس)۔

اس حکم کا فلسفہ واضح ہے کئی بھائیوں کا ہونا باپ کے زندگی کے بوجھ کو بڑھاتا ہے کیونکہ باپ ان کے اخراجات کا کفیل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں بلکہ جوان ہونے کے بعد بھی ان کے کئی اخراجات باپ کو اٹھانا پڑتے ہیں۔ اسی لیے وہ بھائی، ماں کے حصّے کی کمی کا سبب بنتے ہیں۔ اگر وہ ماں باپ یا صرف باپ کی طرف سے بھائی ہوں تو وہ بھائی جو صرف ماں کی طرف سے ہیں ان کی کسی قسم کی ذمہ داری باپ پر نہیں، وہ "حاجب" نہیں بنتے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے اس آیت میں بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

فان کان لہ اخوۃ

اگر اس شخص (متوفی) کے کئی بھائی ہوں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عربی میں جمع کم از کم تین کے لیے ہے۔ جبکہ تمام فقہائے اسلام کا یہ طے شدہ نظریہ ہے کہ دو بھائی بھی حاجب ہیں اور ان کی وجہ سے ماں کا حصّہ $\frac{1}{3}$ کی بجائے $\frac{1}{6}$ ہو جاتا ہے۔

اس سوال کا جواب قرآن کی دوسری آیات کی طرف متوجہ ہونے سے واضح ہو جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام مقامات پر جمع کا لفظ تین یا تین سے زیادہ افراد کے لیے بولا جائے بلکہ کئی مقامات پر یہ لفظ دو افراد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً سورۂ انبیاء کی آیت ۸۰ میں:

وکنا لحکمھم شاھدین

یہ آیت حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے فیصلوں سے تعلق رکھتی ہے اور قرآن نے ان دونوں بزرگوں کے لیے ضمیر جمع (ھم) استعمال کی ہے یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات جمع کا لفظ دو افراد کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ بات شاہد اور قرینہ کی محتاج ہے۔ زیرِ بحث آیت کے اسی مفہوم پر مسلمانوں کا اتفاق اور اجماع ہے اور رہبرانِ اسلام کی طرف سے بھی اس پر دلیل موجود



ہے۔ اس مسئلہ میں (ابن عباس کے سوا) سب علمائے اسلام چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی کا اتفاق ہے کہ دو بھائی بھی اس آیت کے حکم میں شامل ہیں۔

میراث، وصیت اور قرض کے بعد ہے

من بعد وصیۃ یوصی بہا او دین

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے کہ وارث مال کو اپنے درمیان اس وقت تقسیم کر سکتے ہیں جبکہ مرنے والے نے وصیت نہ کی ہو اور کسی کا قرض اس کے ذمہ ہو۔ اگر وہ وصیت کر گیا ہے یا وہ کسی کا مقروض ہے تو پہلے وصیت کی تعمیل اور قرض کی ادائیگی ضروری ہے (البتہ جیسا کہ باب وصیت میں تحریر کیا جاچکا ہے کہ وصیت کرنے والا اپنے مال کے تہائی حصہ تک کی وصیت کر سکتا ہے اگر وہ اس سے زیادہ مال کی وصیت کرے تو درست نہیں ہے ہاں البتہ وارث اجازت دے دیں تو صحیح ہے)۔

اٰبائکم و ابناؤکم لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعا۔

خداوند عالم اس آیت میں فرماتا ہے تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے باپ دادا اور اولاد میں سے تمہارے لیے کون زیادہ مفید ہے یعنی قانونِ میراث نوعِ بشر کے حقیقی اور اصلی مصالح اور مفادات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے اور ان مصلحتوں کی تشخیص خدا ہی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ انسان ہر مقام پر اپنی بہتری کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کریں کہ ماں باپ انسان کی بہت سی ضروریات کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے انہیں میراث میں اولاد پر مقدم ہونا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگ اس کے برعکس سوچیں۔ ان حالات میں اگر میراث کا قانون لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو اس میں طرح طرح کے اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے لیکن خداوند عالم جو حقائق کو جس طرح کہ وہ ہیں بخوبی جانتا ہے۔ اس نے قانونِ میراث کے مثبت نظام کو جس میں نوعِ بشر کی بھلائی ہے مقرر فرمایا۔

فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیما حکیما

یہ ایک ایسا قانون ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے واجب ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

یہ جملہ گذشتہ مطالب کی تاکید کے لیے آیا ہے تاکہ لوگ میراث سے مربوط قوانین کے بارے میں کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔

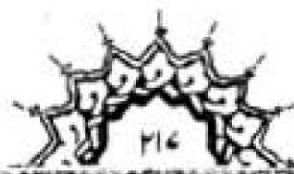
میراث میں میاں بیوی کا ایک دوسرے سے حصّہ

ولکم نصف ما ترک ازواجکم ان لم یکن لھن ولد

گذشتہ آیت میں اولاد اور ماں باپ کے حصّہ کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ یہاں میاں بیوی کے ایک دوسرے سے میراث لینے کی کیفیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ آیت کہتی ہے مرد صاحبِ اولاد نہ ہو تو اپنی بیوی کے مال میں سے آدھی میراث لے گا لیکن اگر اس کے ایک یا کئی بچے ہوں (چاہے وہ کسی اور شوہر کے کیوں نہ ہوں) تو پھر شوہر مال کا ایک چوتھائی (۱/۴) حصّہ لے گا۔

فان کان لھن ولد فلکم الربع مما ترکن

البتہ یہ تقسیم بھی بیوی کا قرض ادا کرنے اور اس کی مالی وصیتوں کو پورا کرنے کے بعد ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:



من بعد وصیۃ یوصین بھا او دین

رہی بیویوں کی میراث اپنے شوہر کے مال سے جبکہ شوہر کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ مال کا چوتھائی حصہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:
ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد لیکن اگر شوہر کی اولاد ہو (چاہے یہ اولاد کسی اور بیوی سے ہو) تو پھر عورتوں کا آٹھواں حصہ ہو گا (فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم)۔
یہ تقسیم میراث بھی پہلی تقسیم کی طرح شوہر کے قرضوں کی ادائیگی اور مالی وصیت پوری کرنے کے بعد ہو گی (من بعد وصیۃ توصون بھا او دین)۔
قابل توجہ امر یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کا حصہ اولاد کی موجودگی میں آدھا ہے۔ یہ اولاد کے حقوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہے۔
اس بات کا سبب کہ شوہر کا حصہ عورت سے دوگنا قرار دیا گیا ہے، وہی ہے جو گذشتہ بحث میں تفصیل کے ساتھ بیٹے اور بیٹی کی میراث کے بارے تحریر کیا جا چکا ہے۔
اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ جو حصہ عورتوں کے لیے مقرر ہوا ہے (چاہے وہ چوتھا ہو یا آٹھواں) وہ ایک بیوی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر مرد کی کئی بیویاں ہوں تو بھی مذکورہ حصہ ان سب کے درمیان مساوی تقسیم ہو گا۔ آیہ مذکورہ بالا کا ظہور یہی ہے۔

بھائیوں اور بہنوں کی میراث

و ان کان رجل یورث کلالۃ

اس آیت میں ہمیں ایک نیا لفظ ملا ہے جو قرآن میں صرف دو مقام پر آیا ہے۔ ایک زیر بحث آیت میں اور دوسرے سورۂ نساء ہی کی آخری آیت میں اور وہ ہے لفظ "کلالہ"۔ لغات کی کتابیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ "کلالہ" اصل میں مصدری معنی رکھتا ہے اور "کلال" کے معنی میں ہے۔ جس کا مطلب ہے "قوت و توانائی کا ختم ہو جانا"[1]
لیکن یہ لفظ بعد میں ان بہن بھائیوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو متوفی کی میراث لیتے ہیں شاید اس کی وجہ اور مناسبت یہ ہے کہ بھائی اور بہنیں میراث کے دوسرے طبقے کا جزو ہیں اور صرف ماں باپ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں وارث ہوتے ہیں اور ایسا شخص جس کے ماں باپ اور اولاد نہ ہو یقیناً رنج و مصیبت میں ہوتا ہے اور اپنی طاقت اور توانائی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔
اس لیے انہیں "کلالہ" کہا جاتا ہے۔ راغب مفردات میں لکھتا ہے کہ "کلالہ" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو متوفی کی میراث اس صورت میں لے جبکہ اس کے ماں باپ، اولاد اور اولاد در اولاد نہ ہو۔ لیکن ایک اور روایت جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "کلالہ" عنوان اور نشان ہے ایسے شخص کے لیے جو دنیا سے اس حالت میں چل بسا ہو کہ اس کے ماں باپ ہوں نہ اولاد ہو۔
نیز اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ کلالہ کا لفظ متوفی کے لیے بولا جائے اور اس قسم کے رشتہ داروں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہو۔ جیسا کہ اس نے اپنی کتاب میں اس موضوع کی وضاحت کی ہے۔

---

[1] صحاح اللغۃ میں ہے۔ "الکلالۃ فی الاصل مصدر بمعنی الکلال وھو ذھاب القوۃ"۔



باقی رہا یہ کہ قرآن مجید نے بہن بھائیوں کے الفاظ کی بجائے لفظ کلالہ کیوں چنا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایسے اشخاص جن کے ماں باپ ہوں نہ اولاد، وہ یہ بات مدِ نظر رکھیں کہ ان کا مال ایسے لوگوں کے ہاتھ آئے گا جو اس کی کمزوری اور ناتوانی کی نشانی ہیں۔ اس لیے قبل ازیں کہ غیر لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں وہ خود اس مال کو ضروری مواقع ضرورت مند لوگوں کی مدد اور اجتماعی فلاح و بہبود میں خرچ کرے۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں:

وان کان رجل یورث کلالۃ او امراۃ و لہ اخ او اخت فلکل واحد منھما السدس

یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا سے اٹھ جائے اور بہن بھائی اس کی میراث لے لیں یا کوئی عورت دنیا سے چل بسے اور اس کا ایک بھائی اور ایک بہن زندہ ہو تو ان میں سے ہر ایک اس کے مال کا چھٹا حصّہ لے گا۔

یہ اس صورت میں ہے جب کہ متوفی کا ایک بھائی یا بہن باقی رہ گئے ہوں اور اگر وہ ایک سے زیادہ ہوں تو پھر وہ کل مال کی ایک تہائی لے لیں گے۔ یعنی ان کو چاہیے کہ ایک تہائی مال آپس میں بانٹ لیں (فان کانوا اکثر من ذٰلک فھم شرکاء فی الثلث)۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین۔

یہ اس صورت میں ہے جبکہ وصیت پہلے پوری ہو چکی ہو اور قرض ادا کیا جا چکا ہو (غیر مضار) یعنی اس حالت میں جبکہ وصیت اور قرض میں وارثوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی پہلو نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت نہ کرے کیونکہ ان روایتوں کے مطابق جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت سے مروی ہیں ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کرنا گویا وارثوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ ایسی وصیت کی تعمیل وارثوں کی اجازت سے ہوگی یا یہ کہ وارثوں کو محروم کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کے لیے مقروض نہ ہوتے ہوئے خواہ مخواہ قرض کی ادائیگی کا ذکر کر دیا جائے۔

آخر میں تاکید کے طور پر فرماتا ہے:

وصیۃ من اللہ و اللہ علیم حلیم

یعنی۔ یہ خدا کی وصیت اور نصیحت ہے اس کا احترام کرنا چاہیے کیونکہ وہ تمہاری بہتری کو خوب جانتا ہے۔ جس نے یہ حکم مقرر کیے ہیں وہ وصیت کرنے والوں کی نیت سے بھی واقف ہے لیکن اس کے باوجود وہ بردبار بھی ہے چنانچہ ان لوگوں کو جو اس کے حکم کو نہیں مانتے فوراً سزا نہیں دیتا۔

چند اہم نکات

۱۔ جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں بہن بھائیوں کی میراث کے بارے میں ہے اگرچہ وہ بظاہر مطلق ہے اور پدری مادری بہن بھائیوں اور صرف پدری یا صرف مادری بھائیوں کے بارے میں ہے۔ لیکن سورۂ نساء ہی کی آخری آیت کی طرف توجہ کرنے سے جس کی تفسیر عنقریب لکھی جائے گی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد متوفی کے صرف مادری بہن بھائی ہیں (جو ماں کی طرف سے بہن بھائی ہوں)۔



جبکہ سورۂ نساء کی آخری آیت پدری مادری یا صرف پدری بہن بھائیوں کے بارے میں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس آیت کے ذیل میں اس سلسلے میں شواہد پیش کریں گے۔

اگرچہ اس بنا پر یہ دونوں آیتیں "کلالہ" بہن بھائیوں کی میراث سے بحث کر رہی ہیں اور بظاہر ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن دونوں آیات کے مضامین میں غور و فکر کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک بہن بھائیوں کی ایک خاص صورت کے متعلق وضاحت کر رہی ہے۔ بنا بریں ان دونوں آیتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔

۲۔ ظاہر ہے کہ اس طبقے کی وراثت اس صورت میں ہے جب پہلے طبقہ یعنی ماں باپ اور اولاد میں سے کوئی باقی نہ ہو۔ اس امر کی شاہد یہ آیت ہے:

"واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ"

رشتہ داروں میں سے بعض میراث کے تقرر اور تعین میں دوسروں پر ترجیح رکھتے ہیں یعنی جو مرنے والے کے زیادہ قریب ہیں وہ مقدم ہیں (انفال۔ ۷۵)

اسی طرح وہ بہت سی روایتیں جو اس سلسلے میں منقول ہیں وہ میراث کے طبقات کے تعین اور بعض کی بعض پر ترجیح پر مزید گواہ ہیں۔

۳۔ ھم شرکاء فی الثلث اگر ایک سے زیادہ (مادری بھائی اور بہنیں) ہوں تو وہ مال کے ایک تہائی میں برابر برابر کے شریک ہیں اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک تہائی مال آپس میں مساوی طور پر تقسیم کریں گے اور اس صورت میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ شراکت مطلقہ کا مفہوم حصول کا برابر برابر ہونا ہے۔

۴۔ مندرجہ بالا آیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ انسان یہ حق نہیں رکھتا کہ وصیت کے ذریعے یا ایسا قرضہ بیان کرکے جو در اصل اس کے ذمہ نہیں ہے وارثوں کے خلاف سازش کرے اور ان کا حق ضائع کرے۔ ہاں اس کی صرف یہ ذمہ داری ہے کہ جو قرضہ سچ مچ اس کے ذمہ ہے آخری موقع پر اسے بتادے اور وہ عادلانہ وصیت کا حق رکھتا ہے جس کی حد روایات کی رو سے مال کا ایک تہائی حصہ ہے۔

اس سلسلے میں رہبران اسلام کے ارشادات میں سخت ہدایات دکھائی دیتی ہیں ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

ان الضرار فی الوصیۃ من الکبائر۔

وارثوں کو نقصان پہنچانا اور انہیں بے جا وصیت کے ذریعے حق شرعی سے محروم کرنا گناہ کبیرہ ہے۔[1]

اسلام حقیقت میں اس حکم کے ذریعے ایک طرف تو اس شخص کو اس کے مال کے ایک حصہ سے اس کی وفات کے بعد بھی فائدہ ثواب پہنچانا چاہتا ہے دوسری طرف وارثوں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کینہ اور دشمنی کی وجہ سے محبت کا رشتہ جسے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہیے کمزور اور سست پڑ جائے۔

۱۳۔ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِي

[1] مجمع البیان۔



مِن تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

۱۴۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ ع

ترجمہ

۱۳ یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) سرحدیں ہیں۔ جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے (اور اس کے قوانین کی سرحدوں کا احترام کرے) وہ اُسے ایسی جنت کے باغوں میں بھیجے گا جس کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری رہتی ہیں اور یہ لوگ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

۱۴ اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی سرحدوں سے تجاوز کرے گا تو وہ اُسے ایسی آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت آمیز سزا ہے۔

تفسیر

"حدود" حد کی جمع ہے۔ اصل میں اس کا معنی ہے منع کرنا اور روکنا۔ بعد ازاں ہر اس چیز کو جو دو چیزوں کے درمیان حد فاصل ہو اور انہیں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا کرے حد کہا جانے لگا۔ مثلاً گھر کی حد، باغ کی حد، شہر کی حد اور ملک کی حد۔ گویا ایسے نقاط کو حد کہا جاتا ہے جو انہیں دوسرے نقاط سے جدا کریں۔

خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں لفظ تلک کے ذریعے میراث کے قوانین کی طرف جو گذشتہ آیات میں آچکے ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ خدا کی سرحدیں ہیں جنہیں پھاندنا اور عبور کرنا منع ہے۔ جو ان سے آگے بڑھیں گے وہ گناہگار سمجھے جائیں گے۔

تلك حدود الله کا یہ مفہوم کلام مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے اور یہ ہر جگہ اجتماعی احکامات اور مقررات بیان کرنے کے بعد آیا ہے مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں اعتکاف میں جنسی ملاپ کی ممانعت اور روزہ کے احکام کے بعد ہے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۹ اور ۲۳۰، سورۂ طلاق کی آیت ۱ میں طلاق کے کچھ احکام کے بعد اور سورۂ مجادلہ آیت ۴ میں کفارہ کے بیان کے بعد ہے۔ ان سب مواقع پر احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں جن سے آگے بڑھنا ممنوع ہے اور وہ خدائی سرحدوں کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں۔[1]

ومن یطع اللہ و رسولہ یدخلہ جنات ......

خداوند عالم ان چند خدائی حدود اور سرحدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت

---

[1] حدود اللہ کی تفسیر کے سلسلے میں اس تفسیر کی جلد ۲ میں مزید بحث ہو چکی ہے۔ اردو ترجمہ صـ۱۱ ملاحظہ کیجیے۔



کرتے ہیں اوران سرحدوں کا احترام کرتے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ جنت کے باغوں میں رہیں گے جن کے درختوں کے نیچے سدا پانی بہتا رہتا ہے۔
آیت کے آخر میں فرماتا ہے: یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے (و ذٰلک الفوز العظیم)۔

من یعص اللہ و رسولہ و یتعد حدودہ یدخلہ ناراً خالداً فیہا

آیت کا یہ حصہ ان لوگوں کے مخالف نقطۂ نظر کو بیان کرتا ہے جن کی طرف گذشتہ آیتوں میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں اوران کے احکامات کی سرحدیں پھاند جاتے ہیں وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔
البتہ ہم جانتے ہیں کہ صرف خدا کی حکم عدولی (چاہے وہ گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو) ہمیشہ کے عذاب کا سبب نہیں ہے۔ اس وجہ سے آیت مذکورہ بالا میں وہ لوگ مراد لیے گئے ہیں جو دشمنی، سرکشی، بغاوت اور آیاتِ الٰہی کے انکار کی بنا پر خداوندعالم کے احکامات کو اپنے پاؤں کے نیچے روندڈالتے ہیں۔ حقیقت میں وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اس بات کی طرف غور و فکر کرتے ہوئے کہ لفظ حدود جمع ہے اور تمام قوانینِ الٰہی پر محیط ہے، یہ معنی بعید دکھائی نہیں دیتا کیونکہ جو شخص خداوندعالم کے سب قانون توڑ دے وہ ہرگز خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ ورنہ ان میں سے کسی کا احترام تو کرتا۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ گذشتہ آیتوں میں اہل بہشت کے بارے میں خالدین فیہا (ہمیشہ جنت میں رہیں گے) جمع کی صورت میں آیا ہے اور اس آیت میں جو دوزخیوں کے متعلق ہے "خالداً فیہا" جو واحد کی شکل میں آیا ہے۔ ایسی دو آیات میں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، تعبیر کا یہ فرق اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اہل بہشت کے لیے اجتماعی زندگی ہے جو جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت شمار ہوتی ہے جبکہ اہل دوزخ عذاب الٰہی میں اس طرح پھنسے ہوئے اور ڈوبے ہوئے ہوں گے کہ انہیں دوسروں کی کوئی سدھ بدھ نہ ہوگی۔ غرض وہ عملی طور پر اکیلے ہوں گے یہاں تک کہ یہ بات اس دنیا میں اپنی رائے پر چلنے والوں اور الگ تھلگ رہنے والے لوگوں کے بارے میں مل جل کر اور اجتماعی زندگی بسر کرنے والوں کے مقابلہ میں صادق آتی ہے کہ یہ لوگ اس دنیا میں جنتی اور وہ دوزخی ہیں۔

و لہ عذاب مھین

ان کے لیے ذلیل اور رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

اصل میں گذشتہ جملے میں عذاب خداوندی کی جسمانی سزاؤں کا پہلو جھلکتا ہے اور کیونکہ اس جملہ میں ذلت و رسوائی کا تذکرہ بھی ہے اس لیے یہاں روحانی پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اسلامی قانونِ میراث کی خصوصیات

عام طور پر میراث کے قانون میں اور خاص طور پر اسلام کے میراث کے قانون میں کئی ایک خوبیاں ہیں۔ ذیل میں بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ اسلامی نظامِ میراث میں یہ خوبی ہے کہ اس میں متوفی سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بھی سلسلہ مراتب کو پیش نظر رکھتے ہوئے میراث سے محروم نہیں رہتا اور یہ جو رواج زمانہ جاہلیت کے عربوں اور بعض دوسرے ملکوں میں تھا کہ وہ عورتوں اور بچوں کو ہتھیار نہ اٹھا سکنے اور جنگ کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے میراث سے محروم کردیتے تھے اور متوفی کی دولت دُور کے رشتہ داروں



کو دے دیتے تھے، اسلام میں سرے سے اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی قانونِ میراث ان سب افراد پر محیط ہے جو مرنے والے کے ساتھ کوئی نسبت یا ربط رکھتے ہیں۔

۲ یہ قوانین جائز اور فطری ضروریاتِ انسانی کے لیے مثبت پہلو رکھتے ہیں کیونکہ انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت ایسے افراد کے ہاتھوں میں دیکھے جو اس کے جگر کا ٹکڑا ہیں اور ان کی زندگی حقیقت میں ان کی زندگی کی بقا و دوام ہے۔ اس لیے قانونِ میراث میں اولاد کا حصہ سب سے زیادہ ہے جبکہ ماں باپ اور باقی رشتہ دار وغیرہ اپنے اپنے مقام پر مناسب حصے کے حامل ہیں۔

۳ یہ قانون انسان کو زیادہ دولت کمانے اور اقتصادی گاڑی کے پہیوں کو حرکت دینے کے سلسلے میں شوق دلاتا اور ابھارتا ہے۔ کیونکہ جب انسان اپنی زندگی کی محنت کے نتیجے کو اپنے مرکزِ محبت وتعلق کے حصہ میں دیکھتا ہے تو پھر وہ چاہے کسی سن اور حالات میں ہو کام کرنے کے لیے اس کا شوق بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کی مصروفیات میں ٹھہراؤ اور وقفہ نہیں آتا۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ جب بعض ممالک میں قانونِ میراث کو لغو قرار دیا گیا اور مرنے والوں کا مال اور جائداد حکومت کو دے دیئے گئے تو جلد ہی اس ملک کے اقتصادی ماحول میں اس قانون کے منفی اثرات جمود کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس لیے انہیں مجبوراً یہ قانون ختم کرنا پڑا۔

۴ اسلام کا قانونِ میراث دولت کو ایک جگہ جمع ہونے سے روکتا ہے کیونکہ اس نظام میں ہر انتقال کے بعد دولت وثروت عادلانہ طور پر بہت سے افراد میں بانٹی جاتی ہے اس لیے یہ نظام دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے معاون ومددگار ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آج کی دنیا میں تقسیم دولت کی جو مختلف شکلیں ہیں ان سے اکثر معاشرے کو نقصان اور تکلیف پہنچی ہے۔ اسلام کا قانونِ میراث اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں مال کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ اُسے سب ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں۔

۵ اسلامی قانونِ میراث متوفی سے صرف میل جول رکھنے کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ وارثوں کی حقیقی ضرورت کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹوں کا حصہ بیٹیوں کی نسبت دوگنا ہے۔ یا بعض حالات میں باپ کا حصہ ماں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونِ اسلامی کے مطابق مرد کی زیادہ اقتصادی ذمہ داریاں ہیں عورتوں کی زندگی کا خرچ مردوں کے کندھے پر ہے۔ اسی لیے ان کو عورتوں کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔

عول اور تعصیب کسے کہتے ہیں

ہم اس مقام پر دو اہم علمی مسئلوں کا جائزہ لیتے ہیں اور وہ ہیں عول اور تعصیب۔

یہ بحث اس وجہ سے شروع ہوتی ہے کہ میراث کے حصے جس طرح گذشتہ آیات میں بیان کیے گئے ہیں بعض اوقات مجموعی مال سے کم اور زیادہ ہو جاتے ہیں مثلاً اگر دو پدری مادری بہنیں اور شوہر وارث ہوں تو ان (دو بہنوں) کی میراث دو تہائی ($\frac{2}{3}$) ہے اور شوہر کا ورثہ آدھا ترکہ ہے اور ان کا مجموعہ $\frac{7}{6}$ ہو گا یعنی کل سے $\frac{1}{6}$ زیادہ ہو جائے گا۔ یہاں یہ بحث واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کیا عادلانہ طور پر کل $\frac{1}{6}$ حصوں کی نسبت سے سب وارثوں کو کم دیا جائے یا یہ کہ مقررہ افراد سے کم کیا جائے۔



علمائے اہل سنت کے درمیان تو یہی مشہور ہے کہ سب کے حصوں سے کم کیا جائے۔ فقہی اصطلاح میں اسی کو "عول" کہا جاتا ہے (لغت میں عول کے معنی زیادتی اور بلندی کے ہیں)۔

بہر حال وہ کہتے ہیں کہ اضافی ۱/۶ دونوں گروہوں سے ان کے حصوں کے مطابق کم دیا جائے[1] اسی طرح دیگر مواقع پر بھی وہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم حقیقت میں اس موقع پر میراث کے حصہ داروں کو طلبگاروں کی طرح فرض کرتے ہیں اور مقروض تمام کے مطالبات پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اصطلاح کے مطابق وہ دیوالیہ ہو گیا ہے اور کون نہیں جانتا کہ ایسے مواقع پر طلبگاروں کے حصوں کی مناسبت سے کمی کی جاتی ہے۔

لیکن شیعہ فقہا کا نظریہ یہ ہے کہ ہمیشہ نقص خاص افراد کے مال میں ہونا چاہیے ان کے مطابق مندرجہ بالا مثال میں نقص اور کمی دونوں بہنوں کے حصہ میں کی جائے گی وہ کہتے ہیں کہ جس طرح حدیث میں آیا ہے، ممکن نہیں کہ وہ خدا جو سب چیزوں کے حساب کو یہاں تک کہ بیابان کے ریت کے ذروں کو بھی جانتا ہے میراث کے حصوں کو ایسے کیونکر قرار دے سکتا ہے کہ ان میں کمی واقع ہو۔ یقیناً ایسے مواقع پر خدا نے کوئی قانون وضع کیا ہے۔ اگر اس قانون کی طرف توجہ کر لی جائے تو کمی کا تصور نہیں ہو سکتا اور وہ قانون یہ ہے کہ وارثوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے لیے قرآن میں "حد اقل" "اور حد اکثر" مقرر نہیں ہوئی یعنی ان کا حصہ قابل تغیر ہے اور اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے۔ اس لیے مندرجہ بالا مثال میں نقص شوہر کی طرف نہیں جائے گا۔ ۱/۶ اضافی حصہ دو بہنوں کے حصہ سے کم کرنا پڑے گا (غور فرمائیے گا)۔

کبھی کبھی اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے اور حصوں کا مجموعہ کل مال سے کم ہوتا ہے اور کچھ مال بچ جاتا ہے مثلاً ایک شخص مر جاتا ہے اور ایک بیٹی اور ماں باقی رہ جاتی ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس صورت میں ماں کا حصہ ۱/۶ ہے اور بیٹی کا ۱/۲ ہے۔ جن کا مجموعہ ۴/۶ ہوتا ہے یعنی ۲/۶ بچ جاتا ہے۔ علمائے اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ بچت عصبہ (مردان کسب) یعنی بعد والے طبقے[2] کو دی جائے گی (مثلاً اس مثال میں متوفی کے بھائیوں کو دی جائے)۔ اسی کو اصطلاح میں تعصیب کہتے ہیں۔

لیکن شیعہ فقہا کا نظریہ یہ ہے کہ وہ سب مال انہی دو کے درمیان ایک اور تین کی نسبت سے بانٹ دیا جائے کیونکہ پہلے طبقے کے ہوتے ہوئے دوسرے طبقہ کی باری نہیں آتی۔ اس کے علاوہ بعد کے طبقہ کے مردوں کو اضافی مقدار دینا زمانۂ جاہلیت کے دور سے ملتا ہے جو عورتوں کو بلا وجہ میراث سے محروم کر دیتے تھے۔

مندرجہ بالا ایک پیچیدہ علمی بحث ہے جس کا خلاصہ ہم نے تحریر کر دیا ہے اس کی مزید تفصیل کے لیے کتب فقہ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۵۔ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ

---

[1] حساب کا طریقہ یہ ہے کہ عدد کسری ۱/۶ ہے جو کہ دو بہنوں کا حصہ ہے اور ۱/۲ شوہر کا حصہ ہے۔ ۱/۶ اضافی مقدار ہے اسے ۴ اور ۳ کی نسبت سے ان دونوں گروہوں کے درمیان تقسیم کر دیں۔ ریاضی میں نسبت کی تقسیم کا قاعدہ موجود ہے اس کے مطابق عمل کرتے ہوئے دونوں بہنوں کے حصہ میں ۴/۴۲ اور شوہر کے حصے میں سے ۳/۴۲ منہا کریں گے۔

[2] جو مرد بلا واسطہ یا بالواسطہ متوفی سے ربط رکھتے ہیں۔



الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ○

۱۶- وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○

ترجمہ

۱۵ اور تمہاری عورتوں میں سے جو زانی ہوں، ان پر چار مسلمان مردوں کو گواہ کے طور پر طلب کرو اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو اپنے گھروں میں بند کردو۔ یہاں تک کہ وہ مر جائیں یا خدا ان کے لیے کوئی راستہ کھول دے۔

۱۶ اور وہ مرد اور عورتیں (جو شادی شدہ نہ ہوں) اور یہ برا کام کر بیٹھیں انہیں تکلیف پہنچاؤ (ان پر حد جاری کرو) اور اگر سچ مچ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں (اور گذشتہ حرکت کی تلافی کریں) تو انہیں معاف کردو کیونکہ خداوند عالم توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

واللّاتی یأتین الفاحشۃ .....

لفظ فاحشہ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے اصل میں بہت برے کام یا بری گفتگو کے معنی میں ہے اگر یہ لفظ زنا اور عفت و پاک دامنی کے خلاف کاموں کے بارے میں استعمال ہو تو وہ بھی اسی مناسبت سے ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں تیرہ مقامات پر آیا ہے بعض مواقع پر زنا بعض جگہوں پر "لواطت" کے لیے اور بعض مقامات پر نہایت برے اور سنگین کاموں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اکثر مفسرین نے اس آیہ شریفہ کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ یہ آیت ان شوہردار عورتوں کی سزا کی طرف اشارہ کرتی ہے جو زنا کار ہوں۔ آیت مزید بتاتی ہے کہ اگر تمہاری بیویاں زنا کی تہمت سے آلودہ ہوں تو چار مسلمان مرد اس کام کے گواہوں کے طور پر بلاؤ۔ اگر وہ اس بات کی گواہی دے دیں تو پھر ان عورتوں کو گھر میں بند کردو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے۔

اس امر کی دلیل کہ مندرجہ بالا آیت زنائے محصنہ[1] کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس قرینہ کے علاوہ جو آنے والی آیت میں ہے لفظ من نسائکم (تمہاری بیویاں) بھی ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید میں بار بار آئی ہے۔ اسی وجہ سے شوہردار عورتوں کے عفت و عصمت کے منافی عمل کی سزا اس آیت میں "عمر قید" مقرر ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ آیت فوراً بلا فاصلہ کہتی ہے: (او یجعل اللّٰہ لھن سبیلا) یا یہ کہ خدا ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ یعنی ان کے لیے قید کی سزا جاری رہے یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا

---

[1] محصنہ سہاگن یا شوہردار عورت کو کہتے ہیں۔ (مترجم)



یہ کہ کوئی نیا قانون خدا کی طرف سے ان کے لیے معین ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایک وقتی حکم تھا جو شروع شروع میں نازل ہوا تاکہ آئندہ جب حالات اور افکار سازگار ہو جائیں تو ان کے بارے میں ایک نیا حکم نازل کیا جائے۔ اس موقع پر جو عورتیں اس قانون کی زد میں آتی ہیں اور ابھی تک زندہ ہیں وہ فطرتاً قید سے آزاد ہو جائیں گی اور دوسری سزا بھی انہیں نہ دی جائے گی۔ ان کی قید خانہ سے آزادی پہلا حکم منسوخ ہو جانے کی وجہ سے ہوگی۔ باقی رہائی سزا کا نہ ملنا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا کا قانون ان کاموں کے لیے ہوتا ہے جو اس کے آنے کے بعد انجام پائیں اس طرح آئندہ کے لیے جو بھی قانون ہو وہ ان قیدیوں کی رہائی کا راستہ ہے۔ البتہ نیا قانون ان تمام افراد کے لیے ہے جو آئندہ جرم کریں گے (غور فرمایئے گا)۔

باقی رہا وہ احتمال جو بعض نے پیش کیا ہے کہ "او یجعل اللّٰہ لھن سبیلا" سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے سنگساری کے متعلق اپنے آئندہ حکم کے ذریعے ایسے افراد کے لیے آزادی کی راہ کھول دی ہے، تو یہ نظریہ درست نہیں ہے کیونکہ یہ کبھی بھی "لھن سبیلا" (ان کے لیے نفع کی راہ) کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ کسی کو قتل کر دینا نجات کا راستہ نہیں ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ قانون جو اسلام نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے بعد میں مقرر کیا ہے، "رجم" (سنگسار کرنا) ہے جو احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بطور مسلم موجود ہے اگرچہ قرآن میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

جو کچھ ہم رقم کر چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت ہرگز منسوخ نہیں ہوئی کیونکہ نسخ ان احکامات کے بارے میں صادق آتا ہے جو شروع میں بصورت مطلق ہوں نہ کہ وقتی اور محدود طور پر، جبکہ آیتِ مندرجہ بالا نے عمر قید کا حکم ایک محدود اور وقتی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور اگر کچھ روایتوں میں ہے کہ آیاتِ مندرجہ بالا ان احکام کے ذریعے جو عفت و عصمت کے منافی اعمال کی سزا کے بارے میں آئے ہیں، منسوخ ہو گئی ہے تو اس سے مراد اصطلاحی نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کا لفظ روایات کی زبان میں حکم کے ہر طرح سے خاتمے کے لیے بولا جاتا ہے (غور کیجیے گا)۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ اس قسم کی عورتوں کو گھر میں قید رکھنے کا حکم ایک طرف سے تو ان کے فائدے میں ہے کیونکہ یہ ان کو عام قید خانوں میں قید کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ دوسری طرف تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عام قید خانے معاشرے کو بگاڑنے اور تباہ و برباد کرنے میں گہرا اثر رکھتے ہیں کیونکہ یہ عام طور پر برائیوں کی بہت بڑی درس گاہ ہوتے ہیں۔ مجرم لوگ وہاں اپنے تجربے ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہیں کیونکہ وہ اکٹھے رہتے ہیں اور ان کے پاس وسیع فارغ وقت بھی ہوتا ہے۔

و اللذان یأتیانھا منکم

اس کے بعد خداوند عالم اس آیت میں غیر محصنہ (غیر شادی شدہ) سے سرزد ہونے والے زنا اور عفت کے منافی عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اگر کنوارے مرد، عورت یہ بُرا کام کریں تو انہیں سزا دو۔ اگرچہ اس آیت میں زنائے غیر محصنہ کی صراحت نہیں ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے بعد آئی ہے اور زنا کی جس سزا کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے وہ اس سزا سے جدا اور الگ ہے جو گذشتہ آیت میں تھی اور اس سے ہلکی ہے۔ بنابریں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکم زنا کرنے والوں میں سے ایسے گروہ کے بارے میں ہے جو پہلی آیت میں داخل نہ تھا اور چونکہ گذشتہ آیت اس قرینہ سے جس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں محصنہ کے زنا کے ساتھ مخصوص ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ آیت غیر محصنہ کے زنا کے بارے میں حکم بیان کر رہی ہے۔



یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ اس آیت میں ذکر کی ہوئی سزا ایک کلی سزا ہے اور سورۂ نور کی آیت ۲ میں جو حد زنا طرفین میں سے ہر ایک کے لیے سو کوڑے بیان کی گئی ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ اس آیت کی تفسیر و توضیح ہو اسی دلیل کی بنا پر یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔

تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

البکر اذا اتت الفاحشة التی اتتها هذه الثیب فاذوهما

یعنی اس آیت سے مراد غیر شادی شدہ مرد عورت ہیں اگر وہ بُرا کام کریں تو انہیں سزا دی جائے۔

لفظ "اللذان" اگرچہ تثنیہ مذکر کا صیغہ ہے، تاہم اس سے مراد مرد اور عورت دونوں ہی ہیں اور یہ اصطلاح کے مطابق باب تغلیب سے ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال تحریر کیا ہے کہ یہ آیت لواطت جیسے بدترین کام کے بارے میں ہے اور گذشتہ آیت کا رابطہ مساحقہ (عورت سے عورت کا مباشرت کرنا) کے ساتھ ہے۔ لیکن "یاتیانها" کی ضمیر "فاحشہ" کی طرف پھیرنے سے جو گذشتہ آیت میں ہے، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منافی عفت عمل جس کا اس آیت میں ذکر ہے، اسی نوعیت کا ہے جس نوعیت کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ بنا بریں ایک کو لواطت کے بارے میں اور دوسرے کو مساحقت کے بارے میں سمجھنا ظاہر کے خلاف ہے۔ اگرچہ یہ دونوں انواع ہم جنس سے ملاپ کرنے میں شریک ہیں۔

اس بنا پر دونوں آیات کا زنا سے تعلق ہے۔ ان سب کو چھوڑتے ہوئے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں لواطت کی سزا قتل ہے نہ کہ آزار اور تکلیف پہنچانا اور کوڑے مارنا۔ غرض اس امر کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ زیر بحث آیت منسوخ ہو گئی ہے۔

فان تابا و اصلحا فاعرضوا عنهما ان الله کان توابا رحیما

خداوند عالم آیت کے آخر میں اس قسم کے گناہوں کے لیے توبہ اور بخشش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اگر وہ واقعاً توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر کے گذشتہ گناہوں کی تلافی کر لیں تو ان کی سزا سے صرف نظر اور چشم پوشی کرو کیونکہ خداوند عالم توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ یہ حکم حقیقت میں اس قسم کے خطاکاروں کے لیے واپس آنے کی راہ کھولتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کی صورت میں اسلامی معاشرہ فراخ دلی کے ساتھ دامن پھیلائے ہوئے انہیں قبول کر لیتا ہے اور اب وہ معاشرے کے دھتکارے ہوئے افراد بن کر نہیں رہتے۔

البتہ جیسا کہ فقہی کتب میں ہے توبہ اس صورت میں درست ہے کہ وہ اسلامی عدالت میں ثبوت جرم، شہادت گواہان اور عدالت اسلامی کا حکم صادر ہونے سے پہلے کی جائے لیکن وہ توبہ جو حکم صادر ہونے کے بعد ہو، کوئی وزن نہیں رکھتی یہاں اس حکم سے ضمناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ توبہ کر چکے ہیں انہیں گذشتہ گناہوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر بُرا بھلا نہ کہا جائے۔

تو جہاں سزا کا حکم اور حد شرعی ساقط ہو جائے وہاں پر بدرجہ اولیٰ لوگ اس کے کیے ہوئے گناہ سے چشم پوشی کریں۔ اس طرح وہ لوگ جن کے بارے میں یہ حد جاری ہو گئی ہو اور اس کے بعد وہ توبہ کر لیں وہ بھی مسلمانوں کی طرف سے چشم پوشی کے مستحق ہیں۔

اسلام کے تعزیری قوانین کا سہل اور ممتنع طریقہ

کبھی کبھی بعض لوگ کئی ایک مناسبتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلام نے تعزیری قوانین کی اتنی سخت اور



ناقابلِ برداشت سزائیں کیوں مقرر کی ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ شادی شدہ عورت سے زنا کرنے کی سزا پہلے عمر قید مقرر ہوتی اور اس کے بعد قتل۔ کیا بہتر نہیں ہے کہ اس قسم کے گناہوں کی سزا زیادہ نرم اور ہلکی دی جائے تاکہ جرم اور سزا میں اعتدال قائم رہے۔

لیکن ذرا سوچیے اگرچہ اسلام کے تعزیری قوانین اور سزائیں بظاہر سخت اور شدید دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں جرم کے ثابت ہونے کا طریقہ اتنا آسان نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایسی شرطیں لگائی گئی ہیں کہ غالباً جب تک گناہ ڈنکے کی چوٹ اور برسرِ عام نہ کیا جائے وہ شرائط پوری نہ ہوں گی۔ مثلاً گواہوں کی تعداد چار ہے۔ جس کی طرف ہم گذشتہ آیت میں اشارہ کر چکے ہیں کہ صرف نڈر اور لاپرواہ افراد ہی مجرم ثابت ہو سکتے ہیں۔ واضح ہے کہ اس قسم کے اوباش لوگوں کو سخت سزا ہی دینا چاہیے۔ تاکہ وہ معاشرے کے لیے عبرت بن سکیں اور وہ گناہ کی آلودگی سے پاک ہو جائے۔ اسی طرح گواہوں کی شہادت کے لیے کچھ شرطیں ہیں مثلاً آنکھوں سے دیکھنا اور قرائن پر قناعت نہ کرنا اور شہادت میں یکسانیت وغیرہ جو کہ جرم کو ثابت اور گھناؤنا کر دیتی ہے۔

اس طرح اس قسم کی سخت ترین سزا کا امکان گناہگاروں کے سامنے رکھا ہے اور یہ احتمال چاہے کتنا ہی ضعیف کیوں نہ ہو بہرحال بہت سے لوگوں کی نفسیات پر اثر انداز ہو سکتا ہے لیکن اسلام نے اس کے اثبات کو مشکل کر دیا ہے تاکہ اگر ایسے مواقع آئیں تو عملی طور پر یہ سزا وسیع پیمانے پر نہ دی جائے۔ درحقیقت اسلام چاہتا ہے کہ اس قانونِ تعزیر کا اثر تہدید بھی قائم رہے اور زیادہ افراد قتل بھی نہ ہوں۔ غرض نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سزا کے تعین اور اثباتِ جرم کی راہ میں اسلام کا یہ طریقہ ایسی روش ہے جو معاشرے کو گناہ کی آلودگی سے بچانے کے لیے بہت موثر ہے جبکہ جن افراد کو یہ سزا دی جاتی ہے وہ زیادہ تعداد میں بھی نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے اس روش اور طریقے کا عنوان سہل اور ممتنع رکھا ہے۔

۱۷۔ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ○

۱۸۔ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ○

ترجمہ

۱۷۔ توبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے برا کام کرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی سے توبہ کر لیتے ہیں خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

۱۸۔ اور برے کام کرنے والے لوگوں میں سے جب کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ



اب میں توبہ کرتا ہوں ۔ یہ توبہ نہیں ہے اور نہ ان کے لیے جو حالتِ کفر میں دنیا سے اٹھ جاتے ہیں ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ۔

تفسیر

قبولیت توبہ کے لیے شرطیں

انما التوبة علی الله للذین یعملون السوء بجهالته

گذشتہ آیت میں عفت اور پاک دامنی کے خلاف عمل کرنے والوں کو توبہ کے سبب سزا نہ ملنے کا مسئلہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے ۔ اور اسی سلسلے میں اس جملے کے ذریعے پروردگار کی طرف سے ان کی توبہ قبول ہونے کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے :

ان الله کان توابا رحیما

خدا اپنے بندوں کی توبہ بہت قبول کرتا ہے اور ان پر رحم کرنے والا ہے ۔

خداوند عالم اس آیت میں وضاحت کے ساتھ مسئلہ توبہ اور اس کی کچھ شرطیں بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ : توبہ تو صرف ان کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں ۔

آیئے اب دیکھیں کہ جہالت کیا چیز ہے کیا یہ جہل و نادانی اور گناہ سے بے خبری ہے یا اس کے منحوس اثرات اور دردناک نتائج سے ناواقفیت کا نام ہے ۔ لفظ جہل اور اس کے مشتقات اگرچہ مختلف معانی کے لیے آئے ہیں لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں خواہشاتِ نفسانی کا تلاطم ، سرکش ہوا و ہوس کا غلبہ اور عقل و ایمان کی قوتوں پر ان کا تسلط مراد ہے اگرچہ اس حالت میں گناہ کی وجہ سے علم رخصت نہیں ہو جاتا لیکن وہ اغراض نفسانی سے دب کر عملی طور پر بے اثر ہو جاتا ہے اور جب علم اپنا اثر کھو بیٹھے تو وہ از روئے عمل جہل و نادانی کے برابر ہے ۔ اگر گناہ اس قسم کی جہالت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ حکم پروردگار کے انکار اور دشمنی کی بنا پر ہو تو اس قسم کا گناہ کفر ہے ۔ اسی وجہ سے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ اس روش کو چھوڑ دے اور عناد و انکار سے باز آ جائے ۔

دراصل یہ آیت اسی حقیقت کو بیان کر رہی ہے جسے حضرت امام زین العابدینؑ نے دعائے ابو حمزہ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ، آپؑ بارگاہِ خداوندی میں عرض کرتے ہیں :

الٰهی لم اعصک حین عصیتک و انا بربوبیتک جاحد و لا بامرک مستخف و لا لعقوبتک متعرض و لا لوعیدک متهاون لکن خطیئة عرضت و سولت لی نفسی و غلبنی هوای ......

اے خدا جب میں نے تیری نافرمانی کی اس وقت گناہ کی طرف پیش قدمی تیری خدائی سے انکار کی وجہ سے نہ تھی اور نہ ہی تیرے حکم کو معمولی سمجھنے کے سبب سے تھی اور نہ ہی تیری سزا کو خفیف سمجھتے ہوئے نہ تیری سزا کے وعدے کو غیر اہم جانتے

ہوئے تھی بلکہ ایک غلطی اور خطا تھی، جو مجھ سے ہوگئی۔ نفسِ امارہ نے مجھ پر حق کو مشکوک کر دیا اور مجھ پر ہوا و ہوس نے غلبہ کرلیا۔

اس جملے میں توبہ کی ایک اور شرط کی طرف اشارہ ہے، فرماتا ہے:

ثم یتوبون من قریب

یعنی — وہ جلدی سے توبہ کرلیں۔

اس بارے میں کہ "قریب" سے کیا مراد ہے مفسرین میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض اس سے مراد آثارِ موت ظاہر ہونے سے پہلے لیتے ہیں اور بعد والی آیت جو یہ بتلاتی ہے کہ موت کی علامتیں ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی، اس پر بطور گواہ پیش کرتے ہیں۔ اس بنا پر لفظ قریب شاید اس وجہ سے ہے کہ اصولی طور پر دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہو مختصر ہے اور اس کا خاتمہ نزدیک ہے۔

لیکن بعض نے گناہ کے قریب کا وقت مراد لیا ہے۔ یعنی اپنے گناہ سے جلد از جلد پشیمان ہو اور خدا کی طرف لوٹ آئے کیونکہ مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے آثار و نشانات کو روح و جسم سے بالکل دھو ڈالے۔ یہاں تک کہ گناہ کا کوئی اثر دل میں باقی نہ رہے اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان جلد از جلد اس سے پہلے کہ گناہ اس کے جسم میں جڑ پکڑے اور اس کی طبیعت ثانیہ بنے، اس سے پچھتائے۔ ورنہ بصورت دیگر زیادہ تر گناہوں کے اثرات انسان کے قلب و جان کے گوشوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔ پس مکمل توبہ وہ ہے جو گناہ کے فوراً بعد کی جائے۔ قریب کا لفظ لغت اور عرفِ عام کی رو سے ان ہی معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔

یہ درست ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ پوری توبہ نہیں ہے اور شاید علی اللہ (یعنی — وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ پر لازم ہے) بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر قرآن کی صرف اسی آیت میں آئی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کی توبہ قبول کرنا بندوں کے حقوق میں سے ہے جبکہ عرصہ دراز کی توبہ قبول کرنا تفضلِ الٰہی ہے نہ کہ حق۔

فاولئک یتوب اللہ علیہم وکان اللہ علیما حکیما

خداوندِ عالم توبہ کی شرطوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ خدا ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہ دانا و حکیم ہے۔

ولیست التوبۃ للذین یعملون السیأت

اس آیت میں ان افراد کی طرف اشارہ ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ فرماتا ہے: وہ لوگ جو موت کی چوکھٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم گناہ سے توبہ کرتے ہیں، ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کہ جان کنی کے عالم میں جبکہ موت بالکل سامنے دکھائی دے رہی ہو، انسانی آنکھ سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور اس میں ایک خاص بینائی پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ حقائق جن کا تعلق دوسری دنیا کے ساتھ ہے اور اپنے اعمال جو اس زندگی میں کیے تھے، اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے کیونکہ اب مسائل حسی پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہر گنہگار اپنے برے کاموں پر پچھتاتا ہے اور اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو اپنے قریب آگ کا شعلہ دیکھ کر اس سے بھاگنا چاہتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ شرعی ذمہ داری اور آزمائشِ پروردگار کی بنیاد اس طرح



کے مشاہدات پر نہیں ہے بلکہ اس کا دارومدار غیب کے ایمان اور عقل و خرد کی آنکھ کے مشاہدہ پر ہے۔

اسی بنا پر کلام مجید میں ہے کہ جس وقت دنیا کے عذاب کی پہلی نشانی گذرے ہوئے زمانے کی بعض قوموں پر ظاہر ہو جاتی تھی تو ان پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ہم فرعون کی سرگذشت میں پڑھتے ہیں:

حتی اذا ادرکه الغرق قال امنت انه لا اله الا الذی امنت به بنوا اسرائیل و انا من المسلمین الان وقد عصیت قبل و کنت من المفسدین۔ (یونس ۹۰، ۹۱)

یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے پکار کر کہا: اب میں ایمان لاتا ہوں کہ بنی اسرائیل کے معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں سر تسلیم خم کرتا ہوں لیکن اس سے کہہ دیا گیا کہ تو اب یہ بات کہتا ہے جبکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا۔ اس وجہ سے تیری توبہ قبول نہیں ہوگی۔

بعض قرآنی آیتوں (مثلاً سورۂ سجدہ کی آیت ۱۲) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گنہگار قیامت میں عذاب الٰہی کو دیکھتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ لیکن ان کی پشیمانی انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ ایسے لوگ بالکل ان مجرموں کی طرح ہیں جن کی نگاہ جب سولی کی لکڑی پر پڑتی ہے اور اس کا پھندا اپنی گردن میں محسوس کرتے ہیں تو اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پچھتاوا نہ باعث فضیلت ہے نہ سبب عزت و افتخار اور نہ ہی ترقی درجات کا ذریعہ۔ اسی لیے یہ توبہ بے اثر ہے۔

یقیناً یہ آیت ان روایات کے خلاف نہیں جو کہتی ہیں کہ توبہ آخری سانس تک قبول ہو سکتی ہے کیونکہ روایات میں آخری سانس سے مراد وہ لمحے ہیں جن میں ابھی موت کی نشانیاں نزدیکی ہوں اور اصطلاح کے مطابق ابھی برزخی نگاہ پیدا نہ ہوئی ہو۔

دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جن کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ یہ وہ ہیں جو کفر کی حالت میں مر جائیں۔ خداوند عالم آیت بالا میں ان کے بارے میں فرماتا ہے:

ولا الذین یموتون وھم کفار یعنی "جو حالت کفر میں مر جاتے ہیں ان کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہے۔" یہ حقیقت قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی واضح کی گئی ہے [1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جو کفر کی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ کس وقت توبہ کریں گے کہ ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی توبہ عالم آخرت میں قبول نہیں ہوگی اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ توبہ سے مراد بندوں کی توبہ نہیں بلکہ خدا کی طرف سے توبہ ہے۔ یعنی خدا ان کے لیے عفو و رحمت کی طرف نہیں آئے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ آیت کی نظر ایک اور مقصد پر ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ وہ افراد جنہوں نے صحت و سلامتی اور ایمان کی حالت میں اپنے گناہوں سے توبہ کی ہے لیکن موت کے وقت دنیا سے بحالت ایمان نہیں گئے۔ ان کی گذشتہ توبہ بے معنی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے نیک اعمال کی ایک شرط قبولیت "موافات برایمان" یعنی ایمان کے ساتھ دنیا سے جانا ہے اس لیے جو لوگ زندگی

---

[1] آل عمران ۹۱، بقرہ ۱۶۱، بقرہ ۲۱۷ اور محمد ۳۴۔



کے آخری لمحات میں کافر ہوں ان کے پہلے اعمال (یہاں تک کہ وہ نیک عمل جو ایمان کی حالت میں کیے تھے) قرآنی آیتوں[1] کی توضیح کے مطابق رائیگاں ہو جائیں گے۔ اگرچہ انہوں نے ایمان کی حالت میں گناہوں سے توبہ کرلی ہو لیکن اس صورت میں وہ بھی بیکار ہو جائے گی۔ گویا توبہ کے قبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔

۱۔ موت کی نشانیاں ظاہر ہونے سے پہلے ہو۔

۲۔ انسان ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھے۔

اس آیت سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ توبہ میں دیر نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اچانک موت آجائے اور اس کے لیے توبہ کے دروازے بند ہو جائیں۔ یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ زیر بحث آیت میں توبہ کی تاخیر جس کو "تسویف" کہتے ہیں اور حالت کفر کی موت" کو ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اور یہ اس اہمیت کی علامت ہے جو اس موضوع کو قرآن دے رہا ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اولئک اعتدنا لھم عذابا الیما یعنی۔ ہم نے ان دونوں گروہوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ توبہ کے لیے مذکورہ بالا شرطوں کے علاوہ اور بھی شرطیں ہیں جن کی طرف متعلقہ آیتوں میں اشارہ ہوگا۔

۱۹۔ يَايُّهَا الَّذِينَ امَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝

ترجمہ

۱۹ اے ایمان والو! تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ عورتوں سے سختی سے (اور انہیں تکلیف پہنچا کر) میراث لو اور جو کچھ (بطور حق مہر) انہیں دیا ہے اُسے اپنی مِلک بنانے کے لیے اُن پر سختی نہ کرو۔ مگر یہ کہ وہ کھلے بندوں برائی کریں۔ اور ان سے اچھا سلوک کرو اگرچہ تم ان سے (کئی وجوہات کی وجہ سے) نفرت وحقارت کرتے ہو (تو فوراً علیحدگی کا پختہ ارادہ نہ کرو) کیونکہ اکثر اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اس میں بہت زیادہ نیکی قرار دیتا ہے۔

---

[1] بقرہ ۲۱۷۔



شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی بیویوں کو اپنے پاس تو رکھتے تھے مگر ان سے بیویوں کا سا سلوک نہیں کرتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ کب یہ مریں اور وہ ان کے مال پر قبضہ کریں۔

جیسا کہ ابن عباس کہتے ہیں:

یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں نازل ہوئی جن کی بیویوں کا حق مہر بہت زیادہ تھا اس کے باوجود وہ ان سے ازدواجی تعلقات رکھنا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کا حق مہر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو طلاق بھی نہ دے سکتے تھے۔ اس لیے وہ ان پر سختی کرتے تھے تاکہ وہ حق مہر بخش کر طلاق لے لیں۔

مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کی ایک اور شان نزول بھی نقل کی ہے جو اس آیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ آیت ۲۲ کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ جسے انشاءاللہ ہم اسی آیت کی ذیل میں بیان کریں گے۔

تفسیر

حقوق نسواں کا دوبارہ دفاع

یا ایھا الذین اٰمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا

ہم اس سورت کے شروع میں لکھ چکے ہیں کہ اس سورت کی آیتیں زمانہ جاہلیت کے بہت سے بُرے کاموں کے خلاف برسرِ پیکار رہیں چنانچہ زیرِ بحث آیت میں اس زمانہ کی چند بُری عادتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ان سے دور رہیں:

۱۔ عورتوں کو ان کے مال کی لالچ میں قیدی نہ بناؤ۔ جیسا کہ شانِ نزول میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مردوں کی ایک ظالمانہ روش یہ تھی کہ وہ ان دولت مند عورتوں سے جو بدصورت ہوتی تھیں شادی کر لیتے۔ پھر انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیتے تھے نہ انہیں طلاق دیتے اور نہ ہی ان سے بیوی کا سا برتاؤ کرتے، اس اُمید پر کہ انہیں موت آجائے تو ان کے مال پر قبضہ کر لیں۔ آیۂ مذکورہ بالا ۲۱۵ اعلان کرتی ہے کہ اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کی میراث اُنہیں تکلیف پہنچا کر زبردستی لے لو۔ اس طرح سے قرآن نے مذکورہ کام کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔

۲۔ عورتوں سے مہر کا حق بخشوانے کے لیے سختیاں نہ کرو۔ ان کی ایک بُری عادت یہ تھی کہ وہ عورتوں کو طرح طرح سے ستاتے تھے تاکہ وہ حق مہر بخش دیں اور طلاق لے لیں۔ خاص طور پر یہ معاملہ ایسے موقع پر ہوتا تھا جبکہ کسی عورت کا



حق مہر زیادہ ہو۔ اس آیت نے اس کام سے منع فرمایا ہے و لا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اتیتموھن ۔یعنی ان پر اس لیے سختی نہ کرو کہ اس طریقے سے جو حصہ تم نے انہیں دیا ہے اسے اپنی ملک بنا سکو لیکن اس کا ایک استثنائی حکم بھی ہے جس کی طرف الا ان یأتین بفاحشہ مبینۃ کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ بُرے اور شرمناک کام کریں تو پھر شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ ان پر سختی کریں تاکہ وہ اپنا حق مہر تمہارے لیے حلال کر کے طلاق لے لیں۔ درحقیقت یہ ایک قسم کی سزا ہے جو بدکردار عورتوں سے ان کے کرتوت کے بدلے تاوان لینے کی طرح ہے۔ کیا آیت مذکورہ میں "فاحشۃ مبینۃ" (واضح برائی) سے مراد وہ بُرے کام ہیں جو عفت و پاکدامنی کے منافی ہیں یا اور کسی قسم کے سخت ناگوار اعمال ہیں۔ مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں ایک طولانی بحث ہے لیکن اس حدیث میں جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے اس کی تشریح ہو چکی ہے کہ یہ عورت کی ہر طرح کی سخت مخالفت، نافرمانی اور بُرے سلوک پر مشتمل ہے۔[1] البتہ یہاں پر ہر چھوٹی بڑی مخالفت مراد نہیں ہے کیونکہ لفظِ فاحشہ میں اہمیت اور اس کا خلافِ معمول ہونا مخفی ہے۔ لفظ "مبینۃ" بھی اس کی تاکید کرتا ہے۔

۳۔ ان کے ساتھ شائستہ اور مناسب طریقہ کے ساتھ زندگی بسر کرو "وعاشروھن بالمعروف" فرما کر عورتوں کے بارے میں شائستہ معاشرت اور مناسب انسانی سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے بعد مزید کہا گیا ہے:

فان کرھتموھن فعسی ان تکرھوا شیئًا و یجعل اللہ فیہ خیرًا کثیرًا

یعنی۔ یہاں تک کہ اگر تم بعض وجوہات کی بنا پر اپنی بیویوں سے مکمل طور پر خوش نہیں ہو اور انہیں پسند نہیں کرتے ہو اور وہ تمہاری نظر میں کئی باتوں میں اچھی نہیں ہیں تو فوراً ان سے علیحدگی کا پختہ ارادہ یا ان سے بُرا سلوک نہ کرو۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے ان سے اچھا سلوک کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری رائے کا دارومدار شک و شبہ پر ہو اور جسے تم پسند نہیں کرتے خدا نے اسی میں بہت زیادہ خیر و برکت اور نفع رکھا ہو۔ اس بنا پر جب تک پانی سر سے اونچا نہ ہو جائے یہی مناسب ہے کہ حسنِ معاشرت اور خوش گفتاری کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے بلا وجہ اور بلا دلیل خواہ مخواہ کے بغض و حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان حالات میں ان کے فیصلے ٹھیک نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ اچھائیاں ان کی نظر میں برائیاں اور برائیاں ان کی نگاہ میں اچھائیاں بن جاتی ہیں لیکن وقت گزرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے سے آہستہ آہستہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس لیے ضمناً اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس آیت میں خیرا کثیرا کی تعبیر سے ان میاں بیوی کو جو ایک دوسرے کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں ایک خوشخبری دی گئی ہے جو وسیع مفہوم رکھتی ہے جس کے کئی ایک مصداق ہیں جن میں سے ایک واضح مصداق نیک، صالح، لائق اور عزت دار اولاد بھی ہے۔

۲۰۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ○

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۲۵۷۔



۲۱۔ وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ۝

ترجمہ

۲۰ اگر تمہارا یہ ارادہ ہو کہ اپنی بیوی کی جگہ دوسری بیوی کا انتخاب کرو اور تم اُسے (حق مہر کے طور پر) بہت زیادہ مال دے چکے ہو تو اس میں سے کوئی چیز بھی واپس نہ لو۔ کیا تم عورتوں سے مہر واپس لینے کے لیے تہمت اور کھلے گناہ کا سہارا لیتے ہو۔

۲۱ اور تم کس طرح اُسے واپس لے سکتے ہو جبکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور پورا پورا میل ملاپ رکھتے ہو۔ (چھوڑنے کے باوجود) وہ تم سے (شادی کے وقت) مضبوط وعدہ لے چکی ہیں۔

شانِ نزول

اسلام سے پہلے یہ رسم تھی کہ اگر مرد چاہتے کہ پہلی بیوی کو طلاق دیں اور نئی شادی کریں تو حق مہر سے بچنے کے لیے اپنی بیوی پر عفت کے منافی تہمت لگاتے اور اس پر سختی کرتے تھے تاکہ وہ اس بات پر تیار ہو جائے کہ اپنا حق مہر جو عام طور پر پہلے ہی وصول ہو جاتا تھا واپس کر دے اور طلاق لے لے۔ پھر وہی دوسری بیوی کا حق مہر مقرر کر دیتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت اس بُرے فعل سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے اسے قابلِ مذمت قرار دیتی ہے۔[1]

تفسیر

یہ آیت بھی عورتوں کے بعض حقوق کی حمایت میں نازل ہوئی ہے اور عام مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ جب وہ پہلی بیوی سے علیحدگی اور نئی بیوی لانے کا ارادہ کریں تو انہیں یہ حق نہیں ہے کہ پہلی بیوی کے حق مہر میں کمی کریں یا اگر اُسے ادا کر چکے ہیں تو اس سے واپس لے لیں۔ قنطار کا معنی ہے بہت زیادہ مال و دولت، چنانچہ راغب مفردات میں لکھتا ہے کہ قنطار کی اصل قنطرہ ہے جس کا معنی "پل" ہے اور چونکہ زیادہ مال بھی پل کی مانند ہے جس سے انسان زندگی بھر فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی بنا پر اُسے قنطار کہا گیا ہے۔[2] یہاں گفتگو کی بنیاد یہ ہے کہ طلاق شوہر کے فائدے کے لیے دی جا رہی ہے نہ کہ عورت کے منافیٔ عفت کا عمل

---

[1] تفسیر صافی آیۂ زیرِ بحث۔

[2] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۲ میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴ کی تفسیر ملاحظہ فرمایئے (اردو ترجمہ صفحہ ۲۹۶)۔



کی وجہ سے، اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کا تسلیم شدہ حق پامال کیا جائے۔

اتأخذونه بهتانا و اثما مبینا

اس کے بعد زمانۂ جاہلیت کے اس طرز عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ وہ لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگاتے تھے مزید فرماتا ہے کیا تم عورتوں کا حق مہر واپس لینے سے تہمت اور واضح گناہ کا ارتکاب کرنا چاہتے ہو۔ یعنی ایک تو یہ ظلم ہے اور ایک بزدلانہ اور غلط کام ہے اور دوسرے کھلم کھلا گناہ ہے۔

وکیف تأخذونه و قد افضٰی بعضکم الی بعض

اس آیت میں مردوں کے جذبۂ محبت کو متحرک کرنے کے لیے نئے سرے سے استفہام انکاری سے کام لیتے ہوئے مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم اور تمہاری بیویاں مدتوں خلوت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اور ایک روح دو قالب کی طرح آپس میں بھرپور میل ملاپ رکھتے رہے۔ پھر کس طرح اس نزدیکی کے باوجود بیگانوں اور دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہو اور ان کے مانے ہوئے حقوق کو پامال کر رہے ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آجکل کی فارسی زبان میں اگر دو جگری دوست ایک دوسرے سے لڑیں جھگڑیں تو انہیں کہا جاتا ہے کہ تم نے مدتوں ایک دوسرے کے ساتھ نان و نمک کھایا ہے اب کیوں جھگڑتے ہو۔ دراصل ایسے موقع پر شریک حیات پر ظلم اپنے آپ پر ظلم کے مترادف ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے، اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ تمہاری بیویوں نے شادی کے وقت تم سے پختہ عہد و پیمان لیا ہوا ہے، تم اب کس طرح اس مقدس اور مضبوط عہد کو ٹھکرا سکتے ہو اور واضح عہد شکنی کی طرف قدم بڑھا سکتے ہو۔

و اخذن منکم میثاقا غلیظا۔

ضمناً غور کرنا چاہیے کہ یہ آیت اگرچہ پہلی بیوی کو طلاق دینے اور نئی سے شادی کرنے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے لیکن پھر بھی صرف اسی صورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی علیحدگی اور طلاق مرد کے ارادے سے ہو اور عورت جدائی نہ چاہے وہاں تمام مہر ادا کیا جائے اور اگر پہلے دیا جا چکا ہے تو اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لی جائے چاہے دوسری شادی کا ارادہ ہو نہ ہو۔ اس بنا پر: ان اردتم استبدال زوج اگر تم دوسری بیوی انتخاب کرنا چاہتے ہو ـــــ یہ جملہ حقیقت میں زمانہ جاہلیت کی کیفیت کے بارے میں ہے۔ تاہم اس سے اصل حکم متاثر نہیں ہوتا۔ یہاں اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "استبدال" کا معنی ہے "تبدیلی چاہنا"۔ اسی لیے اس میں طلب اور ارادہ پایا جاتا ہے۔ اب اگر ہم دیکھتے ہیں "اردتم" (تم چاہو) اس کے ساتھ متصل ہے، تو یہ اس بنا پر ہے کہ آیت چاہتی ہے کہ یہ نکتہ گوش گذار کرے کہ نئی بیوی سے شادی کرنے کے لیے ناجائز اور بزدلانہ جھگڑے اور مقدمے شروع نہ کرو۔

۲۲۔ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ

لہ افضاء اصل میں مادۂ فضا سے ہے۔ جس کا معنی ہے وسعت و کشادگی۔ جب ایک شخص دوسرے سے مکمل میل جول قائم کر لیتا ہے تو دراصل وہ اپنے محدود جسم کو ایک وسیع تر جسم اور وجود میں تبدیل کر لیتا ہے۔ اس لیے افضا کا معنی ہے ربط ضبط (میل جول) پیدا کرنا۔



كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۟

ترجمہ

۲۲ اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔ مگر وہ جو ہو چکا ہے (اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے) کیونکہ یہ کام بُرا، باعثِ نفرت اور غلط ہے۔

شانِ نزول

زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا اور اپنے پیچھے بیوی بچے چھوڑ جاتا تو اگر وہ بیوی اس کے بیٹوں کی سگی ماں نہ ہوتی تو وہ بیٹے اسے مال کی طرح اپنی میراث بنا لیتے اور اس طرح وہ یہ حق سمجھتے کہ اپنی سوتیلی ماں سے خود شادی کر لیں یا اس کی کسی اور سے شادی کر دیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد ایک مسلمان کے بارے میں ایک حادثہ پیش آیا، وہ یہ کہ ابوقیس نامی ایک انصاری فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے نے اپنی سوتیلی ماں سے شادی کرنا چاہی تو اس عورت نے کہا میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہوں اس لیے یہ کام مناسب نہیں سمجھتی اس کے باوجود حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی شرعی ذمہ داری معلوم کر لیتی ہوں اس کے بعد اس عورت نے یہ بات حضورؐ کی خدمت میں عرض کی۔ اس پر آیت مذکورہ بالا نازل ہوئی اور اس کام سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم شانِ نزول میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس آیت نے زمانۂ جاہلیت کے ایک نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ فعل پر خطِ بطلان کھینچ دیا اور فرمایا: ولا تنكحوا ما نكح اباؤكم من النساء یعنی ان عورتوں کے ساتھ کہ جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں نکاح نہ کرو۔ لیکن کیونکہ عام طور پر کوئی قانون گذشتہ امور پر حاوی نہیں ہوتا۔ اس لیے مزید فرمایا: الا ما قد سلف یعنی مگر وہ شادیاں جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد تین سخت برائیاں اس قسم کی شادی کے بارے میں بیان فرمائیں۔ پہلی یہ کہ ارشاد ہوتا ہے: یہ بہت بُرا کام ہے (انه كان فاحشة)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: یہ عمل ایسا ہے جو لوگوں کی نظروں میں نفرت کا سبب ہے۔ یعنی انسان کی فطرت اسے پسند نہیں کرتی (ومقتا) اور آخر میں فرماتا ہے: یہ غلط طریقہ ہے (وساء سبيلا) یہاں تک کہ تاریخ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی اس قسم کی شادی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جو بچے اس سے پیدا ہوتے تھے انہیں "مقیت" (قابلِ نفرت اولاد) کے نام سے پکارتے تھے۔

واضح ہے کہ یہ حکم کئی ایک مصلحتوں کے پیشِ نظر اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے مقرر ہوا کیونکہ سوتیلی ماں سے نکاح ایک طرف تو سگی ماں سے نکاح کی طرح ہے کیونکہ سوتیلی ماں کے احکام بھی سگی ماں کے سے ہیں۔ دوسری طرف باپ کے حریم میں تصرف اس



کے احترام کی ہتک ہے۔ ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ عمل اس شخص کی اولاد میں نفاق کا بیج بوتا ہے کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ سوتیلی ماں سے نکاح کرنے کے معاملے میں اولاد کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے، بلکہ باپ اور بیٹے کے درمیان بھی رقابت پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ عام طور پر پہلے اور دوسرے شوہر میں رقابت اور دشمنی ہوتی ہے۔

اگر یہ کام (سوتیلی ماں سے شادی) باپ کی زندگی میں (باپ کے طلاق دینے کے بعد) انجام پائے پھر تو حسد اور دشمنی کی واضح دلیل ہے۔ اگر اس کے مرنے کے بعد ہو پھر بھی ہوسکتا ہے کہ بیٹے کو مرے ہوئے باپ سے دل میں ایک قسم کا حسد پیدا ہو۔ تین قسم کی تعبیریں جو اس کام کی برائی اور مذمت میں زیر نظر آیت میں آئی ہیں بعید نہیں کہ ان کا اشارہ انہی تین فلسفوں کی طرف ہو۔

۲۳۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

ترجمہ

۲۳۔ تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں تمہاری بھانجیاں اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے، تمہاری رضاعی بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جنہوں نے تمہاری گود میں پرورش پائی ہو اور جو ان بیویوں سے ہیں جن کے ساتھ تمہاری جنسی آمیزش رہی ہے اور اگر ان سے جنسی آمیزش نہیں رہی تو ان کی بیٹیاں تمہارے لیے ممنوع نہیں ہیں (اسی طرح تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری نسل سے ہیں (نہ کہ منہ بولے بیٹے) نیز (تم پر حرام ہے) یہ کہ دو بہنوں کو جمع کرو مگر وہ جو گذشتہ زمانے میں ہوچکا ہے خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر



محارم سے نکاح کی حرمت

اس آیت میں محارم (وہ عورتیں جن سے رشتۂ زوجیت منع ہے) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ اس آیت کی بنیاد پر تین طریقوں سے محرمیت پیدا ہو۔

۱۔ ولادت، جسے نسبی تعلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲۔ طریق ازدواج سے، جسے سببی ارتباط کہتے ہیں۔

۳۔ رضاعت (دودھ پلانے) سے، جسے ارتباط رضاعی بولتے ہیں۔

سب سے پہلے نسبی محارم کی طرف جو سات طرح کے ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

حرمت علیکم امہاتکم وبناتکم واخواتکم وعماتکم وخالاتکم وبنات الاخ وبنات الاخت

تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔

یاد رکھیے کہ ماں سے مراد وہ عورت نہیں ہے جس سے انسان بلاواسطہ پیدا ہوا ہو بلکہ دادی پڑدادی اور باپ کی ماں اور اسی قسم کی دوسری عورتیں مراد ہیں۔ جس طرح بیٹی سے مراد صرف بلاواسطہ بیٹی نہیں ہے بلکہ بیٹی، پوتی، نواسی اور ان کی اولاد بھی ہے اسی طرح دوسرے پانچ مواقع پر بھی ایسا ہی ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ تمام لوگ فطری طور پر اس قسم کی شادیوں سے نفرت کرتے ہیں، اسی وجہ سے سب قومیں (چند افراد کو چھوڑ کر) محارم سے نکاح حرام سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجوسی جو اپنے منابع اور کتب کی بنا پر اس قسم کی شادیوں کو جائز سمجھتے تھے آج اس کا انکار کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اس امر کو ایک پرانی عادت اور رسم قرار دیں۔ لیکن یہ مسلّم امر ہے کہ ایک قانون کی عمومیت تمام لوگوں، زمانوں، سالوں اور شہروں میں عملی طور پر اس کے فطری ہونے کی ترجمانی کرتی ہے۔ کیونکہ ایک عام رسم و عادت میں دوامی اور عالمگیر بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس سے قطع نظر بھی آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہم خون افراد کی ایک دوسرے سے شادیاں بے شمار خطرات کی حامل ہوتی ہیں یعنی چھپی ہوئی وراثتی بیماریاں شدت اختیار کر لیتی ہے اور آشکار ہو جاتی ہیں (اس سے یہ مراد نہیں کہ اس طرح بیماری پیدا ہوتی ہے)۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو محارم سے گزر کر قوم و قبیلہ میں بھی جو نسبتاً نزدیکی ہیں مثلاً چچا زاد کا ایک دوسرے سے شادی کرنا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ بھی وراثتی بیماریوں کے خطرات میں شدت پیدا کرتا ہے لیکن یہ مسئلہ اگر دور کے رشتہ داروں میں کوئی مشکل پیدا نہ بھی کرے (جیسا کہ عام طور پر نہیں کرتا) تب بھی نزدیک کے رشتہ داروں میں جو کہ زیادہ ہم خون ہیں یقیناً خرابی اور بیماری میں شدت پیدا کر دیتا ہے۔

ؔ البتہ اسلام میں چچا زاد کا ایک دوسرے سے شادی کرنا اور اس قسم کے دوسرے رشتہ دار حرام نہیں ہوئے کیونکہ یہ محارم کی طرح نہیں ہیں اور اس قسم کے رشتوں میں کسی حادثہ کا احتمال بہت کم ہے۔ ہم خود بہت سے مواقع کے عینی شاہد ہیں کہ اس قسم کی شادیاں ہوئیں اور ان کے نتیجہ میں جو بچے پیدا ہوئے وہ صحت مند اور ذہنی طور پر لائق ہیں۔



علاوہ ازیں عام طور پر محارم میں جنسی جذب وکشش کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ ہی پلتے بڑھتے، پھلتے پھولتے اور) پروان چڑھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے ایک عام اور دائمی وجود ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ استثنائی اور غیر معمولی قوانین کی عمومی اور کلی حالت کے لیے میزان نہیں بن سکتے۔

نیز ہمیں معلوم ہے کہ جنسی کشش ہی ازدواجی زندگی کے رشتے کے استحکام کے لیے شرط اول ہے۔ اس بنا پر اگر محارم کے درمیان ازدواج ہو تو وہ ناپائیدار اور گرم جوشی سے عاری ثابت ہوگا۔

اس کے بعد رضائی محارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وامھتکم اللاتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ۔

یعنی ــ اور تمہاری وہ مائیں جو تمہیں دودھ پلاتی ہیں اور تمہاری رضاعی بہنیں تم پر حرام ہیں۔

اگرچہ قرآن نے آیت کے اس حصے میں صرف دو گروہوں یعنی رضاعی بہنوں اور ماؤں کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن بے شمار موجود روایات کی بنا پر رضاعی محارم انہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ مشہور حدیث کے مطابق جو حضرت پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے: یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ــ یعنی تمام افراد جو نسبی رشتے کے لحاظ سے حرام ہیں وہ رضاعت (دودھ پلائی) کی رو سے بھی حرام ہیں البتہ دودھ پلانے کی مقدار جو محرمیت پر اثر ڈالتی ہے، یہ اور اس طرح کی دیگر شرائط کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

محارم رضاعی کی حرمت کا فلسفہ

اس کا فلسفہ یہ ہے کہ کسی خاص فرد کے دودھ سے کسی کے گوشت اور ہڈیوں کی پرورش اس کی اولاد سے اس کی شباہت پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً جو عورت کسی بچے کو ایک مقدار تک دودھ پلاتی ہے تو اس کا جسم اس کے دودھ سے ایک خاص نشوونما پاتا ہے۔ اس سے ایک خاص قسم کی شباہت اس بچے اور عورت کے اپنے بچوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں ان میں سے ہر ایک اس ماں کے بدن کا ایک جزو شمار ہوتا ہے اور وہ دو نسبی بھائیوں کے مانند ہوتے ہیں۔

آخر میں محارم کے تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں چند عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ وامھات نسائکم ــ اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔ یعنی صرف اتنی سی بات کہ ایک عورت کسی شخص کے نکاح میں آجائے اور صیغہ نکاح جاری ہو جائے تو اس عورت کی ماں اور اس کی ماں کی ماں اور اس طرح کے سب رشتے اس پر حرام ابدی ہو جائیں گے۔

۲۔ وربائبکم اللاتی فی حجورکم من نسائکم اللاتی دخلتم بھن ــ اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جو تمہاری گود میں ہیں بشرطیکہ اس بیوی کے ساتھ ہم بستری کر چکے ہو یعنی ایک عورت سے صرف عقد شرعی کرنے سے اس کی وہ لڑکیاں جو دوسرے شوہر سے ہیں اس شخص پر حرام نہیں ہوتیں بلکہ ان کی حرمت کے لیے یہ شرط ہے کہ عقد شرعی کے علاوہ اس عورت سے مباشرت بھی کرے۔ اس مقام پر یہ قید بتاتی اور تائید کرتی ہے کہ بیوی کی ماں کا حکم جو کہ ابھی ابھی لکھا گیا ہے وہ اس قسم کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے اور اصطلاح کے مطابق حکم کے اطلاق کو تقویت دیتا ہے اگرچہ فی حجورکم (جو تمہاری گود میں ہیں) کی قید کا ظہور یہ ہے کہ اگر بیوی کی دوسرے شوہر سے بیٹی انسان کی گود میں پرورش نہ پائے تو وہ اس پر حرام نہیں ہے لیکن روایات کے قرینہ اور حکم کے مسلّم ہونے کی بنا پر یہ قید اصطلاح کے مطابق احترازی نہیں ہے بلکہ واقعی تحریم کے نکتہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ایسی لڑکیاں جن



کی مائیں دوسری شادی کر لیتی ہیں عموماً کم عمر ہوتی ہیں اور اکثر نئے شوہر کی گود میں اس کی اپنی بیٹیوں کی طرح پرورش پاتی ہیں۔ آیت کہتی ہے کہ یہ واقعی تمہاری بیٹیوں کی مانند ہیں تو کیا کوئی شخص اپنی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔ ربائب بھی جو کہ ربیبہ کی جمع ہے اسی بنا پر ہے۔

آیت کے اس حصہ کے بعد مطلب کی تاکید کے طور پر مزید فرماتا ہے کہ اگر ان سے جنسی آمیزش نہیں رکھتے تو پھر ان کی بیٹیاں تم پر حرام نہیں ہیں (فان لم تکونوا دخلتم بھن فلا جناح علیکم)۔

۳۔ وحلائل[1] ابنائکم الذین من اصلابکم ۔ یعنی۔ اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب و نسل سے ہیں۔ حقیقت میں من اصلابکم یعنی۔ وہ بیٹے جو تمہاری نسل سے ہیں، اس وجہ سے ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی ایک غلط رسم پر خط بطلان کھینچا جائے کیونکہ اس زمانے میں معمول تھا کہ کچھ افراد کو اپنا بیٹا بنا لیتے تھے یعنی جو کسی اور کا بیٹا ہوتا اُسے اپنے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور منہ بولے بیٹے پر حقیقی بیٹے کے تمام احکام و قانون لاگو ہوتے تھے اور اسی وجہ سے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے شادی نہیں کرتے تھے۔ اسلام میں منہ بولا بیٹا اور اس کے سب احکام کلی طور پر کوئی بنیاد نہیں رکھتے۔

۴۔ وان تجمعوا بین الاختین ۔ اور تم پر دو بہنوں کا جمع کرنا منع ہے۔ یعنی تم ایک ہی وقت میں دو بہنوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر دو بہنوں یا زیادہ کے ساتھ مختلف زمانوں میں یا پہلی بہن سے علیحدگی کے بعد دوسری سے شادی کی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں دو بہنوں کو اکٹھا رکھنے کا رواج تھا اور کئی لوگ ایسی شادیاں کر چکے تھے۔ اس لیے قرآن مندرجہ بالا جملے کے بعد کہتا ہے: الا ما قد سلف یعنی اس حکم کا (دوسرے احکام کی طرح) گذشتہ شادیوں پر اثر نہیں پڑے گا۔ یعنی جو لوگ اس قانون سے پہلے اس قسم کی شادیاں کر چکے ہیں ان کے لیے کوئی عذاب اور سزا نہیں ہے۔ اگرچہ اس وقت ان میں سے صرف ایک کو چننا اور دوسری کو چھوڑنا پڑے گا۔

اسلام نے اس قسم کی شادی سے کیوں روکا ہے۔ شاید اس کی رمز یہ ہو کہ دو بہنیں طبعی اور فطری نسبی رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ ایک دوسرے کی رقیب بن جائیں گی تو وہ پہلی فطری محبت باقی نہ رہے گی بلکہ ایک قسم کا تضاد ان میں جنم لے گا جو ان کی زندگی کے لیے انتہائی مضر ہے کیونکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جذبۂ محبت اور جذبۂ رقابت ان کے دلوں میں باہم برسرِ پیکار رہیں گے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ جملہ الا ما قد سلف ان تمام محارم کے بارے میں ہے جن کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی اگر اس آیت کے نزول سے پہلے ذکر کیے ہوئے محارم میں سے اس زمانے کے مروج قوانین کے مطابق کوئی شخص شادی کر چکا ہے تو یہ تحریم کا حکم اس پر لاگو نہیں ہوگا اور ان کی اولاد جائز اولاد ہوگی لیکن اس آیت کے نزول کے بعد ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ آیت کا آخری جملہ یعنی ان اللہ کان غفوراً رحیما بھی اس مفہوم سے مطابقت اور مناسبت رکھتا ہے۔

---

[1] "حلائل" حلیلہ کی جمع ہے۔ جو مادہ "حل" سے اس عورت کے معنی میں ہے جو انسان پر حلال ہو یا مادۂ حلول سے ہے جس کے معنی اس عورت کے ہیں جو ایک جگہ کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے۔



۲۴۔ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

ترجمہ

۲۴ اور شوہردار عورتیں (تم پر حرام ہیں) مگر وہ کہ جن کے تم مالک بن گئے ہو۔ یہ ایسے احکام ہیں جو خدا نے تم پر مقرر کیے ہیں۔ ان (مذکورہ) عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تم پر حلال ہیں اور جنہیں اپنے مال کے ذریعے اپناؤ بشرطیکہ تم پاک دامن رہو اور زنا سے بچو اور جن عورتوں سے متعہ کرو تو ان کا حق مہر جو تم پر واجب ہے ادا کرو اور تم پر اس کی نسبت کوئی گناہ نہیں جس پر ایک دوسرے کے ساتھ مہر مقرر کر کے موافقت کر لو خدا دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

والمحصنات من النساء ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ آیت گذشتہ آیت کی بحث کا ضمیمہ ہے جو ان عورتوں کے متعلق ہے جن سے شادی کرنا حرام ہے، یہ آیت مزید خبردار کرتی ہے کہ سہاگنوں کے ساتھ شادی اور مباشرت حرام ہے۔

"محصنات" "محصنہ" کی جمع ہے اور "حصن" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "قلعہ"۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ شوہردار یا عفیف و پاکدامن عورتوں کے لیے جو غیر مردوں سے جنسی تعلق سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتی ہیں یا کسی مرد کی سرپرستی میں ہوں کے لیے بولا جاتا ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ آزاد عورتوں کو کنیزوں کے مقابلے میں (محصنات) کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی آزادی حقیقت میں ایک چار دیواری کے مانند ہے جو ان کے گرد موجود ہے اور کوئی دوسرا ان کی اجازت کے بغیر اس میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن واضح ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں شوہردار عورتیں ہی مراد ہیں۔ یہ حکم صرف مسلمان عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر مذہب و ملت کی عورتوں کے بارے میں ہے یعنی ان سے شادی نہیں کر سکتے۔

اس حکم میں جو استثناء ہے وہ صرف ان غیر مسلم عورتوں کے بارے میں ہے جو جنگ میں مسلمانوں کی قیدی ہو جائیں، اسلام کی نظر



شائستہ ستائش آں آفریدگاری است ❊ کارد چنیں دل آویز نقشی ز ماء وطینی !

وہ خالق ہی لائق تعریف ہے کہ جس نے پانی اور مٹی سے ایسا دل آویز نقش بنایا۔

یا یہاں سجدہ خضوع اور انکساری کے معنی میں ہے۔

❊ ❊ ❊

بہرحال ہم نے اس موقع پر آدم کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور " ہم نے کہا اے آدم ! اس طرزِ عمل سے یہ تصدیق ہوگئی کہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ اس کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمہیں جنّت سے باہر نہ نکال دے۔ جس سے تو رنج و تکلیف میں مبتلا ہو جائیگا: (فقلنا یا ادم ان هـذا عدولك ولزوجك فلا يخرجنكما من الجنة فتشقى)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں جنّت " دارِ آخرت کی بہشتِ جاوداں کے معنی میں نہیں ہے کہ جو ایک نقطۂ تکامل و ارتقاء ہے اور اس سے باہر نکلنا اور وہاں سے بازگشت ممکن نہیں ہے۔ یہ جنّت جس کا یہاں ذکر ہے ایک باغ تھا کہ جس میں اس دنیا کے باغوں کی سب چیزیں موجود تھیں اور پروردگار کے لطف و کرم سے اس میں کوئی تکلیف اور زحمت نہیں تھی۔ لہٰذا خدا آدم کو اس خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ اگر اس امن و امان کی جگہ سے تم باہر نکل گئے تو رنج و مشکل میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ " تشقٰی " شقاوت کے مادہ سے ہے اور شقاوت کے معانی میں سے ایک درد و رنج بھی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اپنا روئے سخن پہلے دونوں یعنی آدم و حوا کی طرف کیوں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ :

فلا يخرجنكما من الجنة

شیطان تم دونوں کو جنّت سے نہ نکال دے۔

لیکن باہر آنے کا نتیجہ مفرد کی صورت میں آدم کے بارے میں بیان کیا ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے :

فتشقى

اے آدم ! تو درد و رنج میں جا پڑے گا۔

تعبیر کا یہ اختلاف ممکن ہے کہ اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ پہلے درجے میں درد و رنج آدم ہی کے حصّہ میں آنے تھے۔ یہاں تک کہ یہ انہی کی ذمہ داری تھی کہ اپنی بیوی کی مشکلات بھی اپنے کندھے پر اُٹھائیں اور مردوں کی ذمہ داری شروع دن سے اسی طرح سے چلی آرہی ہے۔

یا یہ بات ہے، کہ چونکہ شروع میں آدم سے ہی عہد و پیمان لیا گیا تھا، لہٰذا آخر میں بھی اُنہی سے خطاب کیا گیا ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد خدا، بہشت کے راحت و آرام اور اس سے باہر کے ماحول کے درد و رنج کی آدم کے لیے اس طرح تشریح کرتا ہے :

تو یہاں پر نہ تو بھوکا رہے گا۔ اور نہ ہی برہنہ ہوگا: (ان لك الا تجوع فيها ولا تعرى)۔

" نہ تو اس میں پیاسا رہے گا اور نہ ہی سورج کی تپتی ہوئی دھوپ تجھے تکلیف پہنچائے گی " (وانك لا تظمؤا فيها ولا تضحى)۔

یہاں مفسرین کے لیے ایک سوال سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ پیاس کا حرارتِ آفتاب کے ساتھ اور بھوک کا برہنگی کے ساتھ کیوں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ عام طور پر پیاس کا ذکر بھوک کے ساتھ کرتے ہیں۔



کا مالک ہونے کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد۔[1] شاید ضمنی طور پر غیر مسافحین کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہو کہ مسئلہ ازدواج میں تمہارا نصب العین اور مقصد صرف جنسی پیاس کی تسکین نہ ہو بلکہ شادی بیاہ اس بلند ترین مقصد کو زندہ کرنے کے لیے ہو جس کے لیے جنسی پیاس انسان میں رکھی گئی ہے اور وہ ہے بقائے نسلِ انسانی اور برائیوں سے اس کی حفاظت۔

اسلام میں وقتی شادی

فما استمتعتم به منهن فاٰتوهن اجورهن فريضة

آیت کے اس حصے میں وقتی شادی کی طرف اشارہ ہے جسے اصطلاح میں "متعہ" کہتے ہیں۔ ارشادِ رب العزت ہے اتم جن عورتوں کے ساتھ متعہ کرتے ہو ان کا حق مہر ایک حق واجب کے طور پر ادا کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج موقت کی اصل تشریع اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں میں تسلیم شدہ تھی۔ اس لیے تو خداوند عالم اس آیت میں حق مہر ادا کرنے کی وصیت فرما رہا ہے اور کیونکہ یہ ایک اہم تفسیری، فقہی اور اجتماعی بحث ہے اس لیے ضروری ہے کہ کئی گوشوں اور پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

۱۔ جو قرائن آیت مندرجہ بالا میں موجود ہیں وہ اس آیت کے وقتی شادی پر دلالت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔

۲۔ اس قسم کی شادیاں حضرت رسولِ اکرمؐ کے عہد میں ہوتی تھیں اور رسول اللہؐ کے دور میں اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔

۳۔ اس قسم کی ازدواج معاشرتی اور اجتماعی ضرورت بھی ہے۔

۴۔ متعہ بہت سے مسائل کا حل بھی ہے۔

اب پہلی جہت کو لیتے ہیں اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ لفظ متعہ جس سے استمتعتم لیا گیا ہے۔ اسلام میں وقتی نکاح کے لیے ہے اور اصطلاح کے مطابق اس بارے میں حقیقتِ شرعیہ موجود ہے۔ اس امر کا گواہ یہ ہے کہ متعہ کا لفظ اسی معنی میں احادیث پیغمبرؐ اور کلمات صحابہ میں بارہا استعمال ہوا ہے۔[2]

دوسرے یہ کہ اگر اس لفظ کے مذکورہ معنی نہ لیے جائیں تو پھر اس کے لغوی معنی (نفع اٹھانا) مراد لیے جائیں گے تو اس صورت میں آیت کے معنی کا خلاصہ یہ ہوگا کہ اگر عقد دائمی والی عورتوں سے فائدہ اٹھاؤ تو ان کا حق مہر انہیں ادا کرو۔ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ حق مہر کی ادائیگی کی شرط عورتوں سے تمتع اور نفع حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تمام مہر بنا بر مشہور[3] یا کم از کم نصف حق مہر نکاح ہوتے ہی واجب ہو جاتا ہے۔

---

[1] غلاموں کی آزادی کے سلسلے میں اسلام نے جو زبردست لائحہ عمل اختیار کیا اس کے بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

[2] کنز العرفان، مجمع البیان، نور الثقلین، برہان اور الغدیر کی جلد ۶ ملاحظہ فرمائیے۔

[3] مشہور یا زیادہ مشہور یہ ہے کہ دائمی عقد کے بعد پورا مہر مرد پر واجب ہو جاتا ہے، اگرچہ دخول سے پہلے طلاق سے حق مہر آدھا واجب رہ جاتا ہے۔



نیز یہ کہ بزرگ اصحاب اور تابعین[1] مثلاً عبداللہ ابن عباس اسلام کے مشہور عالم و مفسر، ابی بن کعب، جابر بن عبداللہ، عمران بن حصین سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، سدی اور دیگر بہت سے مفسرین اہل سنت اور تمام مفسرین اہل بیتؑ مندرجہ بالا آیت سے نکاح موقت کے معنی سمجھے ہیں۔ یہاں تک امام فخرالدین رازی جن کی شہرت یہ ہے کہ وہ شیعوں کے مسائل میں اشکال تراشی کرتے ہیں، اس آیت کے بارے میں تفصیلی بحث کے بعد کہتے ہیں کہ حکم مذکور ایک مدت کے بعد منسوخ ہوگیا تھا۔ چوتھے یہ کہ ائمہ اہل بیتؑ نے جو اسرار وحی کو تمام لوگوں سے زیادہ جانتے تھے بالاتفاق آیت کے یہی معنی لیے ہیں ان سے اس سلسلے میں بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ ان میں سے ایک روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے، آپ نے فرمایا:

المتعة نزل به القرآن وجرت بها السنة من رسول الله

متعہ کا حکم قرآن میں نازل ہوا ہے۔ اور سنتِ رسول اس کے مطابق جاری ہوئی[2]

علاوہ ازیں حضرت امام باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے ابوبصیر سے متعہ کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:

نزلت فی القرآن فما استمتعتم به منهن فاٰتوهن اجورهن فريضة۔

قرآن مجید نے اس سلسلے میں گفتگو کی ہے چنانچہ فرماتا ہے، فما استمتعتم[3]

نیز امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے متعہ کے بارے میں عبداللہ بن عمیر لیثی کے جواب میں فرمایا:

احلها الله فی كتابه وعلى لسان نبيه فهو حلال الى يوم القيمة۔

خداوند عالم نے اسے قرآن میں اپنے پیغمبر کی زبان پر حلال کیا اور وہ قیامت تک حلال ہے[4]

کیا یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے

تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے بلکہ ضرورت دین اس پر دلالت کرتی ہے کہ نکاح موقت آغاز اسلام میں جائز تھا مندرجہ بالا آیت کی متعہ کے جواز پر دلالت اصل حکم کے مسلم ہونے پر کسی قسم کی نفی نہیں کرتی۔ کیونکہ مخالفین کا خیال ہے کہ اس حکم کا شرعی ہونا سنت سے ثابت ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان آغاز اسلام میں اس پر عمل کرتے تھے اور وہ مشہور جملہ جو حضرت عمر سے منقول ہے:

متعتان كانتا على عهد رسول الله وانا محرمهما و معاقب عليهما متعة النساء و متعة الحج[5]

دو متعہ پیغمبرؐ کے عہد مبارک میں تھے۔ جنہیں میں (عمر) حرام کرتا ہوں اور ان پر سزا بھی دوں گا عورتوں سے متعہ اور حج تمتع (جو ایک خاص قسم کا حج ہے)۔

---

[1] وہ لوگ جو پیغمبرؐ کے زمانے کے بعد آئے اور آنحضرتؐ کے زمانے کو نہ پاسکے۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۶۷، تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۳۶۰۔

[3] گذشتہ حوالہ۔

[4] تفسیر برہان، زیر بحث آیت کے ذیل میں (توجہ رہے کہ یہ حدیث اور گذشتہ دونوں احادیث کافی میں ہیں)۔

[5] کنزالعرفان جلد ۲ صفحہ ۱۵۸، تفسیر قرطبی و طبری، سنن کبریٰ بیہقی کتاب نکاح۔



حرام مال کھانا اور کبھی وہ نسبتی پہلو رکھتے ہیں یعنی یہ ایسا کام ہوتا ہے کہ اگر ایک انسان سے سرزد ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ کبھی اس کی نسبت سے وہ ایک مطلوب اور شائستہ عمل ہوتا ہے لیکن اگر وہی کام کسی دوسرے سے سرزد ہو جائے تو اس کے مرتبہ و مقام کا لحاظ کرتے ہوئے وہ غیر مناسب ہوتا ہے۔

مثلاً ایک ہسپتال بنانے کے لیے لوگوں سے امداد کی اپیل کی جاتی ہے۔ ایک کاریگر آدمی اپنی ایک دن کی مزدوری کہ جو کبھی چند روپے سے زیادہ نہیں ہوتی دے دیتا ہے۔ یہ عمل اس کی نسبت سے ایثار اور اچھا عمل ہے، کامل طور پر مطلوب و پسندیدہ ہے لیکن اگر ایک دولت مند آدمی بھی اتنی ہی مقدار میں مدد کرے تو نہ صرف یہ کہ یہ عمل اُس کی طرف سے ناپسندیدہ ہے بلکہ ملامت و مذمت کے لائق ہے حالانکہ اصولی طور پر نہ صرف یہ کہ اُس نے کوئی حرام کام نہیں کیا ہے بلکہ ظاہراً ایک کارِ خیر میں مدد بھی کی ہے۔

یہ وہی بات ہے کہ جسے ہم یوں کہتے ہیں:

حسنات الابرار سیئات المقربین

نیک لوگوں کی اچھائیاں مقربین کے لیے گناہ ہیں۔

نیز یہ وہی چیز ہے کہ جو ترک اولیٰ کے عنوان سے مشہور ہوئی ہے اور ہم اسے گناہ نسبتی سے یاد کرتے ہیں کہ جو نہ تو گناہ ہے اور نہ ہی مقام عصمت کے خلاف ہے۔

اسلامی احادیث میں بھی کبھی کبھی مستحبات کی مخالفت پر معصیت کا اطلاق ہوا ہے۔ ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے روزانہ کی نافلہ نمازوں کے بارے میں فرمایا:

> "یہ سب مستحب ہیں واجب نہیں ہیں ...... اور جو شخص ان کو ترک کرے اُس نے معصیت کی کیونکہ مستحب ہے کہ جب انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو اس کام کو جاری رکھنا چاہیئے۔

اس موضوع اور حضرت آدم سے مربوط دوسرے مسائل اور ان کے جنت سے باہر نکلنے کے بارے میں چھٹی جلد سورہ اعراف کی آیہ ۱۹ سے بعد اور جلد اوّل سورہ بقرہ کی آیہ ۳۰ تا ۳۸ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۳۔ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ○

۱۲۴۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ○

۱۲۵۔ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ○



۱۲۶۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ○

۱۲۷۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ○

ترجمہ

۱۲۳۔ (خدا نے) فرمایا: تم دونوں (اور اسی طرح شیطان) اس (باغ) سے نیچے اُترو۔ اس حالت میں کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو لیکن جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی رنج و تکلیف میں مبتلا ہوگا۔

۱۲۴۔ اور جو شخص میری یاد سے رُوگردانی کرے گا، وہ تنگ زندگی گزارے گا اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محشور کریں گے۔

۱۲۵۔ وہ کہے گا: پروردگارا: تُو نے مجھے نابینا کیوں محشور کیا؟ مَیں تو بینا تھا۔

۱۲۶۔ (خدا) فرمائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ میری آیات تیرے پاس پہنچیں اور تُو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔

۱۲۷۔ اور جو شخص اسراف کرے گا اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائے گا، ہم اُسے اسی قسم کی جزا دیں گے اور آخرت کا عذاب زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے۔

تفسیر

تنگ زندگی:

آدمؑ کی توبہ اگرچہ قبول ہو گئی تھی مگر اُنھوں نے ایسا کام کیا تھا کہ اب پہلی جیسی حالت کی طرف لوٹنا ممکن نہیں تھا، لہٰذا خدا نے "اُنہیں اور حوا کو حکم دیا کہ تم دونوں، اور اسی طرح شیطان بھی تمہارے ساتھ، جنّت سے زمین پر اُتر جاؤ" (قال اھبطا منھا جمیعا)۔

"درآنحالیکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے" (بعضکم لبعض عدو)۔

لیکن مَیں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ راہ سعادت اور نجات تمہارے سامنے کُھلی ہوئی ہے۔ "پس جس وقت میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو تم میں سے جو کوئی اِس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ ہی بدبخت" (فاما یاتینکم منی ھدی



فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی)۔

اور اس غرض سے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے فرمان کو بھلا دیتے ہیں، ان کی پریشانی کا نتیجہ بھی واضح ہو جائے، مزید فرمایا گیا ہے:

اور جو شخص میری یاد سے رُوگردانی کرے گا وہ تنگ اور سخت زندگی بسر کرے گا: (ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا)۔

" اور قیامت کے دن ہم اُسے نابینا محشور کریں گے" (ونحشرہ یوم القیامۃ اعمٰی)۔

وہاں وہ یہ "عرض کرے گا کہ پروردگارا! تو نے مجھے نابینا کیوں محشور کیا ہے جب کہ پہلے تو میں بینا تھا" (قال رب لم حشرتنی اعمٰی وقد کنت بصیرًا)۔

خدا کی طرف سے اُسے فوراً یہ جواب دیا جائے گا: یہ اس بنا پر ہے کہ ہماری آیات تیرے پاس آئی تھیں، تو تُو نے انہیں فراموش کر دیا اور انہیں ملحوظِ نظر نہ رکھا۔ لہٰذا آج کے دن تو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔ (قال کذالک اتتک اٰیٰتنا فنسیتھا وکذالک الیوم تنسٰی)۔

اور تیری آنکھیں پروردگار کی نعمتوں اور اس کے مقامِ قرب کو نہ دیکھ پائیں گی۔

❖ ❖ ❖

اور آخر میں مجموعی نتیجہ نکالتے ہوئے آخری زیرِ بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ اسراف کریں گے اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم انہیں اسی قسم کی جزا دیں گے: (وکذالک نجزی من اسرف ولم یؤمن بایات ربہ)۔

" اور آخرت کا عذاب اِس سے بھی زیادہ شدید اور زیادہ پائیدار ہے":
(ولعذاب الاٰخرۃ اشد وابقٰی)۔

❖ ❖ ❖

چند اہم نکات:

۱۔ **یادِ خدا سے غفلت اور اس کے نتائج:** کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے زندگی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اُسے بند دروازوں کا سامنا ہوتا ہے اور کبھی اس کے بالکل برعکس وہ جدھر بھی جاتا ہے ہر طرف اپنے لیے دروازوں کو کھلا ہوا پاتا ہے۔ ہر کام کے لیے حالات سازگار ہوتے ہیں اور کوئی بندش اور کسی قسم کی گرہ اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ یا اس حالت کو وسعتِ زندگی کہتے ہیں جب کہ پہلی حالت کو "ضیق" اور زندگی کی تنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "معیشت ضنک" کی تعبیر کہ جو اوپر والی آیت میں آئی ہے، اُس سے بھی یہی مراد ہے[1]۔

کبھی معیشت کی تنگی اِس بنا پر نہیں ہوتی کہ اس کی آمدنی کم ہے، بسا اوقات اس کی آمدنی میں ریل پیل ہوتی ہے لیکن بُخل،

[1] "ضنک" سختی اور تنگی کے معنی میں ہے، یہ لفظ ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تثنیہ، جمع اور مؤنث نہیں ہے۔



حرص اور لالچ زندگی کو اس پر تنگ کر دیتے ہیں ۔ نہ صرف یہ کہ ایسا شخص اس بات پر مائل نہیں ہوتا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہے اور دوسرے اس کی زندگی سے فائدہ اُٹھائیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے لیے بھی اسے کھلا نہیں رکھنا چاہتا۔

علی علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق :

"وہ اپنی زندگی تو فقیروں کی طرح سے بسر کرتا ہے لیکن اُس کا حساب سرمایہ داروں کا سا ہوگا۔"

واقعاً انسان ان تنگیوں اور سختیوں میں کیوں گرفتار ہو جاتا ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا اصلی عامل یادِ خدا سے رُوگردانی ہے۔ یادِ خدا رُوح کے لیے آرام و سکون اور تقویٰ و شہامت کا باعث ہے اور اس کو بُھلا دینا اضطراب، خوف اور پریشانی کا سبب ہے۔

جس وقت انسان خدا کو بُھلا دینے کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو بُھلا دے تو وہ شہوات ، خواہشات، حرص اور طمع میں غرق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حصہ میں تنگ زندگی ہی ہوگی ۔ نہ اس میں کچھ قناعت ہوگی کہ جو اس کی رُوح کی تسکین کا موجب ہو نہ اُس کی معنویت کی طرف توجہ ہوگی کہ جو اُسے رُوحانی غنا اور تونگری عطا کر دے اور نہ ہی اس کا وہ اخلاق ہوگا کہ جو اُسے طغیان شہوات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا سکے۔

اصولاً زندگی کی یہ تنگی زیادہ تر معنویات کی کمی اور رُوحانی استغنا کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مستقبل کے بارے میں مطمئن نہ ہونا، موجودہ امکانات و وسائل کے نابود ہو جانے کا خوف اور مادی دُنیا کے ساتھ انتہائی وابستگی بھی اس کا سبب بنتی ہے اور وہ شخص کہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور اُس نے اس کی پاک ذات کے ساتھ دل لگایا ہے، وہ ان تمام پریشانیوں سے امان میں ہوتا ہے۔

البتہ یہاں تک تو بات ایک فرد سے متعلق تھی لیکن جب ہم ایسے معاشرے میں جائیں کہ جو یادِ خدا سے منہ پھیرے ہوئے ہو تو پھر مسئلہ اس سے بھی زیادہ وحشت ناک ہو جائے گا ۔ وہ معاشرے کہ جو تعجب خیز اور حیرت انگیز صنعتی ترقی کے باوجود اور زندگی کے تمام وسائل فراہم ہونے کے باوجود شدید اضطراب اور پریشانی کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عجیب و غریب تنگی اور سختی میں گرفتار ہیں اور وہ اپنے آپ کو محبوس اور قیدی سمجھتے ہیں ۔

سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ تمام روابط اور تعلقات ذاتی مفادات کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ جنگ کے خوف سے اسلحہ سازی کا بھاری بوجھ ان کے زیادہ تر اقتصادی وسائل کو نگل گیا ہے اور ان کی کمریں اس بھاری بوجھ کے نیچے خم ہوگئی ہیں ۔
قید خانے مجرموں سے بھرے پڑے ہیں ان کے اپنے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہر گھڑی اور ہر منٹ میں کئی قتل اور کئی ہولناک جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے نشہ آور چیزوں اور فحاشی نے انہیں اپنا غلام اور قیدی بنا رکھا ہے۔ ان کے گھروں کے ماحول میں نہ نورِ محبت ہے اور نہ ہی نشاط بخش پیار کا رشتہ۔

ہاں ! یہ ہے ان کی سخت زندگی اور "معیشت ضنک"

امریکہ (شیطان اعظم) کے ایک سابق صدر نکسن نے اپنی پہلی صدارتی تقریر میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ
ہم اپنے گرداگرد ایسی زندگیاں دیکھ رہے ہیں کہ جو اندر سے خالی ہیں ۔ ہم خود کو خوش



زناکاری کے برابر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بہرحال وہ نکاح کے اصول و قواعد کی رو سے نکاح کی ایک شکل ہے۔

اعتراض کی دوسری بات یہ ہے کہ متعہ اس امر کا سبب ہے کہ بعض ہوس پرست افراد اس قانون سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی آڑ میں طرح طرح کی برائیاں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیک اور عزت والے افراد کبھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتے اور صاحب حیثیت اور عزت دار عورتیں کبھی اس کے قریب نہیں آتیں۔

وہ کونسا قانون ہے جس سے لوگ غلط فائدہ حاصل نہیں کرتے تو پھر کیا ضروری ہے کہ کسی فطری قانون اور اجتماعی ضرورت کو اس لیے روک دیا جائے کہ اس سے غلط فائدہ اٹھایا جاتا ہے یا غلط فائدہ اٹھانے والوں کی روک تھام کی جائے۔

فرض کیجئے کہ ایک جماعت حج بیت اللہ سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مقدس سفر میں منشیات کا کاروبار کرتی ہے تو کیا اس صورت میں لوگوں کو اس عظیم اسلامی کانفرنس میں شرکت سے منع کر دیا جائے گا یا غلط کاروبار کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ آج کے محترم افراد اس قانونِ اسلامی سے نفرت کرتے ہیں تو دراصل اس میں قانون کا عیب نہیں بلکہ قانون پر غلط عمل کرنے والوں کا قصور ہے یا اس سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس میں غلط فائدہ اٹھانے والوں کا قصور ہے۔ اگر آجکل کے معاشرے میں نکاح موقت پر صحیح خطوط اور درست صورت میں عمل کیا جائے اور اسلامی حکومت مخصوص قوانین و ضوابط کے تحت اسے درست طور پر عمل میں لائے تو غلط فائدہ اٹھانے والوں کی بھی روک تھام ہو سکے گی یوں محترم افراد بھی (ضرورت اجتماعی کے اجرا میں اظہار) حقارت نہیں کریں گے۔

کہتے ہیں کہ متعہ کی وجہ سے لاوارث بچے، ناجائز اولاد کی طرح معاشرے میں رہتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جو کچھ اس سے پہلے تحریر کر چکے ہیں اس سے اس سوال کا جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ناجائز اولاد قانون کی نظر میں ماں باپ میں سے کسی سے بھی وابستہ نہیں ہے۔ جبکہ متعہ کی اولاد اور عقد دائمی کی اولاد میں میراث اور دیگر حقوق اجتماعی کی رو سے ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ گویا حقیقت حال سے بے خبری اشکال اور شک و شبہ کا سرچشمہ ہے۔

رسل اور نکاح موقت

اس گفتگو کے آخر میں ایک مفید بات کی یاد دہانی ضروری معلوم ہوتی ہے جسے مشہور انگریز دانشور برٹرنڈ رسل نے اپنی کتاب "زناشوئی اور اخلاق"[1] میں آزمائشی شادی کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔ وہ نوجوانوں کا محاکمہ کرنے والے جج "بن بی لینڈسی" کی تجویز دوستانہ شادی یا آزمائشی شادی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

جج صاحب موصوف کی تجویز کے مطابق نوجوانوں کو یہ اختیار ملنا چاہیے کہ وہ ایک نئی قسم کی شادی کر سکیں۔ جو عام شادی (نکاح دائمی) سے تین امور میں مختلف ہو۔

---

[1] یہ برٹرنڈ رسل کی کتاب کے فارسی ترجمے کا نام ہے۔ (مترجم)



۱۔ طرفین کا مقصد صاحبِ اولاد ہونا نہ ہو اس سلسلے میں ضروری ہے کہ انہیں حمل روکنے کے طریقے سکھائے جائیں۔

۲۔ ان کی علیحدگی بآسانی ہو سکے۔

۳۔ طلاق کے بعد عورت کسی قسم کے نان و نفقہ کا حق نہ رکھتی ہو۔

رسل بج لینڈسی کا مقصد بیان کرنے کے بعد کہتا ہے:

میرا خیال ہے کہ اگر اس قسم کی شادی کو قانونی طور پر درست مان لیا جائے تو بہت سے نوجوان خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم وقتی نکاح پر تیار ہو جائیں گے اور ایک وقتی مشترک زندگی میں قدم رکھیں گے۔ ایسی زندگی جو اپنی جلو میں آزادی لیے ہوئے ہے۔ اس طرح بہت سی معاشرے کی خرابیوں، لڑائی جھگڑوں، خصوصاً جنسی بے راہ روی سے نجات مل جائے گی[1]

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ نکاح موقت کے بارے میں مندرجہ بالا تجویز کئی لحاظ سے اسلامی حکم کی طرح ہے لیکن جو شرطیں اور خصوصیتیں اسلام نے نکاح موقت کے لیے تجویز کی ہیں وہ کئی لحاظ سے زیادہ واضح اور مکمل ہیں۔ اسلامی نکاح موقت میں اولاد نہ ہونے دینا ممنوع نہیں ہے اور فریقین کا ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی آسان ہے۔ جدائی کے بعد نان و نفقہ بھی واجب نہیں ہے۔

ولاجناح علیکم فیما تراضیتم بہ من بعد الفریضۃ

آیت کے آخر میں یہ ذکر کرنے کے بعد کہ حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اگر طرفین عقد ایک دوسرے کی رضامندی کے ساتھ حق مہر کی مقدار میں کمی بیشی کریں تو کوئی ہرج نہیں ہے اس لیے کہ مہر ایک ایسا قرض ہے جو طرفین کی مرضی سے تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں عقدِ موقت و دائمی میں کوئی فرق نہیں ہے اگرچہ ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ یہ آیت نکاح موقت کے بارے میں ہے۔

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ایک اور بھی احتمال ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ نکاح موقت کے ختم ہونے پر طرفین مدت نکاح اور اس طرح حق مہر کے اضافے کے متعلق آپس میں موافقت کر لیں۔ نکاح موقت مدت مقررہ ختم ہونے سے پہلے بھی قابلِ تجدید ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ طے کر لیتے ہیں کہ معین شدہ مدت نکاح اور مقررہ حق مہر دونوں میں بقدرِ ضرورت اضافہ کر دیا جائے۔ روایاتِ اہلِ بیت میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ان اللہ کان علیماً حکیماً

جن احکام کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ ایسے ہیں جو نوعِ بشر کے لیے خیر و سعادت کے حامل ہیں کیونکہ پروردگارِ عالم بندوں کے مصالح سے آگاہ اور اجرائے قانون میں حکیم ہے۔

۲۵۔ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

---

[1] کتاب زناشوئی و اخلاق صفحہ ۱۸۹ و ۱۹۰۔



بِاِیۡمَانِكُمۡ ؕ بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَ اٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ ؕ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝

ترجمہ

۲۵ اور جو لوگ (آزاد) پاک دامن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ کنیزوں میں سے پاک دامن ایماندار عورتوں سے جو ان کی ملکیت میں ہیں نکاح کریں۔ خدا تمہارے ایمان سے آگاہ ہے اور تم سب ایک ہی پیکر کے مختلف اجزا ہو۔ اور ان (کنیزوں) سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو۔ لیکن ان کا حق مہر ان ہی کو اس شرط کے ساتھ دو کہ وہ پاک دامن رہیں۔ نہ یہ کہ وہ کھلے بندوں زنا کرتی پھریں اور نہ ڈھکے چھپے یار بنائیں اور جب وہ سہاگن ہوں اور پھر عفت کے منافی کام کریں تو ان کے لیے آزاد عورتوں سے آدھی سزا ہوگی۔ (کنیزوں سے نکاح کرنے کی) یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو (جنسی تقاضوں کے حوالے سے) سخت تنگ ہوں۔ اگر صبر و تحمل سے کام لو تو تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

کنیزوں سے نکاح

ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح ......

گذشتہ آیات میں نکاح کے متعلق مباحث کے بعد یہ آیت کنیزوں سے نکاح کرنے کی شرطیں بیان کرتی ہے۔ سب سے پہلے کہتی ہے: جو لوگ آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کے لیے مالی قدرت نہیں رکھتے وہ کنیزوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔ جن کا حق مہر اور عام طور پر باقی مصارف ان کی نسبت زیادہ سہل اور آسان ہوتے ہیں[1] البتہ کنیزوں سے نکاح سے مراد یہ نہیں ہے کہ کنیز کا مالک اپنی کنیز

---

[1] لفظ طول (بروزن نوع) اصل میں مادہ طول (بروزن نور) سے ہے اور یہ توانائی، رسائی، مالی وسائل وغیرہ کے معنی میں آیا ہے۔



سے نکاح کرے کیونکہ وہ تو ان شرطوں کے مطابق جو فقہ کی کتابوں میں ہیں اپنی کنیز کو ایک بیوی کی طرح رکھ سکتا ہے۔ بنابریں اس سے مراد مالک کے علاوہ دیگر افراد کا کسی کنیز سے نکاح کرنا ہے۔

ضمنی طور پر لفظ "مومنات" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کنیز کا یقینی طور پر مسلمان ہونا ضروری ہے تاکہ اس سے نکاح کر سکے۔ اس بنا پر اہلِ کتاب کنیزوں سے نکاح نہیں کر سکتا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن ان کنیزوں کے لیے "فتیات" کا لفظ استعمال کرتا ہے فتیات جمع ہے اور عام طور پر یہ لفظ قابلِ احترام عورتوں اور زیادہ تر نوجوان لڑکیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

واللہ اعلم بایمانکم

یہ جملہ بتاتا ہے کہ تم ان کے ایمان کی تشخیص کے لیے ان کی ظاہری حالات اور اعتقاد کے پابند رہو باقی رہا ان کا باطن اور ان کے دل کے بھید تو خدا تمہارے ایمان و عقیدہ سے زیادہ آگاہ ہے۔

بعضکم من بعض

چونکہ بعض لوگ کنیزوں سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے قرآن فرماتا ہے کہ تم سب ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہو اور تم ایک دوسرے سے ہو۔ اس بنا پر تمہیں کنیزوں سے نکاح کرنے میں کراہت نہیں کرنا چاہیے جو انسانی نقطۂ نظر سے مختلف نہیں ہیں اور معنوی قدر و قیمت کی رو سے بھی دوسروں کی طرح ان کی قدر و منزلت تقویٰ و پرہیزگاری سے وابستہ ہے اور تم ایک ہی جسم کے مختلف اعضا ہو۔

فانکحوھن باذن اھلھن

لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ نکاح مالک کی اجازت سے ہو۔ کیونکہ یہ اس کی اجازت کے بغیر باطل ہے اور مالک کو اہل سے تعبیر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مالکوں کو چاہیے کہ وہ کنیزوں کے ساتھ جنسِ تجارت اور مال و دولت کا سا سلوک نہ کریں بلکہ ایک خاندان کے سرپرست کی طرح ان کے ساتھ اولاد اور اہل و عیال جیسا مکمل انسانی برتاؤ کریں۔

واٰتوھن اجورھن بالمعروف

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے مناسب حق مہر مقرر کیا جائے اور وہ خود ان ہی کو دیا جائے یعنی مہر کی مالک خود لونڈیاں ہوں گی۔ اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ اس آیت میں ایک لفظ محذوف ہے۔ ان کے خیال میں اصل میں یوں ہے: اٰتوا مالکھن اجورھن (ان کا مہر ان کے آقاؤں کو دو) لیکن یہ تفسیر ظاہرِ آیت کے مطابق نہیں ہے۔ اگرچہ بعض روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔ ضمناً آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غلام بھی ان اموال کے مالک ہو سکتے ہیں جو جائز طریقوں سے ان کے ہاتھ آئے۔ اور "بالمعروف" یعنی اچھائی کے ساتھ "سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حق مہر مقرر کرنے میں ان پر کوئی ظلم و ستم نہ کیا جائے بلکہ ان کا واقعی حق یا معمول کے مطابق ادا کیا جائے۔

محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان

اس نکاح کی ایک اور شرط یہ ہے کہ ایسی کنیزوں کا انتخاب کیا جائے جو منافی عفت و پاک دامنی کوئی حرکت ظاہر بظاہر یا



ڈھکے چھپے یار بنا کر زنا کریں (ولا متخذات اخدان)۔ ؎

ممکن ہے اس موقع پر یہ سوال پیدا ہو کہ "غیر سافحات" کی تعبیر کے ذریعے زنا سے منع کرنے کے بعد پوشیدہ دوست بنانے (اخدان) سے منع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس امر کے پیش نظر کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ صرف کھلے بندوں زنا بُرا فعل ہے لیکن ڈھکے چھپے یاری لگا کر یہ کارروائی بُری نہیں ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے ہر دو قسم کی وضاحت کیوں فرمائی ہے۔

فاذا احصن فان اتین بفاحشة فعلیھن نصف ما علی المحصنات من العذاب

اس جملے میں ان احکام کی مناسبت سے جو کنیزوں کے ساتھ شادی کرنے اور ان کے حقوق کی حمایت کے بارے میں ہیں درمیان میں ان کی سزا کے بارے میں بھی بحث آگئی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ پاکدامنی اور عفت کی راہ سے ہٹیں اور بدکاری کریں تو آزاد عورتوں کی نسبت انہیں آدھی سزا دی جائے یعنی انہیں پچاس کوڑے مارے جائیں۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن فرماتا ہے "اذا احصن" یعنی اگر وہ محصنہ ہوں تو ان کے لیے یہ سزا ہوگی۔

"محصنہ" سے یہاں کیا مراد ہے

مفسرین نے اس کے بارے میں کئی احتمال لکھے ہیں۔ بعض نے مشہور فقہی اصطلاح اور سابقہ آیت کے مطابق شوہر دار عورت کے معنی میں اور بعض نے اسے مسلمان کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ لفظ صرف اس جملے میں دو مرتبہ آیا ہے اس لیے دونوں جگہ ایک ہی معنی میں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف سہاگنوں کی سزا سنگساری ہے نہ کہ تازیانے۔ غرض اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی تفسیر جس میں محصنہ کے معنی شوہر والی عورت بیان کیا گیا ہے قابل قبول نہیں ہے۔ اسی طرح دوسری تفسیر یعنی مسلمان ہونا اس پر بھی کوئی شاہد نہیں ہے۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ محصنات چونکہ قرآن مجید میں زیادہ تر پاک دامن عورتوں کے معنی میں آیا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق یہ ہے کہ زیر نظر آیت اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یعنی وہ لونڈیاں جو مالکوں کی سختی کے ڈر سے جسم فروشی کرتی تھیں انہیں تو سزا معاف ہے لیکن وہ کنیزیں جو اس جان لیوا سختی سے دوچار نہیں ہیں اور پاکدامنی کی زندگی بسر کر سکتی ہیں اگر وہ منافی عفت کام کریں تو انہیں آزاد عورتوں کی طرح سزا دی جائے گی۔ لیکن ان کی سزا آزاد عورتوں کی نسبت آدھی ہوگی۔

ذلک لمن خشی العنت منکم

عنت (بروزن سند) اصل میں ہڈی کے دوبارہ ٹوٹنے کو کہتے ہیں یعنی ہڈی کا درست ہو کر زخم ملنے کے بعد نئے سرے سے کسی حادثے کی وجہ سے ٹوٹ جانا۔ واضح ہے کہ اس قسم کا ٹوٹنا انتہائی دردناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے اسی لیے "عنت" کا لفظ روح زخما

؎ اخدان خدن کی جمع ہے۔ یہ اصل میں دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے۔ لیکن عام طور پر ایسے افراد کے لیے بولا جاتا ہے جو مخالف جنس کے ساتھ پوشیدہ اور ناجائز تعلق رکھتے ہوں۔ یاد رکھیے کہ لفظ خدن قرآن میں مرد اور عورت دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔



مشکلوں اور دکھ تکلیف پہنچانے والے کاموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید مندرجہ بالا جملے میں فرماتا ہے: کنیزوں کے ساتھ شادی ان لوگوں کے لیے ہے جو جنسی خواہش کی وجہ سے بہت تنگ ہوں اور آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے ہوں لہٰ اس بنا پر اس قسم کی شادی دوسرے افراد کے لیے جائز نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس حکم کا فلسفہ یہ ہو کہ اس زمانے میں خصوصاً لونڈیوں کی تربیت برے اور گئے گزرے حالات میں ایسی ہوتی تھی کہ وہ طبعاً اخلاقی، روحانی اور معاشرتی نقائص میں مبتلا تھیں اور مسلم ہے کہ جو بچے اس شادی سے پیدا ہوتے، ان پر ماں کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا۔ اسی بنا پر اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے ایک زبردست، تدریجی اور عمدہ پروگرام پیش کیا تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے غلام بن کر نہ رہ جائیں نیز ضمنی طور پر غلاموں اور کنیزوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شادی کر سکیں۔ یقیناً یہ بات اس امر کے منافی نہیں ہے کہ بعض کنیزیں اخلاق اور تربیتی لحاظ سے مخصوص استثنائی کیفیت رکھتی تھیں۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ کنیزوں کی اکثریت کے بارے میں تھا اب اگر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ بعض بزرگان دین کی مائیں کنیزیں تھیں تو استثنائی لحاظ ہی سے متعلق تھیں۔ البتہ یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ کنیزوں کے بارے میں ہے، ضرورت کے بغیر ممنوع ہے وہ ان سے شادی اور نکاح ہے نہ کہ ملکیت کے اعتبار سے جنسی میل ملاپ۔

وان تصبروا خیر لکم

جہاں تک تمہاری طاقت میں ہو کہ تمہارا دامن گناہ سے آلودہ نہ ہو، اپنے آپ کو کنیزوں کے ساتھ شادی بیاہ سے بچانا فائدہ مند ہے۔

و اللہ غفور رحیم

اور خدا ان برے کاموں کو جو تم گزرے ہوئے زمانے میں جہالت اور بے خبری کی وجہ سے کرتے رہے ہو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۲۶۔ يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

۲۷۔ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ○

۲۸۔ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ○

ترجمہ

۲۶ خدا چاہتا ہے (کہ ان احکام کے ذریعے نیکی اور خوش قسمتی کی راہیں) تمہارے لیے واضح کرے اور گزرے ہوئے لوگوں



کے (صحیح) طریقوں اور سنتوں کی طرف تمہاری ہدایت و رہبری کرے اور تمہیں گناہوں سے پاک کرے اور خدا دانا و حکیم ہے۔

۲۷ اور خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے (اور گناہوں سے پاک کر دے) لیکن جو لوگ شہوت کے غلام ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بالکل منحرف ہو جاؤ۔

۲۸ خدا چاہتا ہے (کنیزوں سے نکاح اور اسی قسم کے دوسرے احکامات کے ذریعے) تمہارے لیے کام کو آسان کر دے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے (اور اپنی فطرت و سرشت کے پیش نظر مثبت جواب دہی کا محتاج ہے)۔

تفسیر

یہ پابندیاں کس بنا پر ہیں

یرید اللہ لیبین لکم و یھدیکم سنن الذین من قبلکم و یتوب علیکم

ان شروط و قیود اور مختلف احکام کے بعد جو گذشتہ آیتوں میں نکاح کے متعلق اشارۃً بیان ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ ان تمام قانونی قید و بند اور حدود کا کیا مقصد ہے کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ان امور میں انسان کو کھلی آزادی دے دی جاتی تاکہ جس طرح بعض دنیا پرست ہر ذریعے اور ہر طریقے سے لذت اور فائدہ اٹھاتے ہیں دوسرے لوگ بھی اس سے بہرہ ور ہوتے۔ مندرجہ بالا آیت حقیقت میں ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتاتی ہے کہ خدا چاہتا ہے، کہ ان مقررات اور احکام کے ذریعے تمہارے لیے حقائق واضح کرے اور تمہاری رہبری ایسے راستوں کی طرف کرے جن میں تمہارے لیے فائدہ ہی فائدہ ہے اور دیکھو تمہارے لیے ہی یہ پروگرام نہیں ہے بلکہ گذشتہ پاکیزہ قومیں بھی اس قسم کی سنتیں (قواعد و ضوابط) رکھتی تھیں۔ علاوہ ازیں خدا چاہتا ہے کہ تمہیں بخش دے اور اس کی وہ نعمتیں جو تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے تم پر بند ہو گئی ہیں دوبارہ تمہیں عنایت فرمائے اور یہ اس صورت میں ہے کہ قبل از اسلام زمانۂ جاہلیت میں نافرمانی کے جو راستے تم نے اختیار کر رکھے تھے ان سے پلٹ آؤ۔

و اللہ علیم حکیم

خدا اپنے احکام کے اسرار و رموز کو جانتا ہے اس نے اپنی حکمت سے تمہارے لیے احکام کو نافذ کیا ہے۔

واللہ یرید ان یتوب علیکم و یرید الذین یتبعون الشھوات ان تمیلوا میلا عظیما

از سر نو تاکید کرتا ہے کہ خداوند عالم ان احکام کے ذریعے یہ چاہتا ہے کہ وہ نعمتیں اور برکتیں جو تمہارے شہوتوں میں آلودہ



ہونے کی وجہ سے تم سے چھن گئی تھیں، ان سے دوبارہ تمہیں نوازے لیکن وہ شہوت پرست جو گناہوں کی موجوں میں غرق ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تم نیکی کے راستے سے بالکل منہ موڑ لو اور ان کی طرح سر سے لے کر پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جاؤ۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ وہ پابندیاں جو تمہاری نیکی اور بلندی درجات کے لیے ہیں تمہارے لیے بہتر ہیں یا یہ آزادی اور شتر بے مہار ہونا جس میں شکست تنزل اور بدبختی ہے۔

یہ آیات حقیقت میں ان افراد کو جو ہمارے زمانے میں بھی دینی قوانین خصوصاً جنسی مسائل کے سلسلے میں اعتراضات کرتے ہیں جواب دیتی ہیں کہ ان بے قید و بند آزادیوں کی حقیقت سراب کی سی ہے اور ان کا نتیجہ انسانیت کی تکمیل و ترقی، کامیابی اور خوش بختی کی راہ سے روگردانی، بے راہروی میں گرفتاری اور ہلاکت کے گڑھوں میں گرنے کے مترادف ہے۔ جن کے بہت سے نمونے ہم اپنی آنکھوں سے خاندانوں کی تباہی، مختلف قسم کے جنسی جرائم، ناجائز اولاد، جنسی بیماریوں اور نفسیاتی پریشانیوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

یرید اللہ ان یخفف عنکم وخلق الانسان ضعیفا

یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پہلا حکم مقررہ شرطوں کے ماتحت کنیزوں سے نکاح کی آزادی کے بارے میں ایک قسم کی آسانی اور کشادگی کے لیے تھا کیونکہ انسان اصولی طور پر ایک کمزور مخلوق ہے جس پر خواہشات نفسانی شہوانی کے طوفان ہر طرف سے حملہ کرتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو ان کے مقابلے کے لیے ایسے جائز شرعی طریقے بتائے جن سے انسان ان خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کرسکے اور اپنے آپ کو غلط راستوں پر چلنے سے محفوظ رکھ سکے۔

۲۹۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَأۡكُلُوٓاْ أَمۡوَٰلَكُم بَيۡنَكُم بِٱلۡبَٰطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً عَن تَرَاضٖ مِّنكُمۡۚ وَلَا تَقۡتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيمٗا ○

۳۰۔ وَمَن يَفۡعَلۡ ذَٰلِكَ عُدۡوَٰنٗا وَظُلۡمٗا فَسَوۡفَ نُصۡلِيهِ نَارٗاۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرًا ○

ترجمہ

۲۹ اے ایمان والو ایک دوسرے کے مال باطل (اور ناجائز طریقے) سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ ایسی تجارت ہو جو تمہاری رضامندی سے کی جائے اور خودکشی نہ کرو۔ خدا تم پر مہربان ہے۔

۳۰ اور جو شخص اس کام کو از روئے ظلم کرے تو اسے ہم بہت جلد آگ میں ڈالیں گے اور یہ کام خدا وند عالم کے لیے آسان ہے۔



تفسیر

معاشرے کی سلامتی کا دارو مدار اقتصادی سلامتی پر ہے

یا ایھا الذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل

درحقیقت یہ آیت قوانینِ اسلام کی بنیاد کو مالی معاملات اور مبادلات سے تعلق رکھنے والے مسائل سے مربوط کرتی ہے۔ اسی وجہ سے فقہائے اسلام لین دین اور معاملات کے تمام ابواب میں اسی سے استدلال کرتے ہیں۔ آیت ایماندار لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے: ایک دوسرے کے اموال غلط اور باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔ یعنی دوسروں کے مال میں ہر قسم کا تصرف جو منطقی اور عقلی جواز کے بغیر ہو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور ان سب کو ایک لفظ "باطل" کے تحت بیان کر دیا گیا ہے۔ جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے ہم جانتے ہیں کہ باطل حق کے مقابلے میں ہے اور وہ ہر اس چیز کو جو بری، بے مقصد اور بے بنیاد ہو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی مندرجہ بالا عبارت کے مشابہ عبارتوں کے ذریعے اس امر کی تاکید کی گئی ہے مثلاً قوم یہود کی مذمت اور ان کی بدکرداری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

واکلھم اموال الناس بالباطل (نساء ۱۶۱)

وہ لوگوں کے مال میں جواز کے بغیر غلط تصرف کرتے تھے۔

اور سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۸ میں ہے:

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل

اس میں بھی لوگوں کو بلا وجہ اور بے بنیاد دعووں کے ذریعے مال ہڑپ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس بنا پر ہر قسم کی زیادتی، دھوکا، فریب، سودی لین دین اور ایسے معاملے جن کی حدیں مکمل طور سے معین و مقرر نہیں ہیں، ایسی اجناس کی خرید و فروخت جن میں منطقی اور عقلی طور پر فائدہ نہیں ہے اور فساد و گناہ کے وسائل کی خرید و فروخت سب کے سب اسی کلی قانون کے تحت ہیں۔ اگرچہ بہت سی روایتوں میں لفظ باطل کی تفسیر قمار بازی اور سود وغیرہ کی گئی ہے لیکن یہ در اصل ان چیزوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو واضح طور پر اس لفظ میں شامل ہیں نہ یہ کہ باطل انہی تک محدود ہے۔ شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ "اکل" (کھانا) سے تعبیر کرنا ہر قسم کے تصرف کی طرف اشارہ ہے۔ چاہے وہ معمول کے مطابق کھانے سے ہو یا پہننے اور رہائش وغیرہ سے اور یہی معنی عربی زبان کے علاوہ آجکل کی فارسی میں بھی مکمل طور پر رائج ہے [1]

الا ان تکون تجارۃ عن تراض

یہ جملہ گذشتہ قانونِ کلی کی استثنائی صورت بیان کر رہا ہے لیکن اصطلاحی طور پر استثنائے منقطع ہے [2] یعنی جو کچھ اس جملے

---

[1] اُردو میں بھی "کھانا" اسی وسیع معنی میں مستعمل ہے۔ (مترجم)

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ



میں آیا ہے وہ پہلے قانون میں شروع ہی سے داخل نہ تھا اور صرف ایک تاکید اور یاددہانی کے طور پر ذکر ہوا ہے اور یا اپنے مقام پر خود ایک کلی قانون ہے کیونکہ خدا تعالےٰ فرماتا ہے، مگر یہ کہ تمہارا دوسروں کے مالوں میں تصرف عدل و انصاف کے مطابق ہو جو طرفین کی باہمی رضا و رغبت سے ہو۔ اس لیے اس بیان کے مطابق تمام مالی مبادلات اور لوگوں میں مروج مختلف طرح کی تجارت اگر طرفین کی رضامندی سے ہو اور عقل و منطق کے مطابق ہو تو وہ اسلام میں جائز ہے۔ مگر وہ امور اس میں داخل نہیں ہیں جن سے بر بنائے مصلحت صریحاً ممانعت کی گئی ہو۔

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیمًا

اس کے بعد آیت کے ذیل میں لوگوں کو قتل نفس سے منع کیا گیا ہے۔ اگر قرآن کا یہ جملہ سامنے رکھا جائے: ان اللہ کان بکم رحیمًا یعنی خداوند عالم تمہاری نسبت زیادہ مہربان ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا جملہ خودکشی سے نہی کے بارے میں ہے۔ یعنی مہربان خدا نہ صرف اس پر راضی نہیں کہ کوئی دوسرا تمہیں قتل کرے بلکہ خود تمہیں بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ تم خود سے اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ روایات اہل بیتؑ میں بھی زیر نظر آیت کا مفہوم خودکشی سے امتناع ہی بیان کیا گیا ہے[1]۔

اب یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ قتل نفس اور لوگوں کے مال میں باطل و ناحق تصرف میں کیا تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے اور حقیقت میں قرآن نے ان دونوں احکام کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر کر کے ایک اہم اجتماعی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر لوگوں کے مالی مسائل صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہوں اور معاشرے کے اقتصادی معاملات خوشگوار طریقہ سے آگے نہ بڑھیں سو وہ ایک دوسرے کے اموال میں ناحق تصرف کریں تو سماج ایک قسم کی خودکشی میں گرفتار ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کہ شخصی خودکشی میں اضافہ ہوگا اجتماعی اور معاشرتی خودکشی بھی اس کے یقینی اثرات میں سے ہوگی۔ اس سے دور حاضر کے مختلف معاشروں میں آنے والے حوادث و انقلاب اس حقیقت کے شاہد عادل ہیں۔ چونکہ خداوند عالم اپنے بندوں پر مہربان ہے لہٰذا انہیں خطرے سے خبردار کرتا ہے تاکہ وہ ہوشیار اور چوکنے رہیں۔ کہیں غلط قسم کے مبادلات مال اور غیر صحیح اقتصادی نظام ان کے معاشرے کو نیست و نابود کر کے نہ رکھ دے۔

ومن یفعل ذٰلک عدوانًا وظلمًا فسوف نصلیہ نارًا

اور جو شخص اس حکم کو نہ مانے اور لوگوں کا ناحق مال کھا کر گناہگار ہو یا خودکشی کی طرف بڑھے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس جہان کی آگ میں جلے گا بلکہ وہ قہر و غضب پروردگار کی آگ میں بھی جلے گا اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے (وکان ذٰلک علی اللہ یسیرا)[2]

بقیہ حاشیہ از صفحہ سابق

استثناء منقطع اکثر و بیشتر حکم عام کی عمومیت کی تاکید کے لیے آتا ہے اور یہی معنی آیت مندرجہ بالا پر صادق آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس حقیقت کا بھی پتہ دیتا ہے کہ تصرفات باطل کی حرمت کے باوجود زندگی کی راہیں تمہارے لیے بند نہیں ہیں اور تم جائز تجارت کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو۔

[1] تفسیر مجمع البیان آیۂ مذکور کے ذیل میں، نور الثقلین جلد اول صفحہ ۳۴۷ پر ملاحظہ فرمائیے۔

[2] صلی (بروزن سرو) اصل میں آگ کے قریب جانے کے معنی میں ہے۔ تاہم آگ سے گرم ہونے، جھلسنے اور جلنے کو بھی صلی کہتے ہیں زیر بحث آیت میں یہ لفظ آگ میں داخل ہونے اور جلنے کے معنی میں ہے۔



۳۱۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ○

ترجمہ

۳۱۔ اگر تم ان گناہانِ کبیرہ سے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے گناہوں کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں نہایت عمدہ اور اچھی جگہ عنایت فرمائیں گے۔

تفسیر

گناہانِ کبیرہ وصغیرہ

ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیاتکم

یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے "کہ اگر تم ان گناہانِ کبیرہ کو جن کی ممانعت کی جاچکی ہے چھوڑ دو، تو ہم تمہارے "سیئات" کی پردہ پوشی کریں گے اور تمہیں بخش دیں گے اور تمہیں جنت عطا کریں گے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام قرآن نے کبیرہ رکھا ہے اور دوسری قسم کا "سیئۃ" اور سورۂ نجم کی آیت ۳۲ میں سیئۃ کی بجائے "لمم"[1] فرمایا ہے اور سورۂ کہف کی آیت ۴۹ میں کبیرہ کے مقابلے میں صغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جہاں ارشاد ہوتا ہے:

لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا

یہ اعمال نامہ کسی چھوٹے بڑے گناہ کو نہ بھولے گا اور اسے ضرور شمار کرے گا۔

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ گناہ کی جانی پہچانی دو قسمیں ہیں کہ جن کو کبھی کبیرہ اور صغیرہ سے اور کبھی کبیرہ اور سیئۃ سے اور کبھی کبیرہ اور لمم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ گناہ صغیرہ وکبیرہ کے تعین کے لیے کیا ضابطہ اور میزان ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں نسبتی امور ہیں یعنی جب دو گناہوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جائے تو جس کی اہمیت زیادہ ہے وہ کبیرہ ہے اور جس کی کم حیثیت ہے وہ صغیرہ ہے۔ اس لیے ہر گناہ اپنے سے زیادہ بڑے گناہ کی نسبت سے گناہِ صغیرہ ہوگا اور اپنے سے چھوٹے گناہ کی نسبت کبیرہ ہوگا[2] لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی کسی طرح بھی زیرِ نظر آیت کے مطابق نہیں کیونکہ آیت نے

---

[1] لمم (بروزن قسم) چھوٹے اور کم اہمیت والے کام کو کہتے ہیں۔

[2] طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اس عقیدے کی نسبت شیعہ علماء کی طرف دی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ ہمارے بہت سے علماء دوسرا نظریہ رکھتے ہیں جس کی ہم تشریح کریں گے۔



دو گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے مد مقابل قرار دیا ہے اور ایک سے پرہیز کو دوسرے کی بخشش کا ذریعہ قرار دیا ہے (غور فرمائیے گا)۔

لیکن اگر کبیرہ کے لغوی معنی کو دیکھیں تو ہر وہ گناہ کبیرہ ہوگا جو اسلام کی نظر میں بڑا اور زیادہ اہم ہے اور اس کی اہمیت کی نشانی یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید نے صرف اس کی ممانعت پر قناعت نہ کی ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عذاب جہنم کی دھمکی بھی ہو مثلاً قتل زنا، سود خوری وغیرہ۔ اسی لیے روایاتِ اہلِ بیتؑ میں ہے:

الکبائر التی اوجب اللہ عز وجل علیھا النار

گناہانِ کبیرہ وہ ہیں جن پر خداوند عالم نے آگ کی سزا مقرر فرمائی ہے[1]

اس حدیث کا مضمون حضرت امام باقرؑ حضرت امام جعفر صادقؑ اور امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے۔ گناہانِ کبیرہ کو سمجھنے اور مذکورہ ضابطے کی روشنی میں انہیں پہچاننے کے بعد کام آسان ہو جاتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ روایات میں کبائر کی تعداد سات اور بعض میں بیس[2] اور بعض میں ستر ہے جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں وہ اس کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ اصل میں ان روایات میں سے بعض پہلے درجہ کے گناہانِ کبیرہ کی طرف بعض دوسرے درجہ کے کبائر کی طرف اور بعض سب گناہانِ کبیرہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ایک اشکال اور اس کی وضاحت

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت تو گناہانِ صغیرہ کی تشویق دلاتی ہے کیونکہ وہ کہتی ہے: گناہانِ کبیرہ کو ترک کرنے کے بعد گناہانِ صغیرہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔

اس آیت میں جس تعبیر کا ذکر کیا گیا ہے اس سے اعتراض کا جواب بخوبی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن فرماتا ہے: نکفر عنکم سیئاتکم (ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو چھپا دیں گے) یعنی گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کرنا خصوصاً جبکہ ان کے مضبوط ہونے کی صورت میں انسان میں تقویٰ ایک ایسی حالت پیدا کر دیتا ہے جو ممکن ہے چھوٹے گناہوں کے اثرات کو اس کے وجود سے دھو ڈالے۔ اصل میں یہ آیت اس آیت کی طرح ہے:

ان الحسنات یذھبن السیئات (ھود: ۱۱۴)

حسنات، سیئات کو ختم کر دیتے ہیں۔

زیر نظر آیت میں حقیقی نیک اعمال کے حقیقی آثار کی طرف اشارہ ہے اور یہ بالکل اس طرح سے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ اگر انسان خطرناک زہریلے مواد سے پرہیز کرے اور اس کی صحت بھی صحیح و سالم ہو تو صحت کی سلامتی کی وجہ سے بعض غیر مناسب غذاؤں کے ناپسندیدہ اثرات ختم ہو سکتے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۴۷۳۔



گناہ صغیرہ کس طرح گناہ کبیرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے

اس موقع پر ہمیں ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دینی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ گناہ صغیرہ اس صورت میں صغیرہ رہتا ہے جب اس میں تکرار نہ ہو علاوہ ازیں اسے معمولی سمجھتے ہوئے، غرور اور سرکشی کے طور پر نہ کیا جائے کیونکہ قرآن اور اسلامی روایات کے مطابق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکثر مواقع پر گناہان صغیرہ، گناہان کبیرہ میں بدل جاتے ہیں مثلاً

۱۔ جب انہیں بار بار کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لاصغیرۃ مع الاصرار

کوئی گناہ بار بار کرنے سے گناہ صغیرہ نہیں رہتا[1]

۲۔ جب کسی گناہ کو چھوٹا اور معمولی سمجھا جائے۔ چنانچہ نہج البلاغہ میں ہے:

اشد الذنوب ما استهان به صاحبه

سخت ترین گناہ وہ ہے جس کا کرنے والا اُسے چھوٹا سمجھے[2]

۳۔ جب گناہ طغیان، تکبر اور حکم پروردگار کے سامنے سرکشی کے ارادے سے کیا جائے۔ یہ بات مختلف آیتوں سے اجمالی طور پر معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ النٰزعٰت کی آیت ۳۷ میں ہے:

رہے وہ لوگ جو سرکشی اور طغیان کریں، دنیاوی زندگی کو آخرت پر مقدم سمجھیں تو ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۴۔ وہ گناہ جو ایسے افراد سے سرزد ہوں جو معاشرے میں ایک خاص مقام رکھتے ہوں اور ان کی لغزش دوسروں کے برابر نہ سمجھی جاتی ہو۔ جیسے قرآن سورۂ احزاب میں ازواج پیغمبرؐ کے بارے میں فرماتا ہے:

اگر تم کوئی بُرا کام کرو گی تو اُس کی سزا دگنی پاؤ گی۔

اور حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من سن سنة سيئة فعليه وزرها و وزر من عمل بها لا ينقص من اوزارهم شيئًا

اگر کوئی شخص بری سنت اور طریقے کی بنیاد رکھے تو اس کا گناہ اس پر ہو گا۔ اسی طرح ان تمام لوگوں کا گناہ بھی جو اس پر عمل کریں گے اس کے بغیر کہ ان کے گناہ میں کچھ کمی ہو[3]

۵۔ جب اس گناہ کے کرنے پر خوش ہو اور اس پر فخر کرے۔ جیسا کہ حضرت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

من اذنب ذنبا و هو ضاحك دخل النار و هو باك

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲۸۸۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار۔

[3] محجۃ البیضاء جلد ۷ صفحہ ۶۱۔



جو شخص گناہ کرے اور پھر اس پر ہنسے تو وہ روتے ہوئے جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔

۶۔ گناہ کے بعد فوراً سزا نہ ملنے کو رضائے الٰہی کی دلیل سمجھے اور اپنے آپ کو سزا سے محفوظ اور بارگاہ الٰہی میں محبوب قرار دے جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ مجادلہ آیت ۸ میں ہے:

(مغرور گناہگار) اپنی طرف سے کہیں گے کہ خدا ہمیں کیوں سزا نہیں دیتا۔

اس کے بعد قرآن مزید فرماتا ہے:

ان کے لیے دوزخ کی آگ کافی ہے۔

۳۲۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ○

ترجمہ

۳۲۔ جو فضیلت خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر دی ہے اس کی تمنا اور آرزو نہ کرو۔ (یہ طبعی فرق تمہارے معاشرے کے نظام کی حفاظت کے لیے، حقوق اور عدالت کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کے باوجود) مرد اس سے جو کسب و کوشش کرتے ہیں حصہ پا لیتے ہیں اور عورتیں جو کسب اور کوشش کرتی ہیں اس میں سے حصہ حاصل کرتی ہیں۔ (کسی کے حقوق پامال نہیں ہونے چاہئیں) اور خدا سے اس کے فضل (اور رحمت و برکت) کا سوال کرتے رہو اور وہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

شانِ نزول

مشہور مفسّر "طبرسی" "مجمع البیان" میں نقل کرتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ (زوجۂ پیغمبرؐ) نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا:

جب مرد جہاد کے لیے جاتے ہیں تو عورتیں کیوں جہاد نہیں کر سکتیں اور ہمارے لیے آدھی میراث کیوں ہے؟

کاش ہم بھی مرد ہوتیں اور ان کی طرح جہاد پر جاتیں اور معاشرے میں ان کی سی حیثیت رکھتیں۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس کے ذریعے اس سوال اور ایسے ہی دوسرے سوالات کا جواب دیا گیا۔ تفسیر المنار میں ہے کہ جب میراث کی آیت نازل ہوئی اور اس نے مردوں کا حصہ عورتوں سے دوگنا بتایا تو بعض مسلمان مرد کہنے لگے: کاش ہمارا معنوی اجر و ثواب ان کی طرح ہوتا اور بعض عورتوں نے کہا کہ کاش ہماری سزا اور عذاب بھی مردوں کی سزا سے آدھی ہوتی جس طرح ہماری میراث ان کی نسبت آدھی ہے۔

اس پر آیت مندرجہ بالا نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔ یہی شانِ نزول تفسیر فی ظلال اور روح المعانی میں معمولی سے



سُورۂ انبیاء کی فضیلت

پیغمبر اسلامؐ سے اِس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں منقول ہے :

من قرء سورة الانبیاء حاسبه الله حسابا یسیرا . وصافحه وسلم علیه کل نبی ذکر اسمه فی القرآن .

جو شخص سورۂ انبیاء کو پڑھے گا خدا اس کے حساب کو آسان کردے گا (روز قیامت اس کے اعمال کا حساب لینے میں سخت گیری نہیں کرے گا) اور ہر وہ پیغمبر جس کا نام قرآن میں ذکر ہوا ہے وہ اُس سے مصافحہ کرے گا اور ــــــ اسے سلام کرے گا۔[1]

اور امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے :

من قرء سورة الانبیاء حبالها کان کمن رافق النبیین اجمعین فی جنات النعیم ، وکان مهیبا فی اعین الناس حیاة الدنیا .

جو شخص سورۂ انبیاء کو عشق ومحبت کے ساتھ پڑھے گا وہ جنت کے پُرنعمت باغوں میں تمام انبیاء کا رفیق اور ہم نشیں ہوگا اور دنیا کی زندگی میں بھی لوگوں کی نگاہ میں باوقار ہوگا۔[2]

لفظ "حبالها" (اس سورہ سے عشق ومحبت رکھتے ہوئے) درحقیقت ان روایات کے معنی کے سمجھنے کے لیے ایک کلید ہے کہ جو قرآن کی سورتوں کی فضیلتوں کے سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں یعنی صرف الفاظ کا پڑھ لینا ہی مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معانی ومطالب سے محبت کرنا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ معنی ومفہوم سے محبت عمل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی، اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں فلاں سورہ کا عاشق ہوں اور اس کا عمل اس کے مفاہیم کے خلاف ہو تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کتاب عقیدہ وعمل ہے اور اس کا پڑھنا مقدمہ اور تمہید ہے سمجھنے کے لیے اور سمجھنا مقدمہ ہے ایمان وعمل کے لیے۔

---

[1] تفسیر نورالثقلین، ج ۳، ص۴۱۲۔

[2] تفسیر نورالثقلین، ج ۳، ص۴۱۲۔



اِس سُورہ کے مضامین

۱۔ یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، انبیاءؑ کی سورت ہے کیونکہ اِس میں سولہ انبیاءؑ کے نام آئے ہیں بعض کے خاص خاص حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا صرف ذکر ہے۔ اور وہ ہیں : موسیٰ، ہارون، ابراہیم، لوط، اسحٰق یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، اسمٰعیل، ادریس، ذاالکفل، ذاالنون (یونس) زکریا اور یحییٰ علیہم السلام۔

اس بنا پر اِس سورہ کے اہم مباحث انبیاءؑ کے پروگراموں کے بارے میں ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ ایسے انبیاءؑ بھی ہیں کہ جن کے نام اِس سورہ میں صراحت کے ساتھ نہیں لیے گئے لیکن ان کے بارے میں کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں مثلاً پیغمبرِاسلامؐ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام۔

۲۔ اس کے علاوہ مکی سورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ عقائدِ دینی خصوصاً مبداء و معاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں ——— اِس سورہ میں بھی یہ بات پُوری طرح موجود ہے۔

۳۔ اِس سورہ میں خالق کی وحدت اور یہ کہ اس کے سوا اور کوئی معبود اور پیدا کرنے والا نہیں ہے نیز عالم کی پیدائش، مقصد اور پروگرام کے مطابق ہونے اور اس جہان پر حاکم قوانین کی وحدت اور اسی طرح حیات و ہستی کے سرچشمہ کی وحدت نیز موجودات کی فنا اور موت کے پروگرام میں وحدت کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔

۴۔ اِس سورہ کے ایک حصہ میں حق کی باطل پر، توحید کی شرک پر، عدل و انصاف کے لشکر کی جنودِ ابلیس پر کامیابی و کامرانی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۵۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ سورہ غافل اور بے خبر لوگوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے حساب و کتاب سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اختتام میں بھی اسی سلسلہ کی دوسری تنبیہیں ہیں۔

وہ انبیاءؑ کہ جن کے نام اِس سورہ میں آئے ہیں ان میں سے بعض کی زندگی کا بیان اور ان کے تفصیلی پروگرام دوسری سورتوں میں ذکر ہوئے ہیں لیکن اِس سورہ میں زیادہ تر انبیاءؑ کے حالات کے اس حصہ کا ذکر ہے کہ وہ جس وقت سخت قسم کی تنگی میں گرفتار ہوتے تھے تو وہ حق تعالیٰ کے دامنِ لطف کی طرف کس طرح سے دستِ توسل پھیلاتے تھے اور کس طرح سے خدا ان کے لیے بند دروازے کھول دیتا تھا اور طوفان و گرداب سے انہیں نجات بخشتا تھا۔

ابراہیمؑ جب نمرود کی آگ میں گرفتار ہوئے۔

یونسؑ جب مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے۔

زکریاؑ نے جب اپنی عمر کے آفتاب کو غروب ہونے کے قریب دیکھا لیکن ان کا کوئی جانشین نہیں تھا کہ جو ان کے پروگراموں کی تکمیل کرے۔

اور اسی طرح باقی انبیاءؑ جب وہ سخت مشکلات میں گھرے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝

۲۔ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝

۳۔ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَأْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝

۴۔ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

۵۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ لوگوں کا حساب کتاب ان کے نزدیک آچکا ہے لیکن وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

۲۔ جو کوئی بھی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس آتی ہے وہ اسے کھیل سمجھتے ہیں اور مذاق اڑانے کے انداز میں اُسے سنتے ہیں۔

۳۔ (حالت یہ ہے کہ) ان کے دل کھیل اور بے خبری میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ ظالم چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) کیا اس کے سوا کچھ اور بات ہے کہ یہ تم ہی جیسا ایک بشر ہے؟ کیا تم دیکھتے بھالتے جادو کے پاس جاتے ہو؟

۴۔ (لیکن پیغمبر نے) کہا: میرا پروردگار آسمان اور زمین کی ہر بات جانتا ہے اور وہ (بڑا) سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۵۔ انہوں نے کہا (جو کچھ محمدؐ لایا ہے یہ وحی نہیں ہے بلکہ) یہ پریشان خواب و خیال ہیں بلکہ اُس نے دل سے جھوٹ گھڑ کے خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بلکہ وہ ایک شاعر ہے۔ (اگر وہ سچا ہے) تو ہمارے لیے ایسا ہی ایک معجزہ لے آئے



جیسے معجزے پہلے انبیاءؑ کو دے کر بھیجا گیا تھا۔

تفسیر

طرح طرح کے بہانے:

یہ سورہ ـــ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ـــ تمام لوگوں کے لیے ایک سخت تنبیہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے' ایک ہلا دینے والی اور بیدار کن تنبیہ ـــ فرمایا گیا ہے: لوگوں کا حساب ان کے قریب آ پہنچا ہے، حالانکہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور منہ موڑے ہوئے ہیں (اقترب للناس حسابھم وھم فی غفلة معرضون)۔

ان کا عمل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس غفلت اور بے خبری نے ان کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے ورنہ یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ انسان حساب کے نزدیک ہونے پر ایمان رکھتا ہو ـــ وہ بھی انتہائی دقیق حساب ـــ اور پھر وہ تمام مسائل کو معمولی سمجھے اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہو۔

لفظ " اقترب " میں " قرب " کی نسبت کہیں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حساب بہت ہی نزدیک آ گیا ہے۔

" ناس " کی تعبیر اگرچہ ظاہری طور پر عام لوگوں کے لیے آئی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ سب کے سب غفلت میں ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ جب بھی عمومی بات ہوگی تو اس میں استثناء بھی ہوگا۔ اور یہاں ایسے بیدار دل لوگوں کو کہ جو ہمیشہ حساب کی فکر میں رہتے ہیں اور اس کے لیے آمادہ و تیار ہوتے ہیں' اس حکم سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حساب لوگوں کے نزدیک ہو رہا ہے، نہ کہ لوگ حساب کے۔ گویا حساب تیزی کے ساتھ لوگوں کی طرف دوڑ رہا ہے۔

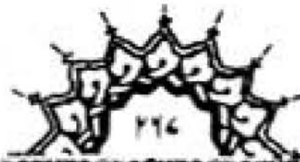
ضمنی طور پر " غفلت " اور " اعراض " کے درمیان فرق ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ وہ حساب کے نزدیک ہونے سے غافل ہیں اور یہ غفلت اس بات کا سبب بنتی ہے، کہ وہ حق کی آیات سے رُوگردانی کریں۔ درحقیقت " حساب سے غفلت " علت ہے اور " آیاتِ حق سے اعراض " اس کا معلول ہے یا اس عظیم عدالت میں جواب دینے کے لیے آمادگی سے اور خود حساب سے اعراض مراد ہے یعنی چونکہ غافل ہیں لہٰذا اپنے آپ کو حساب کے لیے آمادہ نہیں کرتے اور رُوگردانی کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حساب کا نزدیک ہونا اور قیامت کس معنی میں ہے؟

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ باقی ماندہ دنیا گزشتہ کے مقابلہ میں کم ہے۔ تو اس بناء پر قیامت نزدیک ہوگی یعنی گزشتہ کی نسبت نزدیک خاص طور پر جبکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ منقول ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

بعثت انا والساعة کھاتین

میری بعثت اور قیامت ان دونوں (انگلیوں) کی طرح ہے (شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو ایک



دوسرے سے ملی ہوئی ہیں[1]

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ یہ تعبیر قیامت کے (حتمی طور پر واقع) ہونے کی بنا پر ہے۔ جیسا کہ عربوں کی مشہور ضرب المثل میں کہا جاتا ہے کہ:

كل ما هو آت قريب

جو چیز قطعی و یقینی طور پر آ کر رہے گی، وہ قریب ہے۔

اس کے باوجود یہ دونوں تفسیریں آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ لہذا ممکن ہے دونوں نکات کی طرف اشارہ ہو۔

بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں "حساب" "قیامت صغریٰ" یعنی موت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ موت کے وقت بھی کچھ نہ کچھ محاسبہ ہوتا ہے اور انسان کو اس کے اعمال کا کچھ بدلہ دیا جاتا ہے۔[2]

لیکن زیر بحث آیت ظاہراً قیامت کبریٰ کی طرف راجع نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت ان کے اعراض اور رُوگردانیوں کی ایک نشانی کو اس صورت میں بیان کرتی ہے: اُن کے ربّ کی جو بھی کوئی نئی نصیحت اور یاد دہانی ان کے پاس آتی ہے، وہ اُسے کھیل اور مذاق کے مُوڈ میں سنتے ہیں: (ما يأتيهم من ذكر من ربهم محدث الا استمعوه وهم يلعبون)۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی سورہ یا آیت — اور پروردگار کی طرف سے کسی بھی بیدار کرنے والی بات پر سنجیدگی سے سوچیں اور کچھ دیر اس پر غور و فکر کریں اور کم از کم یہ احتمال ہی کر لیں کہ یہ بات ان کی زندگی اور مستقبل پر اثر کرنے والی ہوگی۔ وہ نہ تو خدا کی طرف سے حساب لیے جانے کی فکر کرتے ہیں اور نہ ہی پروردگار کی تنبیہوں کی۔

اصولی طور پر جاہل، متکبر اور خود غرض لوگوں کی ایک بدبختی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خیر خواہی کرنے والوں کی پند و نصائح کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہی بات اس کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ہرگز خواب غفلت سے بیدار نہ ہوں جبکہ ایک مرتبہ بھی وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کر لیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا راستہ اسی لمحے تبدیل ہو جائے۔

زیر غور آیت میں لفظ "ذکر" ہر بیدار کرنے والی بات کی طرف اشارہ ہے اور "محدث" (نیا اور جدید) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانی کتابیں یکے بعد دیگرے نازل ہوتی ہیں اور قرآنی سورتیں اور اس کی آیتیں، ہر ایک تازہ بہ تازہ اور نئے نئے مفاہیم و مضامین لیے ہوئے ہوتی ہیں کہ جو مختلف اثر انگیز طریقوں سے غافلوں کو بیدار کرتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے کیا فائدہ کہ جو ان سب کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

گویا وہ نئی چیزوں سے وحشت رکھتے ہیں۔ وہ انہی قدیم خرافات پر کہ جو انہیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملی ہیں، خوش ہیں، گویا انہوں نے ہمیشہ کے لیے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ ہر نئی حقیقت کی مخالفت کریں گے۔ جبکہ قانون ارتقا کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان کو ہر روز تازہ بہ تازہ اور نئے سے نئے مسائل کا سامنا ہو۔

---

[1] مجمع البیان آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۶، صفحہ ۴۳۱۲۔



پھر مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: وہ ایسی حالت میں ہیں کہ ان کے دل لہو و لعب اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں:

(لاهية قلوبهم)۔

کیونکہ وہ تمام محکم اور سنجیدہ مسائل کو ظاہری لحاظ سے شوخی اور لہو و لعب سمجھتے ہیں (جیسا کہ لفظ "یلعبون" فعل مضارع اور مطلق صورت میں، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے) اور باطنی لحاظ سے غفلت میں ڈالنے والے فضول مسائل کے ساتھ لہو و لعب اور فکری مشغولیت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور یہ امر فطری اور طبیعی ہے کہ ایسے افراد ہرگز راہِ سعادت نہیں پا سکتے۔

اس کے بعد ان کے شیطانی منصوبوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

یہ ظالم سازش پر مبنی اپنی سرگوشیاں چھپاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تم ہی جیسا ایک عام بشر ہے: (واسروا النجوى الذين ظلموا هل هذا الا بشر مثلكم)۔[1]

جبکہ وہ ایک عام بشر سے زیادہ نہیں ہے، تو لازماً اس کے یہ خارق عادت کام اور اس کی بات کی اثر پذیری جادو کے سوا کچھ نہیں" تو کیا تم جادو کے پیچھے جاتے ہو، حالانکہ تم (یہ سب کچھ) دیکھ رہے ہو" (افتأتون السحر وانتم تبصرون)۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت دشمنانِ اسلام بہت طاقتور تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی باتوں کو چھپائیں، یہاں تک کہ اپنی سرگوشیوں کو بھی (اس بات پر توجہ رہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ وہ اپنی سرگوشیاں کو مخفی رکھتے تھے)۔

ممکن ہے یہ اس بنا پر ہو کہ وہ ان مسائل میں کہ جو کسی سازش اور منصوبہ بندی کا پہلو رکھتے تھے، مشورہ کرتے ہوں تاکہ عام لوگوں کے سامنے ایک ہی منصوبہ کے ماتحت پیغمبر اکرمؐ کا مقابلہ کریں۔

علاوہ ازیں وہ قدرت و طاقت کے لحاظ سے تو مسلط آگئے تھے لیکن منطق اور نفوذِ کلام کی قدرت کے لحاظ سے پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ اور یہی برتری اس بات کا سبب بنتی تھی کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے مقابلے کے لیے جعلی باتیں گھڑتے مل بیٹھ کر خفیہ مشورے کرتے تھے۔

بہر حال وہ اپنی اس گفتگو میں دو چیزوں کا سہارا لیتے تھے۔ ایک رسول اللہؐ کا بشر ہونا اور دوسرے ان کی طرف جادو کی نسبت دینا۔ اور بعد کی آیات میں جو اور چیزیں انہوں نے غلط منسوب کیں ان کا ذکر بھی آئے گا۔ قرآن ان کا بھی جواب دیتا ہے۔

* * *

لیکن پہلے قرآن کلی صورت میں رسولِ اکرمؐ کی زبان سے اس طرح جواب دیتا ہے:

میرا پروردگار ہر بات کو جانتا ہے چاہے وہ آسمان میں ہو یا زمین میں (قال ربي يعلم القول في السماء والارض)۔

---

[1] عربی ادب میں معمول ہے کہ اگر فاعل اسم ظاہر ہو تو فعل مفرد لایا جاتا ہے لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض اوقات خاص علل و اسباب کی بنا پر فعل کو جمع کی شکل میں اور فاعل کو اسم ظاہر لاتے ہیں۔ " واسروا النجوى الذين ظلموا " کا جملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔



یہ تصور نہ کرنا کہ تمہاری مخفی باتیں اور پوشیدہ سازشیں اُس پر مخفی ہیں۔ کیونکہ "وہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے" (وھو السمیع العلیم)۔

وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے اور تمام کاموں سے باخبر ہے۔ نہ صرف وہ باتوں کو سُنتا ہے بلکہ وہ ان خیالات و تصورات کو بھی جو ان کے ذہنوں میں گزرتے ہیں اور ان ارادوں کو بھی کہ جو ان کے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں، جانتا ہے۔

❁ ❁ ❁

مخالفین کی بہانہ بازیوں کی دو قسموں کا بیان کرنے کے بعد، ان بہانہ بازیوں کی دوسری چار قسموں کا ذکر شروع کرتے ہوئے قرآن اس طرح کہتا ہے: انہوں نے کہا کہ پیغمبر جو کچھ وحی کے عنوان سے لایا ہے، یہ پریشان خوابوں اور پراگندہ خیالوں کے سوا کچھ بھی نہیں کہ جنہیں وہ حقیقت اور واقعیت سمجھ بیٹھا ہے: (بل قالوا اضغاث احلام)[1]۔

اور کبھی اپنی اس بات کو بدل کر کہتے ہیں کہ: "وہ جھوٹا آدمی ہے اور اس نے خدا سے یہ باتیں جھوٹ منسوب کی ہیں (بل افتراہ)۔

اور کبھی کہتے ہیں کہ: "نہیں وہ تو ایک شاعر ہے" اور یہ باتیں اس کے شاعرانہ تخیلات کا مجموعہ ہیں (بل ھو شاعر)۔

اور آخری مرحلہ میں کہتے ہیں کہ اگر ہم ان تمام باتوں کو چھوڑ دیں پھر بھی اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہے تو ہمارے لیے کوئی معجزہ لے کر آئے جیسا کہ گزشتہ انبیاء معجزات کے ساتھ بھیجے گئے تھے" (فلیأتنا بأیة کما ارسل الاولون)۔

رسول اللہؐ کی طرف ان چیزوں کی نسبت، جو ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں، کا مطالعہ اور تحقیق خود اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ وہ لوگ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد بہانہ جوئی اور حریف کو ہر قیمت اور ہر صورت میں میدان سے باہر نکالنا تھا۔

کبھی جادوگر کہتے، کبھی شاعر، کبھی مفتری اور کبھی (معاذ اللہ) خیالی دنیا میں بسنے والا ایک شخص کہ جو اپنے خواب پریشاں کو وحی کہنے لگا ہے۔

اگر ہمارے پاس ان کی باتوں کو باطل کرنے کے لیے، ان کی اِدھر اُدھر کی ان منتشر باتوں کے علاوہ اور کوئی بھی دلیل نہ ہوتی، تو ان کے باطل ہونے کے لیے یہی کافی تھیں لیکن بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ قرآن دوسرے طریقوں سے بھی انہیں قاطع جواب دیتا ہے۔

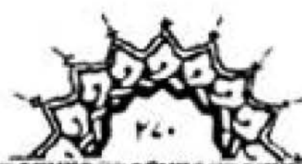
ایک نکتہ:

کیا قرآن حادث ہے؟ بعض مفسرین نے ان آیات کے ذیل میں لفظ "محدث" کی مناسبت سے کہ جو دوسری زیر بحث آیت میں ہے "کلام اللہ" کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں بہت بحث کی ہے۔ یہ وہی مسئلہ ہے کہ

---

[1] "اضغاث": جمع "ضغث" (بروزن "حرص") خشک لکڑیوں یا گھاس وغیرہ کے گٹھے کے معنی میں ہے۔

"احلام" جمع ہے "حلم" کی (بروزن "نہم") خواب اور رؤیا کے معنی میں اور چونکہ لکڑی وغیرہ کے گٹھوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بکھری ہوئی چیزوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھتے ہیں اس لیے اس تعبیر کا خواب پریشاں پر بھی اطلاق ہوا ہے۔



جو خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں سالہا سال تک بحث و تنقید کا موضوع بنا رہا اور جس نے ایک طویل مدت تک بہت سے علما کو اُلجھائے رکھا۔

لیکن ہم موجودہ زمانہ میں اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہ بحث زیادہ تر سیاسی پہلو رکھتی تھی۔ حکمران چاہتے تھے کہ علمائے اسلام کو آپس میں اُلجھائے رکھیں اور اصولی اور بنیادی مسائل کہ جو وضع حکومت اور لوگوں کے طرز زندگی اور اسلام کے اصلی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں سے توجہ ہٹائے رکھیں۔

موجودہ زمانے میں ہمارے لیے یہ بات پورے طور پر واضح ہے کہ اگر "کلام اللہ" سے مراد اس کا معنی و مفہوم ہے، تو وہ قطعی طور پر قدیم ہے یعنی ہمیشہ وہ علم خدا تھا اور خدا کا علم ہمیشہ سے اس پر محیط ہے۔

اور اگر اس سے مراد یہ الفاظ اور یہ کلمات اور یہ وحی ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی، تو وہ بلاشک وشبہ "حادث" ہے۔ کون عاقل یہ کہتا ہے کہ الفاظ و کلمات ازلی ہیں، یا پیغمبر پر وحی کا نزول دور بعثت کے آغاز سے نہیں ہوا؛ لہٰذا آپ ملاحظہ کریں گے کہ ہم بحث کو جس طرف سے بھی لیں مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہے۔

دوسرے الفاظ میں قرآن الفاظ بھی رکھتا ہے اور معانی بھی۔ اس کے الفاظ قطعاً و یقیناً "حادث" ہیں اور اس کے معانی قطعاً یقیناً "قدیم" ہیں۔ لہٰذا کھینچا تانی اور بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور پھر یہ بحث اسلامی معاشرے کی کونسی علمی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مشکل کو حل کرتی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض گزشتہ علمائے نے مکار اور سازشی حکام اور بادشاہوں کی فریب کاریوں سے دھوکا کیوں کھایا۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بعض آئمہ اہل بیتؑ نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے واضح اور عملی طور پر انہیں خبردار کیا ہے کہ وہ اس قسم کی بحثوں سے پرہیز کریں۔[1]

۶۔ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ○

۷۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

۸۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ○

۹۔ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَ

---

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۴۱۲، بحوالہ احتجاج طبرسی



اَهۡلَكۡنَا الۡمُسۡرِفِيۡنَ ○

۱۰۔ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ كِتٰبًا فِيۡهِ ذِكۡرُكُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ○

ترجمہ

۶۔ تمام آبادیاں کہ جنہیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیا (اُنھوں نے بھی طرح طرح کے معجزات کا تقاضا کیا تھا اور ان کے مطالبات کے مطابق معجزات دکھا دیئے گئے تھے لیکن) وہ ہرگز ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے؟

۷۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) مرد ہی بھیجے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے۔ (وہ سب کے سب انسان ہی تھے اور نوعِ بشر میں سے تھے) اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو۔

۸۔ ہم نے انہیں ایسے جسم نہ دیئے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ عمرِ جاوداں رکھتے تھے۔

۹۔ اس کے بعد جو وعدہ ہم نے اُن سے کیا تھا اس کی ہم نے وفا کی، اُنہیں اور جس جس کو ہم چاہتے تھے (ان کے دشمنوں کے چنگل سے) نجات دی اور زیادتی کرنے والے کو ہم نے ہلاک کر دیا۔

۱۰۔ ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جس میں تمہارے لیے نصیحت (اور بیداری) کا وسیلہ موجود ہے۔ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔

تفسیر

تمام پیغمبر نوعِ بشر میں سے تھے:

گزشتہ آیات میں دشمنانِ اسلام کی طرف سے ایسے چھ اعتراضات کا ذکر تھا کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ زیرِ بحث آیات انہیں کا جواب دے رہی ہیں۔ ان میں کبھی کلی صورت میں اور کبھی کسی خاص مسئلے کے اعتبار سے جواب دیا گیا ہے۔

پہلی زیرِ بحث آیت ان کے من پسند معجزات[1] طلب کرنے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اور کہتی ہے: تمام شہر اور آبادیاں کہ جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے، انھوں نے بھی اسی قسم کے معجزات کا تقاضا کیا تھا لیکن جب ان کے مطالبات پورے کر دیئے گئے تو وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے (ما اٰمنت قبلھم من قریۃ اھلکناھا افھم یؤمنون)۔

اس ضمن میں انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ اگر اقتراحی معجزات کے سلسلے میں تمہارے تقاضے کو پورا کر دیا جائے اور پھر بھی تم ایمان نہ لاؤ، تو تمہاری تباہی و نابودی حتمی و یقینی ہو جائے گی۔

---

[1] من پسند کے معجزات کو اصطلاح میں "اقتراحی معجزات" کہتے ہیں۔ ان معجزات کا تقاضا درحقیقت بہانہ سازی کے طور پر تھا۔



آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ قرآن اس آیت میں ان کے تمام ایسے اعتراضات کی طرف کہ جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں، اشارہ کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ سچے پیغمبروں کی دعوت کے سلسلے میں اس طرح کی تکرار کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہٹ دھرم اور ضدی افراد ہمیشہ ہی اسی قسم کے بہانوں کو وسیلہ بنایا کرتے تھے اور آخرکار ان کا انجام بھی سوائے کفر کے اور اس کے بعد ان کی ہلاکت اور دردناک عذاب الٰہی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت ان کے سب سے پہلے اعتراض کا خصوصیت سے جواب دے رہی ہے، یہ اعتراض پیغمبر کے بشر ہونے کے سلسلے میں تھا۔ آیت کہتی ہے تو ہی نہیں کہ جو پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہے بلکہ تمام کے تمام پیغمبر جو تجھ سے پہلے آئے ہیں وہ سب کے سب مرد ہی تو تھے کہ جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے (وما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحی الیہم)۔

یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ جسے سب لوگ جانتے ہیں اور اس سے آگاہ ہیں" اور اگر تم نہیں جانتے، تو جو آگاہ ہیں اُن سے پوچھ لو" (فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون)۔

❖ ❖ ❖

اہل ذکر کون ہیں؟

اس میں شک نہیں کہ "اهل ذکر" لغوی مفہوم کے لحاظ سے تمام آگاہ اور باخبر افراد کے لیے بولا جاتا ہے اور زیرِ نظر آیت "جاہل کے عالم کی طرف رجوع کرنے" کے ایک کلی عقلی قانون کو بیان کر رہی ہے اگرچہ موقع کے لحاظ سے آیت کا مصداق علماء اہل کتاب ہی تھے، لیکن یہ بات قانون کی کلیت میں مانع نہیں ہے۔

اسی بناء پر علماء اور فقہائے اسلام نے اس آیت سے "مجتہدین اسلام کی تقلید کرنے کے جواز کے" مسئلہ میں استدلال کیا ہے۔

اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُن روایات میں، کہ جو اہل بیتؑ کی طرف سے ہم تک پہنچی ہیں اہل ذکر کی علی علیہ السلام یا تمام آئمہ اہلبیتؑ سے تفسیر کی گئی ہے تو یہ منحصر ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ اس قانون کلی کے واضح ترین مصادیق کا بیان ہے۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے سورۂ نحل کی آیہ ۴۳ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت انبیاء کے بشر ہونے کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے: ہم نے پیغمبروں کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ ہرگز عمر جاوداں بھی نہیں رکھتے تھے۔ (وما جعلناهم جسدا لا يأكلون الطعام و ما كانوا خالدين)۔

"لا يأكلون الطعام" کا جملہ اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو قرآن میں دوسرے مقام پر اسی اعتراض کے سلسلے میں آئی ہے:

"وقالوا مال هذا الرسول يأكل الطعام ويمشي في الاسواق"

۳۶۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ

ترجمہ

۳۶ اور خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ سے نیکی کرو۔ (اسی طرح) رشتہ داروں، یتیموں مسکینوں، نزدیکی اور دور کے پڑوسیوں، ساتھیوں اور خرچ نہ رکھنے والے مسافروں کے ساتھ اور ان غلاموں سے جن کے تم مالک ہو نیکی کرو۔ کیونکہ خداوند عالم اس شخص کو جو متکبر اور گھمنڈ کرنے والا ہو (اور دوسروں کا حق ادا نہ کرے) دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر

خداوند عالم مندرجہ بالا آیت میں حقوق اسلامی کے ایک اور سلسلے کو بیان کرتا ہے ان میں خدا کے حقوق، بندوں کے حقوق یا لوگوں سے معاشرت کے آداب شامل ہیں۔ مجموعی طور پر اس آیت سے دس احکامات اور قاعدوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا

قرآن سب سے پہلے لوگوں کو خدا کی عبادت کرنے اور شرک و بت پرستی ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جو تمام اسلامی احکامات کی جڑ ہے۔ توحید باری کی دعوت روح کو پاک نیت کو خالص، ارادہ کو قوی اور ہر مفید منصوبہ انجام دینے کا ارادہ مضبوط کرتی ہے۔ چونکہ یہ آیت اسلامی حقوق کا ایک سلسلہ بیان کر رہی ہے تو سب سے پہلے لوگوں پر اللہ تعالےٰ کا حق ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے تاکید کرتی ہے کہ خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

۲۔ وبالوالدین احسانا

اس کے بعد ماں باپ کے حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نصیحت کرتی ہے کہ ان کے ساتھ نیکی کرو۔ ماں باپ کا حق ایسے مسائل میں سے ہے جن کا قرآن میں اکثر ذکر کیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی امر ایسا ہو جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہو۔ یہ بات قرآن میں چار مقامات پر توحید کے ذکر کے فوراً بعد آئی ہے[1]

۱؎ بقرہ ۸۳، انعام ۱۵۱، اسرا ۲۳ اور زیر نظر آیت۔



اس بار بار کے تذکرہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ اور واسطہ ہے درحقیقت ایسا ہی ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی نعمت تو زندگی کی نعمت ہے جو اللہ کی طرف سے پہلے درجہ میں ہے اور بعد کی منازل میں ماں باپ سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اولاد ماں باپ کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ اسی لیے ماں باپ کے حقوق کو چھوڑ دینا خداوند عالم کے شرک کے برابر ہے۔ ماں باپ کے حقوق کے بارے میں مفصل بحث ہے جو انشاء اللہ تعالےٰ سورۂ اسراء اور سورۂ لقمان کی متعلقہ آیات کے ذیل میں آئے گی۔

۳۔ وبذی القربیٰ

اس کے بعد تمام رشتہ داروں سے نیکی کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ بھی ایسے مسائل میں سے ہے جن کے متعلق بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ کبھی صلۂ رحم کے عنوان سے اور کبھی ان سے نیکی اور احسان کے ذیل میں۔ حقیقت میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ نوع انسانی کے وسیع رشتے میں کچھ زیادہ مضبوط رشتے استوار کرے یہ رشتے چھوٹی چھوٹی اکائیوں اور زیادہ ترہم شکل اکائیوں میں موجود ہیں جنہیں عرف عام میں کنبہ اور خاندان کہتے ہیں یہ اس لیے ہے تاکہ مشکلات اور حادثات میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنے حقوق کی حفاظت کریں۔

۴۔ والیتامیٰ

اس کے بعد اہلِ ایمان کو یتیموں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کے حق میں نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے کیونکہ ہر معاشرے میں طرح طرح کے حادثات کے نتیجے میں کچھ بچے یتیم ہوتے رہتے ہیں۔ جنہیں نظر انداز کر دینا صرف انہیں خطرے میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ معاشرے کو بھی خطرے سے دوچار کرنا ہے کیونکہ اگر یتیم بچوں کی سرپرستی نہ کی جائے اور ان سے خاطر خواہ ہمدردی اور محبت کا سلوک نہ کیا جائے تو وہ بے ہودہ، خطرناک اور جرائم کو بن سکتے ہیں۔ بنا بریں یتیموں کے ساتھ نیکی معاشرے کے اپنے حق میں ہے۔

۵۔ والمساکین

اس کے بعد ضرورت مندوں کے حقوق کی یاددہانی کروائی گئی ہے۔ کیونکہ ایک صحت مند عادلانہ معاشرہ میں بھی لاچار اور محتاج لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں نظر انداز کر دینا تمام انسانی اصولوں کے خلاف ہے اور اگر اجتماعی اصولِ عدالت سے انحراف کی وجہ سے صحیح سالم لوگ فقر و فاقہ اور محرومیت میں مبتلا ہو جائیں، پھر بھی ایسے معاشرے کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

۶۔ والجار ذی القربیٰ

اس کے بعد نزدیک کے ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے۔ اس کے متعلق کہ نزدیک کے ہمسائے کون ہیں مفسرین نے مختلف احتمالات پیش کیے ہیں۔ بعض نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ جو ہمسائے رشتہ دار بھی ہوں۔ لیکن یہ تفسیر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ آیت میں رشتہ داروں کے حقوق کی طرف الگ سے اشارہ ہو چکا ہے، بعید دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ مراد وہی مکان کی نزدیکی ہے۔ کیونکہ جو ہمسائے زیادہ قریب ہیں ان کے حقوق اور احترام زیادہ ہے یا وہ ہمسائے مراد ہیں جو دین و مذہب کے لحاظ سے زیادہ قریب ہوں۔

۷۔ والجار الجنب



اس کے بعد دور کے پڑوسیوں کی سفارش کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں اس سے مکان کی دوری مراد ہے کیونکہ کئی ایک روایتوں کے مطابق چاروں طرف کے چالیس گھر پڑوسی گنے اور سمجھے جاتے ہیں[1] اس طرح تمام شہر چھوٹے چھوٹے شہروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ایک شخص کے گھر کو دائرے کا ایسا مرکز فرض کریں جس کا نصف قطر ہر طرف سے چالیس گھروں پر محیط ہو تو ایسے دائرے کی پیمائش ایک معمولی سے حساب سے واضح ہو جاتی ہے تقریباً پانچ ہزار مکانات اس حصے میں آئیں گے، یہ ظاہر ہے اور تسلیم شدہ ہے کہ ایک چھوٹے شہر میں اس سے زیادہ گھر نہیں ہوتے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآنی میں نزدیک کے ہمسایوں کے ذکر کے علاوہ دور کے ہمسایوں کے حق کی بھی تشریح اور وضاحت کی گئی ہے کیونکہ لفظ ہمسایہ کا ایک تو محدود مفہوم ہے جو صرف نزدیک کے پڑوسیوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اب اسلامی نظریہ کے مطابق اس مفہوم کو پھیلانے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ دور کے ہمسایوں کا نام بھی صراحت کے ساتھ لیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دور کے ہمسایوں سے مراد غیر مسلم ہوں۔ کیونکہ ہمسائیگی اسلام میں مسلمان پڑوسیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس مفہوم میں غیر مسلم بھی شامل ہیں مگر وہ جو مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں وہی اس میں آتے ہیں۔

اسلام میں حق ہمسائیگی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیؑ کی مشہور وصیتوں میں ہے:

ما زال رسول اللّٰہ یوصی بھم حتی ظننا انہ سیورثھم؛

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں اس قدر سفارش فرمائی کہ ہمیں یہ گمان ہونے لگا کہ شاید آپ یہ حکم فرمائیں کہ ہمسائے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

یہ حدیث اہل سنت کی مشہور کتب میں بھی ہے چنانچہ تفسیر المنار اور تفسیر قرطبی میں بخاری سے یہی مضمون نقل کیا گیا ہے۔[2]

ایک دوسری حدیث میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے ایک دن تین مرتبہ فرمایا:

واللّٰہ لا یؤمن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایسا شخص ایماندار نہیں ہے۔

کسی نے پوچھا کونسا شخص تو حضورؐ نے فرمایا:

الذی لا یأمن جارہ بوائقہ

جس کا ہمسایہ اس سے تکلیف میں ہو[2]

ایک اور حدیث میں حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلیحسن الی جارہ۔

جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کے ساتھ نیکی کرے[3]

---

[1] نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۴۸۰۔

[2] تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۱۷۵۴۔

[3] المنار جلد پنجم صفحہ ۹۲ طبع بیروت۔



اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

حسن الجوار یعمر الدیار ویزید فی الاعمار۔

ہمسائیوں کا ایک دوسرے سے نیکی کرنا گھروں کو آباد کرتا ہے اور عمریں بڑھاتا ہے۔[1]

اس سائنسی اور مشینی دور میں پڑوسی ایک دوسرے کے عام حالات بھی نہیں جانتے بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو ہمسائے ایک دوسرے کے ساتھ بیس بیس سال رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا نام بھی نہیں جانتے۔ یہ عظیم اسلامی حکم ایک خاص روشنی کا حامل ہے۔ اسلام انسانی معاشرے میں بہت زیادہ تعاون اور ہمدردی کا قائل ہے جبکہ مادی ترقی کے اس دور میں ہمدردی اور تعاون کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے اور بے اعتنائی و بے رحمی بڑھتی جا رہی ہے۔

۸۔ والصاحب بالجنب

اس کے بعد ان لوگوں کو جو انصاف کا دم بھرتے ہیں، وصیت کرتا ہے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ صاحب بالجنب کے معنی دوست اور رفیق سے زیادہ وسیع ہیں اور حقیقت میں یہ ہر اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی طرح ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو چاہے پرانا دوست ہو یا تھوڑی دیر کا رفیق مثلاً وہ شخص جو سفر کرتے ہوئے انسان کا دوست بن جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ "صاحب با لجنب" سے مراد رفیق سفر (الرفیق فی السفر) ہے یا وہ شخص ہے جو نفع کی امید میں کسی کے ساتھ ہو (المنقطع الیک یرجو نفعک) اس سے مراد ان کی تخصیص نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور ایسے تمام لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ بنا بریں یہ آیت ایک جامع اور کلی حکم کی حامل ہے اور یہ ایسے سب افراد سے حسن سلوک کرنے کے لیے ہے جن سے انسان کا سابقہ پڑتا ہے۔ چاہے وہ سچ مچ دوست ہوں رفیق کار ہوں ہم سفر ہوں، اس کے پاس آنے جانے والے ہوں، شاگرد ہوں، مشورہ لینے والے ہوں یا خدمت گزار ہوں۔ کچھ روایات میں صاحب بالجنب کی تفسیر بیوی سے کی گئی ہے چنانچہ المنار، روح المعانی اور قرطبی کے مؤلفین آیت کے ذیل میں حضرت علیؑ سے یہی معنی نقل کرتے ہیں لیکن کچھ بعید نہیں ہے کہ اس کا مقصد آیت کے ایک مصداق کا تذکرہ ہو۔

۹۔ وابن السبیل

یہاں ایک اور گروہ کے بارے میں سفارش کی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو باوجودیکہ اپنے وطن اور شہر میں صاحب حیثیت اور کھاتے پیتے ہوں لیکن عالم سفر میں، اجنبی شہر میں کسی وجہ سے محتاج ہو جائیں اور "ابن سبیل" کی عمدہ تفسیر (راستے کا بیٹا) بھی اسی وجہ سے ہے کہ ہم ان سے کسی قسم کی جان پہچان نہیں رکھتے کہ انہیں کسی قبیلے، کنبے یا شخص سے نسبت دے سکیں صرف اس حکم کی بنا پر کہ وہ حاجت مند مسافر ہیں انہیں مدد کا مستحق قرار دیں۔

۱۰۔ وما ملکت ایمانکم

آخری مرحلے میں غلاموں سے نیکی کرنے کی وصیت کی گئی ہے اور حقیقت میں آیت خدا کے حق سے شروع ہوتی ہے اور

---

[1] تفسیر صافی صفحہ ۱۲۰



غلاموں کے حقوق پر ختم ہوتی ہے کیونکہ یہ حقوق ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ صرف یہی آیت نہیں ہے جس میں غلاموں کے متعلق وصیت کی گئی ہے بلکہ دوسری آیتوں میں بھی اس سلسلے میں بحث کی گئی ہے۔ اسلام نے ضمنی طور پر غلاموں کی تدریجی آزادی کے لیے ایک اچھا پروگرام مرتب کیا ہے جو ان کی مطلق آزادی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ ہم اس سلسلے میں متعلقہ آیتوں کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

ان اللّٰه لا یحب من کان مختالا فخورًا

خداوند عالم آیت کے آخر میں اس جملے کے ساتھ "خدا تکبر کرنے والے اور گھمنڈ کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا" خبردار کر رہا ہے کہ جو شخص خدا کے حکم سے روگردانی کرے اور تکبر کی وجہ سے رشتہ داروں، ماں باپ، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور دوستوں کے حقوق کا خیال نہ رکھے۔ وہ محبوب خدا اور بندۂ خدا نہیں ہو سکتا اور جو لطف و کرم الٰہی کا مستحق نہ ہو وہ ہر خیر و برکت خوش قسمتی اور نیکی سے محروم ہے۔ اس معنی کی گواہی وہ روایت دیتی ہے جو اس آیت کے ذیل میں بیان کی گئی ہے جو یہ ہے:

> ایک صحابی رسولؐ کہتے ہیں میں نے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے اسی آیت کی تلاوت کی تو حضورؐ نے تکبر کی برائیاں اور اس کے نتائج اتنے بیان فرمائے کہ میں رونے لگا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: کیوں رو رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: میں پسند کرتا ہوں کہ میرا لباس عمدہ اور خوبصورت ہو تو اب مجھے ڈر ہے کہ اس عمل کی وجہ سے میں تکبر کرنے والوں کی صف میں شامل نہ ہو جاؤں۔ فرمایا: نہیں تو اہلِ جنت میں سے ہے اور یہ تکبر کی علامت نہیں ہے، تکبر یہ ہے کہ انسان حق کے مقابلے میں عاجزی اور انکساری سے کام نہ لے، اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے بلند تر سمجھے اور ان کی تحقیر کرے (اور ان کے حقوق کی ادائیگی سے روگردانی کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کے آخری جملے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرک اور لوگوں کے حقوق کی پامالی غرور و تکبر کا سرچشمہ ہیں۔ مندرجہ بالا حقوق اور خصوصاً غلاموں، یتیموں اور محتاجوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے انتہائی تواضع اور عاجزی کی ضرورت ہے۔

۳۷۔ ۨالَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ

لے یاد رکھیے کہ مختال مادۂ خیال سے اس معنی میں ہے کہ کوئی شخص بعض خیالات کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھے۔ گھوڑے کو اس وجہ سے "خیل" کہا جاتا ہے کہ وہ دوڑتے ہوئے متکبروں کی طرح قدم اٹھاتا ہے اور "فخور" "فخر" کے مادے سے اس شخص کے معنی میں ہے جو فخر اور گھمنڈ کرتا ہو۔ اسی بنا پر یہاں ان دونوں لفظوں میں یہ فرق ہے کہ ایک کے معنی ایسے متکبر کے ہیں جن میں ذہن گھمنڈ سے بھرا ہوا ہو اور دوسرے کے معنی خارجی متکبر کے ہیں یعنی اعمال و کردار سے تکبر ٹپکتا ہو۔



۳۸۔ وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ○

۳۹۔ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللهُ ۭ وَكَانَ اللهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ○

ترجمہ

۳۷ وہ ایسے لوگ ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو بھی بخل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور جو کچھ خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے انہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں (حقیقت میں ان کے اس عمل کا سرچشمہ کفر ہے) اور ہم نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۳۸ وہ ایسے لوگ ہیں۔ جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ شیطان ان کا دوست اور ساتھی ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو اس نے بُرا ساتھی چنا ہوا ہے۔

۳۹ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے اور خداوند عالم نے جو روزی انہیں عطا فرمائی ہے (اس میں سے اس کی راہ میں) خرچ کرتے اور خدا تعالیٰ ان سے آگاہ ہے (اور انہیں پوری سزا دے گا)۔

تفسیر

دکھلاوا اور رضائے الٰہی

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیتوں کا ضمیمہ ہے جو متکبر اور بندۂ ہوا و ہوس افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ ایسے گئے گزرے لوگ ہیں جو نہ صرف لوگوں سے نیکی میں بخل کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بخل پر ابھاتے ہیں (الذین یبخلون ویأمرون الناس بالبخل)۔ علاوہ ازیں وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے جو کچھ انہیں مرحمت فرمایا ہے اُسے چھپا کر رکھیں (ویکتمون ما اٰتاھم اللہ من فضلہ) اس کے بعد ان کے انجام اور نتیجہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ ہم نے کافروں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے (واعتدنا للکٰفرین عذابًا مھینًا)۔



شاید اس تعبیر کا راز یہ ہو کہ بخل کا سرچشمہ زیادہ تر کفر ہی ہوتا ہے کیونکہ بخیل لوگ حقیقت میں خداوند عالم کی لامحدود نعمتوں اور اس کے نیک لوگوں سے کیے ہوئے وعدوں پر ایمان کامل نہیں رکھتے اور وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ دوسروں کی مدد کریں گے تو فقیر بن جائیں گے اور یہ جو فرمایا ہے کہ ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے، تو یہ اس لیے ہے تاکہ وہ تکبر اور گھمنڈ کی سزا کو اپنے کیے کا سبب سمجھیں۔

ضمنی طور پر سوچنا چاہیے کہ بخل صرف مالی امور تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ خداوند عالم کی ہر قسم کی نعمت کو روکنے کے معنی بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مالی لحاظ سے بخل نہیں کرتے لیکن علم و دانش اور اسی قسم کے دوسرے مسائل میں بخیل ہیں۔ دوسری آیت میں من مانی کرنے والے متکبروں کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

والذین ینفقون اموالھم رئاء الناس ولا یؤمنون باللہ و لا بالیوم الاخر۔۔۔۔۔۔

وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر خرچ کرتے بھی ہیں تو لوگوں کو دکھانے اور شہرت کے لیے اور ان کا مقصد خدمت خلق اور رضائے خالق نہیں ہے۔ اسی لیے تو خرچ کے وقت لینے والے کے مستحق ہونے کی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح خرچ کریں جس سے خود انہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے اور وہ اپنی حیثیت کو ثابت کرسکیں۔ کیونکہ وہ خدا تعالےٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اس لیے ان کی سخاوت میں روحانی جذبہ نہیں ہے بلکہ ان کا جذبہ نام و نمود اور جھوٹا وقار ہے جو تکبر اور خود غرضی کی نشانیوں میں سے ہے۔

ومن یکن الشیطان لہ قریناً فساء قریناً۔

انہوں نے شیطان کو اپنا ساتھی بنایا ہے اور جو ایسا کرے اس نے اپنے لیے بہت برا ساتھی چنا ہے اور اس کی تقدیر اس سے بہتر نہیں ہوگی کیونکہ ان کی منطق اور پروگرام شیطان کی منطق اور پروگرام ہی جیسے ہے وہی ہے جو ان سے کہتا ہے کہ خلوص کے ساتھ خرچ کرنا فقر و فاقہ کا سبب ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

الشیطان یعدکم الفقر (بقرہ - ۲۶۸)

اب اس وجہ سے یا تو وہ خرچ ہی نہیں کرتے اور بخل سے کام لیتے ہیں (جیسا کہ گذشتہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے) اور یا اگر خرچ کریں تو ایسی جگہوں پر کرتے ہیں جہاں سے انہیں ذاتی فائدہ پہنچے (جیسا کہ اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے) اس آیت سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک برا ساتھی انسان کی تقدیر کو تباہ و برباد کرسکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اُسے پستی کے آخری درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ تکبر کرنے والوں کا شیطان سے مستقل تعلق ہے نہ کہ وقتی۔ کیونکہ انہوں نے شیطان کو دوست اور ساتھی بنا رکھا ہے۔

وماذا علیھم لو اٰمنوا باللہ والیوم الاٰخر و انفقوا مما رزقھم اللہ۔۔۔۔۔

یہاں اس گروہ کی حالت پر اظہار افسوس کے طور پر فرماتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اس بے راہروی سے باز آجاتے اور خدا اور روز جزا پر ایمان لے آتے اور ان نعمتوں میں سے جو خدا تعالےٰ نے ان کے اختیار میں دی ہیں نیک نیتی کے ساتھ اس کے



بندوں کو دیتے اور اس طرح اپنے لیے دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرتے ۔ اب وہ کیوں اپنے طریق کار پر نظر ثانی نہیں کرتے باوجود اس کے کہ یہ راستہ زیادہ صاف، روشن تر اور مفید ترین ہے اور جو راستہ انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ سوائے نقصان اور بدبختی کے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتا ۔

وکان اللّٰہ بھم علیما

ہر حالت میں خداوند عالم ان کی نیتوں اور اعمال سے باخبر ہے اور اس کے مطابق انہیں جزا یا سزا دیتا ہے ۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ گذشتہ آیت جس میں ریاکارانہ مصارف کے متعلق گفتگو تھی وہاں مال کی نسبت خرچ کرنے والوں کی طرف دی گئی تھی اس آیت میں مما رزقھم اللّٰہ کی نسبت ہے ۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر کا فرق تین نکات کی طرف اشارہ کر رہا ہو:

پہلا یہ کہ دکھلاوے کے اخراجات میں مال کے حلال و حرام ہونے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ۔ حالانکہ جو مال خدا تعالےٰ کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے اس کا حلال ہونا اور "مما رزقھم اللّٰہ" کا مصداق ہونا ضروری ہے ۔

دوسرا یہ کہ جو کچھ دکھلاوے کے لیے خرچ ہوتا ہے وہاں خرچ کرنے والے افراد چونکہ مال کا تعلق اپنی ذات سے سمجھتے ہیں تو وہ تکبر کرنے اور احسان جتانے سے گریز نہیں کرتے حالانکہ جو مال خدا کے لیے خرچ ہو وہاں چونکہ توجہ اس بات کی طرف ہوتی ہے کہ یہ مال خدا نے انہیں دیا ہے ۔ اب اگر اس کا کچھ حصہ اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو احسان جتانے کا مقام نہیں ۔ اس لیے ہر قسم کے تکبر اور احسان سے پرہیز کرتے ہیں ۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ دکھلاوے کے خرچ کا تعلق زیادہ تر مال سے ہوتا ہے ۔ کیونکہ ایسے لوگ روحانی اور معنوی سرمایہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں پھر اس میں سے خرچ کیسے کریں ۔ لیکن جو خدا تعالےٰ کے لیے خرچ کیا جاتا ہے اس کا دامن وسیع ہے ۔ وہ تمام مادی، روحانی اور باطنی نعمات کو چاہے ان کا تعلق مال، علم، اجتماعی وجاہت اور حیثیت ہی سے کیوں نہ ہو محیط ہے ۔

۴۰۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِن لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ○

ترجمہ

۴۰۔ خداوند عالم کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر نیک کام ہو تو اُسے کئی گنا کر دیتا ہے (اور اس کے بدلے) اجر عظیم دیتا ہے ۔

تفسیر

"ذرّہ" کیا چیز ہے

ذرّہ اصل میں بہت ہی چھوٹی چیونٹی کو کہتے ہیں جو بڑی مشکل سے دکھائی دیتی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں غبار



کے بہت چھوٹے چھوٹے اجزا (کے معنی میں ہے) جو فضا میں معلق ہیں اور تاریک جگہوں کے اندر سورج کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے سوراخوں اور روشن دانوں سے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنا ہاتھ مٹی یا اسی قسم کی چیز پر رکھ دے اور پھر اپنے ہاتھ پر پھونک مارے تو جو مٹی کے اجزا فضا میں بکھر جائیں گے ان میں سے ہر ایک کو ذرہ کہتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ہر چھوٹی چیز کو ذرہ کہنے لگے اور آجکل ایٹم کو بھی جو جسم کا کم سے کم جزو ہے ذرہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر گذشتہ زمانے میں انہیں ہَبا کے ذرے کہتے تھے تو اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ وہ جسم کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے اجزا سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آج کی دنیا میں ثابت ہو چکا ہے کہ ایک "جسم مرکب" کے چھوٹے سے چھوٹے اجزا سالمے (MOLECULES) اور جسم بسیط کے سب سے چھوٹے اجزا ایٹم (ATOMS) ہیں۔ جو سالموں سے بہت ہی چھوٹے ہیں علمی اصطلاح میں ایٹم اسے کہتے ہیں جو نہ صرف آنکھوں سے نہ دیکھا جا سکتا ہو بلکہ قوی ترین برقی مائیکروسکوپ سے بھی قابل دید نہیں ہے یہ صرف علمی فارمولوں اور مخصوص فوٹوگرافیوں کے ذریعے دیکھے جاتے ہیں جو بہت ہی چھوٹی چیزوں کو دیکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

مثقال کے معنی وزن اور بھاری پن کے ہیں۔ تو "مثقال ذرہ" سے مراد جسم کا ایک چھوٹے سے چھوٹا مسلم اور محسوس ذرہ ہے اور بوجھ کے معنی میں ہے آیت مندرجہ بالا کہتی ہے کہ خدا ذرہ بھر وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور نہ صرف یہ کہ ظلم نہیں کرتا بلکہ اگر نیک کام انجام پائے تو اُسے کئی گنا کر دیتا ہے۔ اور اپنی طرف سے اس کے بدلے میں اجر عظیم بھی دیتا ہے۔ یہ آیت حقیقت میں بے ایمان اور بخیل افراد سے جن کی حالت گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے کہتی ہے کہ یہ سزائیں جو تمہیں مل رہی ہیں یہ تو تمہارے اعمال کا نتیجہ ہیں لیکن خدا کی طرف سے تم پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا اور اس کے برعکس اگر تم بخل و کفر کی بجائے خدا کی راہ اختیار کر لیتے تو کئی گنا اجر عظیم کے مستحق قرار پاتے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "ضعف" "یا مضاعف" کے معنی لغت عرب میں اس چیز کے ہیں جس کے برابر یا اس سے چند گنا بڑھایا جائے۔ اس لیے زیر نظر آیت اور دوسری آیتوں میں جو یہ ہے کہ خدا کے راستے میں خرچ کرنے والوں کی جزا کبھی دس گنی ہوتی ہے کبھی سات سو گنی یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ ہر صورت میں بندوں پر خدا کا لطف و کرم ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ان کے گناہوں کی سزا گناہوں کی مقدار سے زیادہ نہیں دیتا لیکن ان کی نیکیوں کی جزا نیکیوں کی مقدار سے کئی گنا زیادہ دیتا ہے۔

باقی رہی اس بات کی دلیل کہ خدا ظلم کیوں نہیں کرتا تو وہ واضح ہے کیونکہ ظلم و ستم یا تو جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے یا ضرورت نفسانی کمزوریوں اور نقائص کے سبب سے اب جو ذات تمام چیزوں اور سب لوگوں کے متعلق علم رکھتی ہے اور سب سے بے نیاز ہے اور کسی قسم کی کمی اور نقص اس کی ذات اقدس میں نہیں ہے، اس کے لیے ظلم کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ظلم نہیں کر سکتا اور نہ یہ کہ اس کے بارے میں ظلم و ستم کا تصور نہیں کیا جا سکتا (جیسا کہ گروہ اشاعرہ کا خیال ہے)، بلکہ وہ باوجود قدرت کے، علیم و حکیم ہونے کی بنا پر ظلم نہیں کرتا، ہر چیز کو اس وسیع و عریض دنیا میں اپنی جگہ برقرار رکھتا ہے اور ہر شخص کے ساتھ اس کی لیاقت اور اس کے اعمال و کردار کے مطابق سلوک کرتا ہے۔

۴۱۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ



شَہِیۡدًا ۝

۴۲۔ یَوۡمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰی بِہِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَلَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا ۝

ترجمہ

۴۱۔ اس دن ان کی کیا حالت ہوگی ۔ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ ان کے اعمال پر لائیں گے اور تجھے ان کا گواہ بنا کر لائیں گے ۔

۴۲۔ اس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اور پیغمبر کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے یہ تمنا کریں گے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ (وہ مٹی ہوتے اور) ان کی خاک زمین کی سطح سے مل ہوتی (اور وہ بالکل محو اور خاموش ہو جاتے اور اس دن (سب گواہوں کے ہوتے ہوئے) خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے ۔

تفسیر

فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید

گذشتہ آیتوں کے بعد جو بُروں اور نیکوں کی سزا و جزا کے بارے میں تھیں یہ آیات روزِ قیامت کے گواہوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں پہلی آیت میں ہے: اس دن ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جب ہم ہر امت کے لیے ان کے اعمال کا گواہ لے آئیں گے اور تمہیں ان کا گواہ مقرر کریں گے ۔ اسی طرح جسم انسانی کے اعضاء کی گواہی، اس زمین کی گواہی جس پر وہ رہتے تھے اور اس کے اعمال پر خدا کے فرشتوں کی گواہی کے علاوہ ہر پیغمبر بھی اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوگا ۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو سب سے آخری اور سب سے عظیم پیغمبرِ خدا ہیں اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہوں گے ۔ بُرے لوگ ان سب گواہوں کے ہوتے ہوئے کس طرح حقیقت کا انکار کر سکیں گے اور کیسے اپنے تئیں اپنے اعمال کی سزا سے بچا سکیں گے ۔ اسی قسم کا مضمون کلام مجید کی چند دوسری آیتوں میں بھی ہے مثلاً بقرہ ۱۴۳، نحل ۸۹ اور حج ۷۸ ۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی امت کے اعمال کے متعلق پیغمبروں کی گواہی کس قسم کی ہوگی ۔ اگر لفظ ھؤلاء کا اشارہ مسلمانوں کی طرف ہو جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں تحریر ہے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا ۔ چونکہ ہر نبی جب تک اپنی امت کے درمیان رہے تو ان کے اعمال دیکھتا ہے اور اس کے بعد اس کے معصوم جانشین ان کے اعمال پر گواہ و ناظر ہوتے ہیں ۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ قیامت کے دن خداوند عالم کے سوال کے جواب



میں عرض کریں گے :

ماقلت لهم الا ما امرتني به ان اعبدوا الله ربي وربكم وكنت عليهم شهيدا ما دمت فيهم فلما توفيتني كنت انت الرقيب عليهم وانت على كل شيء شهيد - (المائده : ۱۱۷)

اے پالنے والے! تو نے مجھے جو حکم دیا ہے میں نے انہیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا میں نے ان سے کہا کہ اس خدا کی جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے عبادت کرو اور جب تک میں ان کے درمیان تھا ان کے اعمال کا گواہ تھا لیکن جب سے تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھالیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ لفظ "ھؤلاء" گذشتہ امتوں کے گواہوں کی طرف اشارہ ہے یعنی اے رسول (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) ہم تجھے تمام گواہوں اور گذشتہ انبیاء پر گواہ قرار دیں گے اور کئی ایک روایات میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے[1]

اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہر پیغمبر حیات و وفات ہر صورت میں باطنی اور روحانی مشاہدے کے ذریعے اپنی تمام امت کے حالات کا شاہد ہوگا اور حضورؐ کی روح اقدس بھی اسی طریقہ سے تمام گذشتہ امتوں اور اپنی امت کے حالات کو دیکھنے والی اور ان کے اعمال پر گواہ ہے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے امت کے صلحاء اور پرہیزگاری میں اعلیٰ مقام کے حامل افراد بھی اس قسم کی استعداد رکھتے ہوں۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت پیغمبر اسلام کی روح اقدس خلقتِ حضرت آدمؑ سے پہلے موجود تھی کیونکہ شہود کے معنی آگاہی اور موجود ہونے کے ہیں لیکن یہ تفسیر اس آیت کے ساتھ جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں نقل کی گئی ہے کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ وہ اپنی امت پر تاحیات گواہ تھے (غور فرمائیے گا)[2]

اگر شہادت کو عملی شہادت کے معنی میں لیں یعنی نمونہ کے ایک فرد کے اعمال جو باقی لوگوں کے اعمال جانچنے کی میزان اور پیمانہ ہیں تو اس صورت میں مندرجہ بالا تفسیر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ یعنی ہر پیغمبر اپنی مخصوص صفتوں کی بنا پر اپنی امت کے اعمال کی جانچ کے لیے میزان و مقیاس ہے اور امت کے اچھے برے لوگوں کو ان کے ساتھ مشابہت رکھنے یا نہ رکھنے سے پہچانا جاسکتا ہے اور چونکہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خدا کے نبیوں میں سے بزرگ ترین ہستی ہیں اس لیے حضورؐ کے اعمال و صفات تمام نبیوں کے درجات جانچنے کے لیے معیار ہوں گے۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا شہادت اسی معنی میں آئی ہے کہ نہیں لیکن اس طرف توجہ کرنے سے کہ نمونے کے انسانوں کے افکار و اعمال بھی عملی طور پر گواہی دیتے ہیں کہ ایک انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس حد تک روحانی اور باطنی درجات حاصل کرے تو یہ معنی بعید دکھائی نہیں دیتے۔ (غور فرمائیے گا)۔

يومئذ يود الذين كفروا وعصوا الرسول .....

---

[1] تفسیر نور الثقلین، تفسیر برہان آیۂ مذکورہ کے ذیل میں۔

[2] اس آیت سے حضرت عیسٰیؑ کا کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک الگ مفہوم رکھتی ہے۔ (مترجم)



جس وقت کافر اور خداوند عالم کے بھیجے ہوئے نبیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے والے لوگ اس عدالت الٰہی میں ناقابل انکار شہود اور گواہ دیکھیں گے تو وہ اپنے کیے پر اتنے پشیمان ہوں گے کہ وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ خاک ہوتے اور زمین کی مٹی کے برابر ہو جاتے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: لو تسوی بھم الارض۔ سورہ نبا کے آخر میں بھی اس طرح ہے:

ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابًا

اس وقت کافر کہے گا اے کاش میں خاک ہوتا۔

لیکن "تسوی" کی تعبیر ایک اور مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ اس کے علاوہ کہ کافر یہ آرزو کریں گے کہ وہ خاک ہو جائیں، یہ بھی چاہیں گے کہ ان کی خاک اور قبریں بھی زمین میں دب جائیں اور آس پاس کی زمینوں کے برابر ہو جائیں تاکہ وہ بالکل محو ہو جائیں[1] مگر وہ اس موقع پر کسی حقیقت کو نہ چھپا سکیں گے (و لا یکتمون اللہ حدیثا)۔ کیونکہ اس شہود اور گواہوں کی موجودگی میں وہ انکار نہ کر سکیں گے۔ البتہ یہ گفتگو ان دوسری آیات کے منافی نہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ بعض کافر قیامت کے دن بھی حقائق چھپائیں گے اور جھوٹ بولیں گے[1]۔ کیونکہ ان کا جھوٹ شہود اور گواہوں سے پہلے ہوگا لیکن اس کے بعد جب انکار کی کوئی گنجائش نہ رہے گی تو وہ تمام حقائق کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

حضرت امیرالمومنینؑ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

خدا قیامت کے دن کچھ لوگوں کے لبوں پر مہر خاموشی ثبت کر دے گا تاکہ وہ بات نہ کر سکیں۔ تو ایسے میں ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے اور جسم کی کھال اپنے اعمال بیان کرے گی۔ غرض اس وقت کوئی شخص حقیقت کا انکار نہ کر سکے گا[2]

بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی بھی لکھے ہیں کہ لا یکتمون اللہ حدیثا سے مراد یہ ہے کہ وہ تمنا کریں گے کہ اے کاش جب وہ دنیا میں تھے تو پیغمبر اسلام کے بارے میں حقائق کو نہ چھپاتے۔ اس بنا پر یہ مذکورہ جملہ "لو تسوی بھم الارض" پر عطف ہوگا۔ لیکن یہ تفسیر لا یکتمون کے ظہور کے ساتھ جو فعل مضارع ہے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اگر یہ معنی مراد ہوتے تو پھر یوں کہا جاتا: "ولم یکتموا"۔

۴۳۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ

---

[1] سورۂ انعام کی آیت ۲۲ اور ۲۳ اور سورۂ مجادلہ کی آیت ۱۸

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۲ منقول از تفسیر عیاشی۔



الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○

ترجمہ

۴۳ اے ایمان والو جب تم نشے میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک تم یہ نہ سمجھ سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور اسی طرح جب تم جنابت کی حالت میں ہو جب تک غسل نہ کر لو مگر یہ کہ عالم مسافرت میں ہو۔ اب اگر تم بیمار یا مسافر ہو یا قضائے حاجت کی ہے اور یا عورتوں سے مباشرت کی ہے اور اس حالت میں تمہیں (وضو یا غسل کے لیے) پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔ اس طرح سے کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اس سے مسح کرو خدا بخشنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔

تفسیر

چند فقہی احکام

مذکورہ بالا آیت سے چند اسلامی احکام معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ نشے کی حالت میں نماز کی حرمت یعنی جو لوگ مست ہوں وہ نماز ادا نہیں کر سکتے اور ان کی نماز اس حالت میں باطل ہے۔ اس کا فلسفہ بھی واضح ہے کیونکہ نماز بندے کی خدا کے ساتھ گفتگو اور راز و نیاز ہے۔ اسے انتہائی توجہ اور ہوش مندی کے ساتھ انجام پانا چاہیے اور مست لوگ اس منزل سے دور اور بے خبر ہوتے ہیں (یا ایها الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰة و انتم سکاریٰ حتی تعلموا ما تقولون)۔

ممکن ہے اس موقع پر کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ کیا آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مشروبات الکحل کا پینا صرف اس صورت میں منع ہے جبکہ اس کی مستی نماز کی حالت تک باقی رہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ باقی حالات میں ان کا پینا جائز ہے۔ اس سوال کا مفصل جواب تو انشاء اللہ سورۂ مائدہ کی آیت ۹۰ کی تفسیر میں آئے گا۔ البتہ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے بہت سے احکامات کو عملی صورت دینے میں تدریجی طریقہ اختیار کرتا ہے مثلاً یہی مشروبات الکحل کا مسئلہ چند مرحلوں میں آیا ہے۔ پہلے پہل اس کا پینا ناپسندیدہ اور ورزقاً حسناً (نحل ۶۷) کے برعکس قرار دیا گیا بعد ازیں نشہ کی حالت میں نماز سے منع فرمایا۔ اس کے بعد اس کے نفع اور نقصان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا کہ اس کے نقصانات فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں پھر آخری مرحلے میں اس سے قطعی اور صریحی ممانعت کی گئی ہے (مائدہ ۹۰)۔



اصولی طور پر ایک اجتماعی اور اخلاقی فساد کی جڑ کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جس سے ماحول بری طرح سے متاثر ہو رہا ہو، اس سے بہتر اور روشن تر اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ افراد کو آہستہ آہستہ اسے چھوڑنے پر آمادہ کیا جائے اور پھر آخری حکم دیا جائے۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ یہ آیت کسی طرح بھی شراب نوشی کے جواز پر دلالت نہیں کرتی بلکہ وہ صرف حالت نماز میں مستی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے۔ نماز کی حالت کے علاوہ کے لیے خاموش ہے، یہاں تک کہ آخری حکم آجائے۔ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ نماز پنجگانہ کے اوقات خصوصاً اس زمانے میں جب کہ نماز عام طور پر پانچ وقتوں میں پڑھی جاتی تھی کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اب نماز بحالت ہوش و حواس پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اوقات کے درمیانی فاصلے میں ایسی مشروبات سے جو نشہ آور ہیں کلی طور پر پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ اکثر اوقات شراب کا نشہ نماز کے وقت تک باقی رہتا ہے اور ہوش و حواس برقرار نہیں رہتے۔ اس بنا پر زیر بحث آیت ایک طرح سے دائمی اور مسلسل تحریم کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ بہت سی روایتیں جو شیعہ سنی کتب میں آئی ہیں ان میں مندرجہ بالا آیت کے معنی نیند کی مستی کے لیے گئے ہیں۔ یعنی جب تک اچھی طرح سے نہ جاگ جاؤ نماز شروع نہ کرو جب تک تمہیں یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کہہ رہے ہو[1] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کے لیے "حتیٰ تعلموا ما تقولون" کے مفہوم سے فائدہ اٹھایا گیا ہے "سکاریٰ" سے نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہاں تک کہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اس حالت میں نماز پڑھنا جس میں انسان کے ہوش و حواس پورے طور بجا نہ ہوں ممنوع ہے، چاہے وہ مستی کی حالت ہو یا اونگھ اور نیند کے خمار کے عالم میں۔ اس جملے سے ضمنی طور پر یہ استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ بہتر ہے کہ انسان سستی اور کم توجہ کی حالت میں بھی نماز نہ پڑھے کیونکہ اس حالت میں کمزوری سی پائی جاتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے:

> جب تم کسالت و سستی میں ہو یا اونگھ رہے ہو اور یا طبیعت بوجھل ہو تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو کیونکہ خداوند عالم نے مومنین کو مستی کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے[2]

۲۔ **حالتِ جنابت میں نماز کا باطل ہونا۔** جس کی طرف "ولا جنباً" سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس حکم سے استثنا کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: الا عابری سبیل (مگر یہ کہ مسافرت میں ہوں) اگر مسافرت میں پانی نہ ملے تو پھر تیمم سے نماز پڑھ (اس کی تفصیل آگے آئے گی) لیکن اخبار و روایات میں اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی درج ہے[3] اور وہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ صلوٰۃ سے مراد نماز پڑھنے کی جگہ اور مسجد ہے۔ یعنی حالت جنابت میں مساجد میں داخل نہ ہوں۔ اس کے بعد ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو حالت جنابت میں مسجد سے گزریں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور اصحاب نبیؐ کی ایک جماعت نے مسجد نبوی کے اطراف میں ایسے گھر بنائے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۳ و تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۱۷۷۱۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۸۳ اس مضمون کے مشابہ صحیح بخاری میں بھی ایک روایت ہے۔

[3] وسائل جلد اول صفحہ ۴۸۶۔



ہوئے تھے جن کے دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے اور انہیں اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ جنابت کی حالت میں مسجد سے بلاتوقف گزر جائیں۔

لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس تفسیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آیت میں لفظ صلوٰۃ دو معنی میں استعمال ہوا ہے ایک نماز اور دوسرا "محل نماز" کیونکہ زیر نظر آیت میں دو حکم بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ حالت نشہ میں نماز نہ پڑھی جائے اور دوسرا حالت جنابت میں مساجد میں داخل نہ ہوں۔

جیسا کہ اصول میں ہم کہہ چکے ہیں ایک لفظ کا دو معنی میں استعمال شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن خلاف ظاہر ضرور ہے اور قرینہ کے بغیر جائز بھی نہیں ہے۔ البتہ روایات مندرجہ بالا اس کا قرینہ قرار دی جا سکتی ہیں۔

۳۔ غسل کر چکنے کے بعد نماز پڑھنے یا مسجد سے گزرنے کے جواز کو "حتی تغتسلوا" سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ اس کے بعد جو پانی نہ ملنے یا کسی اور وجہ سے معذور ہوں ان کے لیے تیمم کا حکم بیان کیا گیا ہے: وان کنتم مرضی او علی سفر یعنی اگر بیمار ہو جاؤ یا سفر میں ہو۔ درحقیقت اس مختصری عبارت میں تشریع تیمم کے تمام مواقع جمع ہیں۔ پہلا مقام وہ ہے جہاں پانی جسم کے لیے ضرر رساں ہو اور دوسرا مقام وہ ہے جہاں انسان کو پانی نہ ملے یا اس کے استعمال کی طاقت نہ ہو۔

پھر فرمایا: او جاء احد منکم من الغائط او لامستم النساء۔ اس جملے سے تیمم کی ضرورت کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب تقاضائے حاجت سے فارغ ہو یا عورتوں سے ہم بستری کرو۔ فلم تجدو ماء ـــ اور تمہیں پانی نہ ملے۔ فتیمموا صعیدًا طیبًا تو اس موقع پر پاکیزہ مٹی سے تیمم کرو۔ اس کے بعد تیمم کا طریقہ بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: فامسحوا بوجوھکم وایدیکم اس کے بعد اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ حکم تمہارے لیے ایک قسم کی سہولت اور آسانی ہے۔ چونکہ خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ فلم تجدو ماءً کا جملہ جو اصطلاح کے مطابق فاء تفریع سے شروع ہوتا ہے "او علی سفر" سے مربوط ہے یعنی جس وقت تم سفر میں ہو تو ممکن ہے کہ پانی نہ مل سکے اور تمہیں تیمم کی ضرورت پڑے۔ کیونکہ انسان جب بستی میں ہو پھر تو ایسا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جو بات صاحب المنار جیسے مفسرین نے لکھی ہے کہ "فقط مسافرت ہی وضو کی بجائے تیمم کرنے کے لیے کافی ہے" بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ فاء تفریع "فلم تجدوا" میں اس بات کو باطل کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ سفر میں کبھی پانی نہیں ملتا تو ایسے موقع پر تیمم کر لینا چاہیے نہ یہ کہ حالت سفر ہی میں تیمم جائز ہے۔ تعجب ہے کہ مولف مذکور اس سلسلے میں فقہاء پر تنقید کرتا ہے جبکہ مذکورہ تنقید کا یہاں کوئی مقام نہیں ہے۔

۲۔ لفظ "او" "او جاء احد منکم من الغائط" کے جملے میں "واؤ" کے معنی میں ہے کیونکہ بیماری یا مسافرت تیمم کا سبب نہیں ہیں بلکہ ایسی حالت میں اگر اسباب وضو یا غسل حاصل نہ ہوں تو اس وقت تیمم واجب ہے۔

۳۔ اس آیت میں قرآن کے بیان کی نفاست و پاکیزگی دوسری بہت سی آیتوں کی طرح مکمل طور پر دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ جب



چاہتا ہے کہ تقاضائے حاجت کے متعلق گفتگو کرے تو ایسی تعبیر کو چنتا ہے جو مطلب سمجھا دے اور نامناسب لفظ بھی استعمال نہ ہونے پائے اس لیے فرماتا ہے:

اوجاء احد منکم من الغائط اس کی وضاحت یوں ہے کہ "غائط" بخلاف اس مفہوم کے جو آجکل اس سے سمجھا جاتا ہے[1] اصل میں ایسی نشیبی زمین کے لیے بولا جاتا ہے جو انسان کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لے اور اس زمانے میں بیابانوں میں پھرنے والے اور مسافر لوگ تقاضائے حاجت کے لیے ایسی جگہوں پر جاتے تھے تاکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ بنابریں اس جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص نشیبی جگہ سے آیا ہو جو عام طور پر تقاضائے حاجت کی طرف کنایہ ہے اور قابل توجہ بات ہے کہ تم کی بجائے تم میں سے کوئی کا لفظ استعمال ہوا ہے تاکہ بیان کی نفاست بڑھ جائے (غور فرمایئے گا)۔

اسی طرح مباشرت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو "اولا مستم النساء" یا عورتوں سے لمس کیا ہو کی تعبیر سے سمجھایا گیا ہے اور لفظ "لمس" ہم بستری کے لیے عمدہ کنایہ ہے۔

۴۔ تیمم کی باقی خصوصیات کے بارے میں منجملہ "صعیدا طیبا" انشاء اللہ سورۂ مائدہ کی آیت ۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

تیمم کا فلسفہ

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ زمین پر ہاتھ مارنے اور پھر انہیں پیشانی اور ہاتھوں کی پشت پر پھیرنے میں کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سی مٹی گندی بھی ہوتی ہے اور اس سے جراثیم بھی منتقل ہوتے ہیں۔

اس اعتراض کے جواب کے لیے دو نکتوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

الف۔ اخلاقی فائدہ۔ تیمم ایک عبادت ہے۔ اور عبادت کی روح اس میں اپنے حقیقی معنی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان اپنی پیشانی کو جو بدن کا محترم ترین عضو ہے اس ہاتھ سے جو مٹی پر مارا گیا ہے مس کرتا ہے۔ تاکہ اس کی بارگاہ میں اپنی عاجزی و انکساری ظاہر کرے۔ یعنی میری پیشانی اور ہاتھ تیرے سامنے انتہائی خشوع و خضوع کے لیے حاضر ہیں۔ اس کے بعد انسان نماز یا دوسری عبادتوں کو انتہائی خلوص اور عاجزی سے ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے جن میں وضو یا غسل کی شرط ہے۔ اس طرح انکساری، عبودیت اور شکرگزاری کے جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے یہ عمل بہت موثر اور کارگر ہے۔

ب۔ حفظانِ صحت کا فائدہ: آج کی دنیا میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مٹی اپنے بہت سے جرثوموں (BACTERIAS) کی وجہ سے گندگیوں کو دور کر سکتی ہے۔ یہ جرثومے جن کا کام آلودہ کرنے والے مواد کا تجزیہ اور طرح طرح کی بدبو کو دور کرنا ہے زیادہ تر زمین کی سطح پر معمولی سی گہرائی میں جہاں سے ہوا اور سورج کی روشنی سے بخوبی فائدہ اٹھا سکیں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب مردہ جانور یا لاشیں زمین میں دفن کر دی جائیں اور اسی طرح سے دوسری چیزیں جو گندگی سے بھری ہوئی زمین پر پڑی ہوں، تھوڑے ہی

---

[1] غائط کا لفظ آجکل عموماً انسانی فضلہ کے لیے بولا جاتا ہے۔



عرصے میں ان کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور جرثوموں کی وجہ سے وہ بدبو کا مرکز نیست و نابود ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ اگر زمین میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو کرۂ زمین مدت قلیل میں بدبو کے ڈھیروں میں بدل جاتا۔ اصولی طور پر مٹی اینٹی بائیوٹک (ANTIBIOTIC) اثر رکھتی ہے جو بہترین جراثیم کش ہے۔ اس بنا پر نہ صرف یہ کہ پاکیزہ مٹی گندی چیز نہیں بلکہ وہ گندگی کو دور کرنے والی ہے اور اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی حد تک پانی کی جانشینی کرے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پانی حلال ہے یعنی وہ جراثیم کو حل کر کے بہالے جاتا ہے۔ لیکن مٹی انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

البتہ تو ضرور ہے کہ تیمم کی مٹی مکمل طور پر پاک و پاکیزہ ہو۔ جیسا کہ قرآن اس کی عجیب و غریب تعبیر لفظ " طیبا " سے کرتا ہے۔

یہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس سے وہ "صعید" مراد ہے جو مادۂ "صعود" سے لیا گیا ہے۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ اس کام کے لیے وہ مٹی چنی جائے جو سطح زمین پر سورج کی تپش اور اس کی روشنی کی زد میں ہو اور ہوا اور جراثیم مارنے والے جرثوموں سے بھری ہوئی ہو۔ اگر اس قسم کی مٹی پاک و پاکیزہ بھی ہو تو اس سے تیمم مندرجہ بالا اثرات رکھتا ہے (سورۂ مائدہ کی آیت ۶ کی ذیل میں اس سلسلہ میں مزید بحث کی جائے گی)۔

۴۴۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ○

۴۵۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ○

ترجمہ

۴۴ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (خدا کی) کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا (اس کی بجائے کہ وہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ہدایت کریں) اس سے اپنے لیے گمراہی خریدتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔

۴۵ خدا تمہارے دشمنوں سے آگاہ ہے (وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے) کافی ہے کہ خدا تمہارا ولی ہو اور کافی ہے کہ وہ تمہارا ناصر و مددگار ہو۔

تفسیر

الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یشترون الضلالۃ ویریدون ان تضلوا السبیل۔

خداوند عالم اس آیت میں تعجب آمیز عبارت سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتا ہے: اس



گروہ کی حالت حیران کن ہے جو کتاب آسمانی کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے اور دوسروں کے لیے ہدایت و سعادت حاصل کرتے، گمراہی کا راستہ اپناتے ہیں اور تمہارے لیے بھی چاہتے ہیں کہ گمراہ ہو جاؤ۔ اس طریقے سے وہ چیز جو خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ تھی، ان کی بُری نیتوں کی وجہ سے گمراہی اور وسیلۂ گمراہی میں بدل گئی ہے کیونکہ وہ کبھی حقیقت کی تلاش میں کوشاں نہیں تھے۔ بلکہ ہر چیز کو نفاق، حسد اور مادیت کی سیاہ عینک سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے، یہ لوگ اگرچہ دوستی کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن یہ دراصل تمہارے جانی دشمن ہیں اور خدا ان سے آگاہ ہے (واللّٰہ اعلم باعدائکم)۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دشمنی ہوگی کہ وہ کبھی خیر خواہی کے لہجے میں اور کبھی بدگوئی کی زبان میں تمہاری ہدایت اور سعادت کی مخالفت کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے بُرے مقاصد کی تکمیل کے درپے ہیں لیکن تم ان کی دشمنی سے نہ گھبراؤ۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ یہی کافی ہے کہ خدا تمہارا رہبر، ولی اور مددگار ہے (وکفیٰ باللّٰہ ولیا وکفیٰ باللّٰہ نصیرا) کیونکہ وہ کچھ نہ کر سکیں گے۔ اگر تم ان کی باتوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالو تو کسی قسم کا ڈر نہیں ہے۔

ضمناً "اوتوا نصیبا من الکتاب" (کتاب کا کچھ حصہ انہیں دیا گیا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مکمل آسمانی کتاب "تورات" نہ تھی بلکہ اس کا کچھ حصہ تھا اور یہ بات تسلیم شدہ تاریخی حقائق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ تورات کے بہت سے اصلی حصے یا تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے یا وہ بالکل نیست و نابود کر دیئے گئے تھے۔

۴۶۔ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

ترجمہ

۴۶۔ بعض یہودی تورات کے کچھ فقروں کو ان کے مقام سے بدل دیتے تھے اور (بجائے اس کے یہ کہنے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مخالفت کی اور نیز کہتے کہ سنو کہ ہرگز نہ سنو اور (بطور طنز کہتے "راعنا" یعنی) ہمیں بے وقوف بناؤ۔ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ اپنی زبان سے حقائق کو بدل ڈالیں اور دین خدا پر طعن و تشنیع کریں لیکن اگر وہ (اس ہٹ دھرمی اور اصرار کی بجائے) یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور ہماری بات کو سنو اور ہمیں مہلت دو (تاکہ ہم حقائق کی تہ کو پہنچ سکیں) تو یہ بات ان کے نفع میں تھی اور حقیقت کے ساتھ سازگار تھی۔ لیکن خدا نے انہیں ان



کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے محروم کر دیا۔ اس لیے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر

یہودیوں کے کردار کا ایک اور رُخ

یہ آیت گذشتہ آیتوں کے بعد بعض دشمنانِ اسلام کی کچھ اور صفتوں کی تشریح کرتی ہے اور ان کے بعض اعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہلے یہ بتاتی ہے کہ ان کا کام حقائق کی تحریف اور احکام خدا کے چہرے کو مسخ کرنا تھا (من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ)۔ یہودیوں کا ایک گروہ کلمات خدا کو ان کی جگہ سے تبدیل کر دیتا تھا یہ تحریف نہ معلوم لفظی تھی کہ معنوی لیکن بعد کے جملے بتاتے ہیں کہ یہاں تحریف سے مراد تحریف لفظی اور تغیر عبارت ہے کیونکہ اس جملہ کے بعد فرماتا ہے (ویقولون سمعنا وعصینا) ہم نے سُنا اور نافرمانی کی یعنی بجائے اس کے کہ سمعنا و اطعنا یعنی ہم نے سنا اور اطاعت کی کہیں کہتے ہیں ہم نے سُن کر مخالفت کی اور یہ بالکل ان لوگوں کی طرح ہے جو بعض اوقات بطور استہزا کہتے ہیں: "آپ کا کہنا اور ہمارا بات پر کان نہ دھرنا" آیت کے دوسرے جملے بھی اسی مطلب کی گواہی دیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کی عداوت آمیز جسارت اور بے ادبی کی گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ کہتے ہیں: واسمع غیر مسمع "سنو کہ کبھی نہ سنو" اور اس طرح وہ ایک نادان اور جاہل گروہ بن کر حقائق کو بدلنے اور کتب آسمانی میں خیانت کرنے میں معروف ہیں حالانکہ یہ کتابِ آسمانی فرعون جیسے ظالم و جابر کے چنگل سے ان کی نجات کا ما حصل ہے۔ انہوں نے استہزا اور مسخرہ پن جیسے نامردانہ حربے اختیار کر رکھے ہیں یہ حربے ہٹ دھرم اور غرور کرنے والوں کا ہتھیار ہیں وہ کبھی ان باتوں کے علاوہ پاک دل مسلمانوں کے بعض جملوں سے جو وہ حضرت رسالت مآبؐ کی خدمت اقدس میں عرض کرتے تھے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان جملوں کو دوسرے مطالب و معانی کا لباس پہنا کر استہزا اور تمسخر کے طور پر استعمال کرتے تھے مثلاً "راعنا" جس کے معنی ہیں "ہم سب سے رعایت کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے" سچے مسلمان دعوتِ اسلام کی ابتداء میں اس بنا پر کہ زیادہ اچھے اور بہتر طریقے سے آپؐ کی باتوں کو سنیں اور دل میں جگہ دیں حضرت رسولِ اکرمؐ کے سامنے ایسے جملے عرض کرتے لیکن یہودیوں کا یہ گروہ اسے بگاڑ کر حضورؐ کے سامنے اُسے دھراتا تھا۔ اس لفظ سے ان کی مراد اس کا عبرانی معنی تھا اور وہ یہ کہ "سنو کہ کبھی نہ سنو" یا پھر دوسرے عربی معنی یعنی ہمیں بے وقوف بناؤ[1]۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کریں کہ خاکم بدہن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام لوگوں کو اُلو بنانا اور بے خبر رکھنا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے تھے تاکہ اپنی زبان سے حقائق کو اصلی محور سے ہٹا دیں اور دین حق پر زبان اعتراض دراز کریں

---

[1] "راعنا" اگر "رعی" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی ہے "ہم سے مراعات کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے" اور اگر "رعونت" کے مادہ سے ہو تو اس کا معنی ہے "ہمیں بے وقوف بنائیے"۔ یاد رہے کہ پہلی صورت میں "راعنا" میں نون شد کے بغیر ہوگا اور دوسری صورت میں شد کے ساتھ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی خاص طور پر نون پر شد دیتے تھے اور آخر پر اسے کھینچ کر پڑھتے تھے۔



(لیًا بالسنتھم وطعنًا فی الدین) ۔لی (بروزن حی) کے معنی طناب وغیرہ کو لپیٹنا ہیں اور یہاں اول بدل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

ولوانھم قالوا سمعنا واطعنا واسمع وانظرنا لکان خیرًا لھم واقوم

لیکن اگر وہ اس ہٹ دھرمی، اصرار، حق دشمنی اور بے ادبی کی بجائے سیدھی راہ اپناتے اور یہ کہتے کہ ہم نے خدا کا کلام سُنا اور ہم نے اطاعت کی آپ ہماری گذارشات سنیئے اور ہم سے رعایت کیجئے اور ہمیں مہلت دیجئے کہ ہم حقائق کو سمجھ سکیں تو یہ ان کے فائدے میں ہوتا اور عدل منطق اور ادب کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا۔

ولکن لعنھم اللہ بکفرھم فلا یؤمنون الا قلیلا۔

لیکن وہ کفر، سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے رحمتِ خدا سے دور ہو گئے ہیں اور ان کے دل اس قدر مردہ ہو چکے ہیں کہ وہ جلدی زندہ اور بیدار نہیں ہو سکتے۔ ان میں صرف تھوڑے سے لوگ پاک دل ہیں جو حقائق قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور حق کی باتوں کو سنتے ہیں اور ان پر ایمان لاتے ہیں۔

بعض لوگ اس جملے کو قرآن کی غیبی خبروں میں سے قرار دیتے ہیں کیونکہ جس طرح قرآن اس جملے میں خبر دیتا ہے اسلام کی طویل تاریخ میں یہودیوں میں سے بہت ہی کم لوگ ایمان لائے اور اسلام سے وابستہ ہوئے باقی اُس دن سے آج تک اسلام سے برسرِ پیکار ہیں۔

۴۷۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

ترجمہ

۴۷۔ اے وہ لوگو کہ جنہیں اللہ کی کتاب دی گئی ہے! جو کچھ ہم نے (اپنے رسول پر) نازل کیا ہے اور جو ان نشانیوں سے ہم آہنگ بھی ہے جو تمہارے پاس ہیں ایمان لے آؤ، اس سے پہلے کہ چہروں کو مسخ کر دیں اور پھر انہیں پشت کی طرف پھیر دیں یا انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیں جیسا کہ ہم نے اصحاب سبت کو دور کر دیا تھا اور خدا کا فرمان ہر حالت میں روبہ عمل ہو کے رہتا ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرم افراد کی سرنوشت

یا ایھا الذین اوتوا الکتاب امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم



اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں اہل کتاب کے بارے میں تھی یہاں انہی کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے وہ لوگو جنہیں آسمانی کتاب دی جا چکی ہے، قرآن مجید کی آیتوں پر ایمان لے آؤ جو کہ ان نشانیوں سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے بارے میں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں اور مسلم ہے کہ ان نشانیوں کی موجودگی میں تم دوسرے لوگوں کی نسبت اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہو کہ اس پاک دین کے ماننے والے بن جاؤ۔

اس کے بعد انہیں دھمکی دیتا ہے کہ اس سے پہلے کہ تم دو سزاؤں میں سے کسی ایک میں گرفتار ہو جاؤ حق کے سامنے تسلیم خم کر دو۔ پہلی سزا یہ کہ تمہارے چہروں کو کلی طور پر نیست و نابود کر دیا جائے اور ان تمام اعضاء کو جن کے ذریعے تم حقائق کو دیکھتے، سنتے اور سمجھتے ہو مٹا دیں اور اس کے بعد تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں (من قبل ان نطمس وجوھًا فنردھا علی ادبارھا)۔[1]

شاید یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس جملہ سے مراد عقل و ہوش، آنکھ اور کان کا حقائق و واقعات زندگی کو نہ سمجھنا اور صراط مستقیم سے روگردانی کے لحاظ سے بیکار ہو جانا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

> اس سے مراد ان کے چہروں کا راہ راست و ہدایت سے محو کرنا ہے اور ان کو پشت کی طرف پھیرنے سے مراد گمراہی ہے۔[2]

اس کی وضاحت یوں ہے کہ اہل کتاب خصوصاً یہودیوں نے ان تمام واضح نشانیوں کے باوجود حق کے سامنے سر نہ جھکایا اور جان بوجھ کر ضد اور دشمنی کے لیے آمادہ ہو گئے اور مختلف مقامات پر دانستہ طور پر خلاف بیانی اور مخالفت کی تکرار کی اور آہستہ آہستہ یہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی، گویا ان کے افکار کلی طور پر مسخ اور ان کی آنکھیں اور کان اندھے بہرے ہو گئے۔ اس قسم کے لوگ زندگی کی راہ میں ترقی کرنے کی بجائے پچھلے پاؤں پلٹ جاتے ہیں اور جو جان بوجھ کر حق کا انکار کرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے۔

حقیقت میں یہ سورۂ بقرہ کی آیت ۷ کے مشابہ ہے۔ اس بنا پر "طمس" اور پشت کی طرف لوٹنے سے مراد فکری، روحانی اور معنوی طور پر پشت کی طرف پلٹنا ہے۔

باقی رہی دوسری سزا جس کی انہیں دھمکی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اصحاب سبت[3] کی طرح اپنی رحمت سے دور کر دے گا (او نلعنھم کما لعنا اصحب السبت)۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ ان دونوں دھمکیوں میں کیا فرق ہے لفظ "او" کے ساتھ جس کے معنی "یا" ہیں یعنی ان میں سے ایک یا پھر یہ دوسرے پر عطف ہے۔

---

[1] "طمس" کے اصل معنی ہیں کسی چیز کے آثار کو مٹا دینا مثلاً اگر کسی عمارت کو ویران کر دیں اور اس کی جگہ بالکل صاف کر دیں اور سابقہ عمارت کے آثار کو ختم کر دیں۔ لیکن کنایہ کے طور پر اس چیز کو بھی کہا جاتا ہے جس کا اثر اور خاصیت ختم ہو جائے۔

[2] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۵۵ آیۂ مذکورہ کے ذیل میں۔ [3] اصحاب سبت — کے بارے میں تفصیل سورہ اعراف آیت ۱۶۳ تا ۱۶۶ کے ذیل میں آئے گی۔ یہ یہودیوں کا ایک گروہ تھا جسے حکم دیا گیا تھا کہ ہفتہ کے روز کام کاج نہ کریں لیکن ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کے فرمان کی مخالفت کی اور ماہی گیری کرتے رہے اور طغیان و سرکشی میں آخری حد تک جا پہنچے اور آخر کار دردناک انجام سے دو چار ہوئے۔



بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ پہلی دھمکی معنوی پہلو رکھتی ہے اور دوسری دھمکی ظاہری اور مسخ جسمانی کا پہلو رکھتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے: جس طرح ہم نے اصحاب سبت کو اپنی رحمت سے دور کیا تھا ان کو بھی اپنی رحمت سے دور کریں گے۔ ہم جانتے ہیں (جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ اعراف میں آئے گا) کہ اصحاب سبت ظاہری طور پر مسخ ہوئے تھے۔

بعض دوسرے لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ لعنت اور خدا کی رحمت سے دوری بھی اس فرق کے ساتھ معنوی پہلو رکھتی ہے کہ پہلی دھمکی انحراف، گمراہی اور پشت کی طرف پلٹنے کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسری دھمکی کے معنی ہلاکت اور نیست و نابود ہونا ہیں کیونکہ لعنت کے ایک معنی ہلاکت بھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل کتاب اصرار اور مخالفتِ حق پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے شکست کھائیں گے یا نیست و نابود ہو جائیں گے۔

ایک اور سوال بھی سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا ان کے بارے میں یہ دھمکی عمل میں لائی گئی کہ نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی دھمکی ان میں سے بہت سوں کے بارے میں اور دوسری بعض کے بارے میں عمل میں آچکی ہے۔ اسلامی جنگوں میں ان کی بہت بڑی جماعت تباہ و برباد ہو گئی اور ان کی طاقت ختم ہو گئی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس کے بعد بھی مختلف ملکوں میں بہت تنگی اور مشکلات سے دوچار ہوئے اور ان کے بہت سے لوگ مارے گئے اور وہ اس وقت بھی بہت ہی برے اور خطرناک حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان دھمکیوں کی تاکید کے طور پر فرماتا ہے: فرمانِ خدا ہر حال میں روبہ عمل ہو گا اور اسے کوئی طاقت بھی نہ روک سکے گی (وکان امر اللہ مفعولا)۔

۴۸۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ○

ترجمہ

۴۸۔ خدا کبھی مشرک کو نہیں بخشے گا اور اس سے نیچے جو کچھ ہے وہ جسے چاہے (بشرطیکہ وہ اہلیت رکھتا ہو) بخش دے گا اور جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے وہ عظیم گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔

تفسیر

اُمید سے معمور آیت

مندرجہ بالا آیت صراحت سے بتاتی ہے کہ سب گناہ بخشے جا سکتے ہیں لیکن شرک کسی صورت میں نہ بخشا جائے گا مگر یہ کہ اُسے چھوڑ دیں، توبہ کر لیں اور موحد بن جائیں۔ دوسرے لفظوں میں کوئی گناہ بھی ایمان کو ختم نہیں کر سکتا جس طرح کہ کوئی نیک عمل بھی شرک



کی موجودگی میں انسان کو نجات نہیں دلوا سکتا (ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذٰلک لمن یشاء)۔

اس آیت کا ربط گذشتہ آیات کے ساتھ اس لحاظ سے ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک، ایک طرح سے مشرک تھے۔ قرآن اس آیت کے ذریعے خطرے سے خبردار کرتا ہے کہ وہ اس عقیدے کو ترک کر دیں کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جو بخشا نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: جو شخص خداوند عالم کے لیے شریک قرار دے اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے (و من یشرک باللہ فقد افتریٰ اثما عظیما)۔[1]

یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو موحدین کو پروردگار عالم کے لطف و کرم سے اطمینان اور امید دلاتی ہیں کیونکہ اس آیت میں خدا نے شرک کے علاوہ باقی گناہوں کی بخشش کا امکان بیان کیا ہے۔ اس روایت کے مطابق جو طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے نقل کی ہے یہ آیت آیاتِ قرآن میں سب سے زیادہ اُمید افزا ہے:

ما فی القراٰن اٰیۃ ارجیٰ عندی من ھذہ الاٰیۃ

اور ابن عباس کے بقول یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو اہلِ ایمان کے لیے ہر اس چیز سے عزیز تر ہے جس پر سورج کی روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بڑے بڑے گناہ کر بیٹھتے ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں اور وہ اسی بنا پر اپنی بقایا زندگی میں بخشش سے نا اُمید ہو کر گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ حالانکہ خدائی بخشش اور عفو و درگزر کی اُمید ہی وہ موثر ذریعہ ہے جو انہیں گناہ اور سرکشی سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس لیے یہ آیت حقیقت میں ہماری راہنمائی ایک تربیتی مسئلے کی طرف کرتی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ (بعض مفسرین اور متعدد روایات کے مطابق جو اس آیت کی ذیل میں نقل کی گئی ہیں) جرائم پیشہ اور وحشی افراد مثلاً اسلام کے رشید سپہ سالار حضرت حمزہ بن حضرت عبدالمطلب، حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کا قاتل تک اس آیت کے نازل ہونے پر ایمان لے آتا ہے اور جرائم سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے، تو دوسرے گناہگاروں کے لیے بھی یہ اُمید پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں اور جو گناہ وہ کر چکے ہیں اپنے آپ کو اس سے زیادہ آلودہ گناہ نہ کریں۔

اس موقع پر شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ آیت گناہوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کیونکہ اس میں شرک کے علاوہ باقی سب گناہوں کی بخشش کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ اس بخشش کے وعدے کا مقصد ایسا وعدہ نہیں ہے جس میں کوئی شرط اور پابندی نہ ہو بلکہ یہ ان افراد کے لیے ہے جو بخشش کی قابلیت اور اہلیت ظاہر کریں جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے مشیت اور خدا کی منشا جس کا ذکر اس آیت میں اور دوسری آیتوں میں ہوا ہے حکمت الٰہی کے معنی میں ہے۔ کیونکہ خدا کی مشیت اور منشا کبھی حکمت سے جدا نہیں ہوتی اور یہ مسلم ہے کہ اس کی حکمت کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ لیاقت اور استعداد کے بغیر کسی کو عفو و بخشش کا مستحق قرار دے۔ اس بنا پر اس آیت کا تربیتی اور اصلاحی پہلو اس سے غلط فائدہ اٹھانے کی نسبت کئی گنا ہے۔

---

[1] افترا مادہ فری سے ہے (بروزن فرد) قطع کرنے کے معنی میں ہے۔ اب اگر کسی سالم چیز کا کچھ حصہ کاٹ دیں تو وہ خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے بُرے کام مثلاً شرک اور جھوٹ کو بھی افترا کہتے ہیں۔



گناہوں کی بخشش کے اسباب

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت مسئلہ توبہ سے ربط نہیں رکھتی۔ کیونکہ توبہ اور ترکِ گناہ تو شرک سمیت تمام گناہوں کو دھو ڈالتا ہے، بلکہ اس سے مراد ایسے لوگوں کے لیے امکانِ عفوالٰہی ہے جنہیں توبہ کی توفیق نہیں ہوئی۔ یعنی اس سے پہلے کہ وہ اپنے کیے ہوئے گناہوں پر پشیمان ہوں یا پشیمانی کے بعد اپنے بُرے اعمال کی تلافی سے پہلے دنیا سے اٹھ جائیں۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کی بخشش کے کئی ایک ذریعے ہیں جن کا خلاصہ پانچ موضوعات میں کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ توبہ: گذشتہ گناہوں پر پشیمانی اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کے پختہ ارادے کے ساتھ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا اور بُرے اعمال کی نیک اعمال کے ذریعے عملی طور پر تلافی کرنا۔ جو آیات اس معنی پر دلالت کرتی ہیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

وهوالذی یقبل التوبة عن عباده ویعفوا عن السیئات

وہ خدا وہ ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ (شوریٰ۔ ۲۵)

۲۔ بہت زیادہ نیک کام کرنا۔ یہ بھی بُرے اعمال کی بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

ان الحسنات یذهبن السیئات

نیک کام کچھ گناہوں کو ختم کردیتے ہیں۔ (ہود۔ ۱۱۴)

۳۔ شفاعت: اس کی تفصیل تفسیرِ نمونہ کی جلد اوّل میں آچکی ہے۔

۴۔ گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کرنا: یہ بھی گناہانِ صغیرہ کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی تشریح اسی سورہ کی آیت ۳۱ اور ۳۲ کے ذیل میں گزرچکی ہے۔

۵۔ عفوِ خداوندی۔ یہ بھی بعض صاحب استعداد افراد کو میسر آتی ہے جیسا کہ ہم اسی آیت کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں۔

اب ہم دوبارہ یاد دلاتے ہیں کہ عفوِ الٰہی اس کی مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ کوئی عمومی اور بلا قید و شرط مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی مشیت اور ارادہ صرف ایسے افراد کے بارے میں ہے جو عملی طور پر کسی نہ کسی طریقے سے اپنی قابلیت اور اہلیت ظاہر کرتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ شرک کیوں قابلِ عفو و بخشش نہیں ہے۔ کیونکہ شرک اپنا رابطہ خداوندِ عالم سے بالکل توڑ لیتا ہے اور ایسے بڑے فعل کا مرتکب ہوتا ہے جو تمام ادیان اور فطرت کے قوانین کی بنیاد کے خلاف ہے۔

۴۹۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ○



۵۰۔ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۟

ترجمہ

۴۹ کیا تونے انہیں نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں (ان خودستائیوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے) لیکن خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے اور ان پر تھوڑا سا بھی ظلم نہیں ہوگا۔

۵۰ دیکھئے وہ کس طرح خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یہی واضح گناہ (ان کی سزا کے لیے) کافی ہے۔

شان نزول

بہت سی اسلامی تفاسیر میں اس آیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے لیے کچھ خصوصیات اور امتیازات کے قائل تھے۔ چنانچہ آیات قرآنی میں ہے کہ کبھی وہ کہتے ہم خدا کے بیٹے ہیں کبھی کہتے: ہمارے لیے بہشت مخصوص ہے اور ہمارے سوا کوئی وہاں نہیں جا سکتا (مائدہ ۱۸، بقرہ ۱۱۱) یہ آیتیں نازل ہوئیں اور ان کے باطل خیالات کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

خودستائی

الم تر الی الذین یزکون انفسھم[1]

اس آیت میں ایک مذموم صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں بہت سے لوگ اور قومیں مبتلا ہیں اور وہ ہے خودستائی، اپنے آپ کو نیک پاک ظاہر کرنا اور اپنے لیے فضیلتیں گھڑنا۔ آیت میں ہے: کیا تونے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی تعریفیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے: خدا جس کی چاہتا ہے تعریف کرتا ہے (بل اللہ یزکی من یشاء)۔ صرف وہی ذات اقدس ہے جو حکمت و مشیت بالغہ کی رو سے کسی کمی اور زیادتی کے بغیر بعض افراد کی ان کی قابلیت، لیاقت اور استعداد کے مطابق مدح کرتی ہے اور کبھی کسی شخص پر سوئی کی نوک کے برابر بھی ظلم نہیں کرتی (ولا یظلمون فتیلا)[2]۔ حقیقت میں فضیلت وہی ہے جسے خداوند عالم

---

[1] یزکون مادہ تزکیہ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پاک سمجھنا اور پاکیزگی سے پہچاننا بعض اوقات پاک کرنے، تربیت دینے اور رشد و ہدایت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ پاک کرنے کے معنی میں ہے۔ اگر یہ کام عملی پہلو رکھتا ہو تو پسندیدہ ہے اور اگر صرف زبانی جمع خرچ ہو تو مذموم ہے۔

[2] فتیل لغت میں اس بہت ہی باریک دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ بہت ہی چھوٹی چیزوں کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور در اصل یہ مادہ "فتل" سے ہے جس کے معنی ہیں "بٹا ہوا"۔



فضیلت قرار دے نہ کر وہ جب خودستائی کرنے والے خود غرضی کی وجہ سے اپنے ساتھ چسپاں کرلیں اور یوں اپنے پر اور دوسروں پر ظلم کریں۔
اگرچہ روئے سخن قوم یہود و نصاریٰ کی طرف ہے جو بغیر کسی دلیل کے غلط طور پر اپنے حق میں بعض امتیازات و خصوصیات کے قائل تھے اور اپنا تعارف معزز قوم و ملت کی حیثیت سے کراتے تھے۔ کبھی کہتے:

لن تمسنا النار الا ایاما معدودة

یعنی چند دنوں کے سوا جہنم کی آگ ہمیں ہرگز نہیں چھو سکتی۔ (بقرہ - ۸۰)

کبھی کہتے:

نحن ابناء الله و احباؤه

ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ (مائدہ - ۱۸)

لیکن یہ بات کسی قوم اور گروہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تمام افراد اور قومیں اس میں شامل ہیں جن میں یہ بُری عادت پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید سورۂ نجم آیہ ۳۲ میں صراحت کے ساتھ سب مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقی

خودستائی نہ کرو، خدا پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔

اس کا سرچشمہ وہی خود بینی، غرور اور گھمنڈ ہے جو آہستہ آہستہ خودستائی کا روپ دھار لیتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ بری عادت بہت سی قوموں، طبقوں اور افراد میں پائی جاتی ہے اور بہت سی معاشرتی بدحالیوں، لڑائی جھگڑوں اور تفوق طلبیوں کا سرچشمہ یہی بیماری ہے۔ گذشتہ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی بعض قومیں اسی جھوٹے احساس برتری کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسری قوموں سے بالاتر سمجھتی تھیں اور اسی سبب سے خود کو اس امر کا حقدار جانتی تھیں کہ انہیں اپنا غلام بنالیں۔ زمانہ جاہلیت کے عرب ہر قسم کی پس ماندگی اور فقر و فاقہ کے باوجود اپنے کو اعلیٰ نسل شمار کرتے تھے اور ان کے قبیلوں میں سے ہر ایک قبیلہ اپنے کو سب سے بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا موجودہ دور میں جرمن قوم یا نسل اسرائیل کی تفوق طلبی اور اپنی بڑائی کا احساس علاقائی اور عالمگیر جنگوں کا سرچشمہ بنی ہے۔ یہود و نصاریٰ صدر اسلام میں بھی دوسروں کی نسبت اسی قسم کے وہم میں گرفتار تھے۔ اسی لیے وہ حقائق اسلام کے سامنے بڑی مشکل سے سر جھکانے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ اسی بنا پر زیر نظر آیت میں قرآن شدت سے اس قسم کے توھمات اور برتری کی خواہشات کی سرکوبی کرتا ہے اور اسے افترا، خدا پر جھوٹ باندھنا اور بڑا گناہ شمار کرتا ہے، اور فرماتا ہے: انظر کیف یفترون علی الله الکذب وکفی به اثما مبینا یعنی دیکھیے یہ گروہ کس طرح جھوٹے فضائل بنانے اور ان کو خدا کی طرف منسوب کرنے کے ذریعے خدا پر جھوٹ باندھتا ہے۔ اگر انہوں نے اس گناہ کے علاوہ اور کوئی گناہ نہ بھی کیا ہو تو یہی ان کی سزا کے لیے کافی ہے۔

حضرت امیرالمومنین علیؑ اپنے مشہور خطبۂ ھمام میں پرہیزگاروں کی ممتاز اور مخصوص صفتوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

لا یرضون من اعمالهم القلیل ولا یستکثرون الکثیر فهم لانفسهم متهمون و من اعمالهم



مشفقون اذا زکی احد منھم خاف مما یقال لہ فیقول انا اعلم بنفسی من غیری و ربی اعلم بی من نفسی اللھم لا تؤاخذنی بما یقولون واجعلنی افضل مما یظنون واغفرلی ما لا یعلمون .

وہ کبھی اپنے تھوڑے عمل پر راضی نہیں ہوتے اور کبھی اپنے زیادہ عمل کو بڑا نہیں سمجھتے ۔ وہ اپنے آپ کو ہر حالت میں فرائض کے انجام دہی میں کوتاہ گردانتے ہیں اور اپنے اعمال سے خوف زدہ رہتے ہیں ۔ جب کوئی ان کی تعریف کرتا ہے تو جو کچھ وہ ان کے بارے میں کہتا ہے اسے سُن کر انہیں وحشت ہونے لگتی ہے کہ میں اپنی حالت کو دوسروں کی نسبت بہتر جانتا ہوں اور خدا مجھے مجھ سے بہتر جانتا ہے ۔ پالنے والے اس تعریف کے بدلے میں جو تعریف کرنے والے میرے بارے میں کرتے ہیں میری جواب طلبی نہ کرنا اور مجھے اس سے بھی زیادہ جو یہ گمان کرتے ہیں بلند و بالا اور برتر قرار دے اور میری وہ خطائیں جو ان کے علم میں نہیں ہیں بخش دے ۔

۵۱۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ○

۵۲۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ○

ترجمہ

۵۱ کیا تونے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں خدا کی کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے کہ وہ (اس کے باوجود) جبت و طاغوت (بت اور بت پرستوں) پر ایمان رکھتے ہیں اور مشرکین سے کہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں زیادہ ہدایت یافتہ ہیں ۔

۵۲ وہ ایسے لوگ ہیں خداوند عالم نے جنہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا اپنی رحمت سے دور کر دے اس کا تجھے کوئی بھی مددگار نہیں ملے گا ۔

شان نزول

اکثر مفسرین مندرجہ بالا آیتوں کی شانِ نزول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جنگ احد کے واقعہ کے بعد یہودیوں کے بزرگوں میں سے ایک شخص جس کا نام کعب بن اشرف تھا ستر آدمیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ آیا تاکہ رسول اکرمؐ کے خلاف اہل مکہ سے عہد و پیمان کرے اور جو معاہدہ حضورؐ کے ساتھ تھا اُسے توڑ دے ۔ کعب ابوسفیان کے گھر گیا ۔ ابوسفیان نے اس کا بڑا احترام کیا ۔



باقی یہودی قریش کے مختلف گھروں میں الگ الگ مہمان رہے اہل مکہ میں سے کسی نے کعب سے کہا کہ تم بھی اہل کتاب ہو اور محمدؐ بھی صاحب کتاب ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ شک ہے کہ یہ ایک سازش ہے جو ہمیں ختم کرنے کے لیے کی جا رہی ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہم آپس میں عہد و پیمان کریں تو پہلی شرط یہ ہے کہ ان دو بتوں (دو بڑے بتوں کی طرف اشارہ کیا) کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد کعب نے اہل مکہ سے یہ پیشکش کی کہ تیس افراد تم میں سے اور تیس افراد ہم میں سے خانہ کعبہ کے پاس جائیں اور اپنے شکم خانہ کعبہ کی دیوار سے لگا کر کعبہ کے پروردگار سے عہد کریں کہ ہم محمدؐ سے جنگ کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ غرض یہ پروگرام طے پا گیا۔ آخر میں ابوسفیان نے کعب کی طرف رخ کر کے کہا: تو ایک پڑھا لکھا آدمی ہے اور ہم جاہل اور ان پڑھ ہیں، تیرے خیال میں "ہم" اور "محمدؐ" میں سے کون حق سے زیادہ نزدیک ہے۔

کعب نے کہا: اپنا دین میرے سامنے تفصیل سے بیان کرو۔

ابوسفیان نے کہا: ہم حاجیوں کے لیے بڑے بڑے اونٹوں کی قربانی کرتے ہیں انہیں پانی پلاتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں، قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں، صلۂ رحمی کرتے ہیں۔ اپنے پروردگار کے گھر کو آباد کرتے ہیں۔ اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور ہم سرزمین مکہ میں اللہ کے اہل ہیں لیکن محمدؐ اپنے بزرگوں کے دین سے دست بردار ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے رشتہ داروں سے قطع رحمی کی ہے۔ اور قدیمی دین سے نکل گیا ہے اور محمدؐ کا دین نیا اور نوخیز ہے۔

اس پر کعب نے کہا: خدا کی قسم تمہارا دین محمدؐ کے دین سے بہتر ہے۔

اس وقت مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان باتوں کا جواب دیا گیا۔

تفسیر

سازشی لوگ

پہلی آیت اس شان نزول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے یہودیوں کی ایک اور ناپسندیدہ صفت کی تصویر کشی کرتی ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر گروہ کے ساتھ سازشیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے بت پرستوں کو خوش کرنے کے لیے بتوں کے سامنے سجدہ بھی کر لیا اور جو کچھ انہوں نے عظمت اسلام اور صفات پیغمبرؐ دیکھی اور پڑھی تھیں انہیں نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ بت پرستوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے بے ہودہ اور برائیوں سے معمور مذہب کو اسلام سے بہتر قرار دے دیا باوجودیکہ وہ اہل کتاب تھے اور بت پرستوں کی نسبت اسلام سے ان کے مشترک مسائل کہیں زیادہ تھے۔ اسی لیے آیت بطور تعجب بیان کرتی ہے: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب خدا کا کچھ حصہ رکھنے کے باوجود بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ اظہار ایمان کرتے ہیں (الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یؤمنون بالجبت والطاغوت)۔

اس پر بھی قناعت نہیں کی بلکہ انہوں نے کافروں سے کہا کہ تمہارا راستہ مسلمانوں کی نسبت ہدایت سے زیادہ قریب ہے (ویقولون للذین کفروا ھؤلاء اھدیٰ من الذین اٰمنوا سبیلا)۔



جبت و طاغوت

لفظ "جبت" قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں استعمال ہوا ہے۔ یہ اسم جامد ہے اس کے مشتقات نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ دراصل یہ حبشی زبان کا ایک لفظ ہے جو "جادو" "جادو گر" یا شیطان کے معنی میں ہے۔ پھر یہ عربی زبان میں اگر اس معنی میں یا "بت نیز "خدا" کے علاوہ ہر معبود کے لیے استعمال ہونے لگا کہا جاتا ہے کہ یہ اصل میں "جبس" تھا اس کے بعد اس کی "س" "ت" سے بدل گئی۔
لفظ "طاغوت" قرآن میں آٹھ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اس کی تفسیر پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۶ کی ذیل میں آچکی ہے کہ یہ طغیان کے مادہ سے مبالغہ[1] کا صیغہ حد اور سرحد سے تجاوز کرنے کے معنی میں آتا ہے اور اس کے مفہوم میں ہر ایسی چیز شامل ہے جو حد سے تجاوز کرنے کا سبب بنے جن میں سے بت بھی ہیں۔ اس لیے بتوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔
اس بنا پر شیطان، بت، جابر و متکبر حاکم، خدا کے علاوہ ہر معبود اور ہر وہ راستہ جو غیر حق تک پہنچائے طاغوت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ زیر بحث آیت میں ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو اس بارے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ دو بتوں کے نام ہیں جن کے سامنے مذکورہ داستان میں یہودیوں کے ایک گروہ نے سجدہ کیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ جبت کے معنی بت کے ہیں اور طاغوت کے معنی ہیں بت پرست یا بت کا مددگار جو بتوں سے باتیں کرنے کے نام پر کچھ چیزیں اور باتیں بتوں کی طرف سے نقل کرتے اور جھوٹ موٹ ان کی طرف نسبت دیتے تھے تاکہ لوگوں کو دھوکا دے سکیں[2] جو کچھ شان نزول اور تفسیر میں لکھا گیا ہے یہی مفہوم اس سے مناسبت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بتوں کے سامنے سجدہ کیا اور بت پرستوں کے آگے بھی سر تسلیم خم کیا۔

اس کے بعد کی آیت میں اس قسم کی سازشیں کرنے والوں کا انجام بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خداوند عالم نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور جسے خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے دور کر دے اس کا تمہیں یار و مددگار کہیں نہیں ملے گا (اولئك الذين لعنهم الله ومن يلعن الله فلن تجد له نصيرًا)۔ آیت کے اعلان کے مطابق یہودی اپنی سنگین سازشوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے، آخر کار ناکام ہو کر شکست کھائی اور ان کے بارے میں قرآن کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

مندرجہ بالا آیتیں اگرچہ ایک خاص گروہ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ وہ انہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ وہ ایسے تمام لوگوں کے لیے ہیں جو اپنے گھٹیا مقاصد حاصل کرنے کے لیے اپنی حیثیت و شخصیت بلکہ ایمان و اعتقاد کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اس قسم کی سازشیں کرنے والے دنیا اور آخرت میں رحمت خدا سے دور ہیں اور اکثر و بیشتر انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

---

[1] تفسیر المنار جلد سوم صفحہ ۳۵ اور بعض کے نزدیک یہ مصدر ہے، لیکن صفت اور صیغہ مبالغہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

[2] تفسیر تبیان اور تفسیر روح المعانی۔



یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا ناپسندیدہ جذبہ اس قوم میں ابھی تک شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جس حالت میں بھی ہوں مکاری، فریب کاری اور دھوکا بازی سے منہ نہیں موڑتے۔ اسی وجہ سے وہ گذشتہ طویل تاریخ میں اور آج بھی شکست پر شکست کھا رہے ہیں۔

۵۳۔ اَمۡ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّنَ الۡمُلۡكِ فَاِذًا لَّا يُؤۡتُوۡنَ النَّاسَ نَقِيۡرًا ۝

۵۴۔ اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ۚ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا ۝

۵۵۔ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ‌ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيۡرًا ۝

ترجمہ

۵۳۔ کیا اُن یہودیوں کا حکومت میں کوئی حصّہ ہے (جو وہ چاہتے ہیں کہ اس کا فیصلہ کریں) حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگوں کو ان کا کوئی حق نہ دیتے (اور تمام چیزیں اپنے ہی دائرہ اختیار میں رکھتے)۔

۵۴۔ یا یہ کہ وہ لوگوں کے ساتھ (پیغمبر اور ان کے اہل بیتؑ سے) اس کی وجہ سے جو خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے انہیں مرحمت فرمایا ہے حسد کرتے ہیں۔ (وہ کیوں حسد کرتے ہیں) حالانکہ ہم نے آلِ ابراہیم کو (کہ یہودی بھی اسی خاندان سے ہیں) کتاب و حکمت عطا کی اور انہیں ایک عظیم حکومت عطا کی۔

۵۵۔ ان میں سے ایک جماعت تو اس پر ایمان لے آئی لیکن ایک گروہ نے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر دی اور جہنم کی آگ کا بھڑکتا شعلہ ان کے لیے کافی ہے۔

تفسیر

گذشتہ دو آیتوں کی تفسیر میں لکھا جا چکا ہے کہ یہودیوں نے مکہ کے بت پرستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ گواہی دی کہ قریش کی بت پرستی مسلمانوں کی خدا پرستی سے بہتر ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود بتوں کے آگے ماتھا رگڑا۔ اس آیت میں اس نکتہ کی یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ دو دلیلوں کی وجہ سے ان کا فیصلہ کوئی حیثیت اور قیمت نہیں رکھتا۔

۱۔ وہ معاشرے میں ایسی حیثیت، مرتبہ اور قدر و قیمت نہیں رکھتے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکیں۔ انہوں نے کبھی حکومت یا



انصاف کی خدمت انہیں نہیں سونپی گروہ اس کام کی طرف قدم بڑھا سکیں (ام لھم نصیب من الملک)۔ اس کے علاوہ وہ کوئی مادی، روحانی، معنوی اور باطنی طور پر لوگوں پر حکومت کرنے کی لیاقت و قابلیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان میں دوسروں پر بھروسہ کرنے کی روح ہی نہیں۔ اگر انہیں یہ حیثیت مل بھی جائے تو وہ کسی شخص کو کوئی حق دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے بلکہ تمام اختیارات اور خصائص اپنے ساتھ مخصوص کر لیں گے (فاذاً لایؤتون الناس نقیرا)[1] اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہودیوں کا جذبہ انصاف ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ یا تو اپنے حق میں فیصلہ دیتے ہیں یا پھر ان کے حق میں جو ان کی راہ پر گامزن ہوں، اس لیے مسلمان کبھی اس قسم کی باتوں سے پریشان نہ ہوں۔

۲۔ اس قسم کے غلط فیصلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے حسد کی بنا پر ہیں۔ اس وجہ سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ وہ کفرانِ نعمت اور ظلم و ستم کی وجہ سے مقام نبوت و حکومت اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں۔ اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ یہ الٰہی منصب کسی کے سپرد کیا جائے۔ اس لیے وہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے خاندان سے جنہیں اس نعمت الٰہی سے نوازا گیا ہے حسد کرتے ہیں اور اس قسم کے بے بنیاد فیصلوں سے اپنی حسد کی آگ پر پانی چھڑکتے ہیں (ام یحسدون الناس علی ما اٰتٰھم اللہ من فضلہ)۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور خاندان بنی ہاشم کو یہ منصب ملنے پر کیوں تعجب کرتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں اور حسد کرتے ہیں جبکہ خداوند عالم نے آلِ ابراہیم کو آسمانی کتاب، حکمت و دانش اور وسیع حکومت (حضرت موسیٰؑ، سلیمانؑ اور داؤدؑ کی) دی۔ لیکن افسوس کہ تم ناخلف لوگوں نے وہ قیمتی معنوی اور مادی سرمائے شرارت اور قساوت و بے رحمی کے ہاتھوں ضائع کر دیئے (فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب و الحکمۃ و اٰتینٰھم ملکاً عظیماً)۔

جو کچھ ہم تحریر کر چکے ہیں اس سے واضح ہو گیا ہے کہ "ام یحسدون الناس" میں "ناس" سے مراد پیغمبر اکرمؐ اور ان کا خاندان ہے۔ کیونکہ ناس کے معنی ہیں "لوگوں کی ایک جماعت" اور اس کا اطلاق صرف ایک شخص (پیغمبر اسلامؐ) پر جب تک کوئی قرینہ موجود نہ ہو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ "ناس" اسم جمع ہے اور جمع کی ضمیر جو اس آیت میں اس لفظ کی طرف پلٹ رہی ہے وہ بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ آلِ ابراہیم (ابراہیم کا خاندان) دوسرا قرینہ ہے کہ "ناس" سے مراد حضرت رسول اکرمؐ اور آپؐ کے اہل بیتؑ ہیں۔ کیونکہ قرینہ مقابلہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ہم نے خاندان بنی ہاشم کو اس قسم کی عظمت و برتری دی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کو اس کی لیاقت کی بنا پر معنوی اور مادی مرتبہ اور حیثیت بخش چکے ہیں۔

بہت سی روایتیں جو اہل سنت اور شیعہ کتب میں آئی ہیں ان میں یہ وضاحت موجود ہے کہ "ناس" سے مراد خاندانِ پیغمبرؐ ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان میں رسول، انبیاء اور پیشوا بنائے ہیں (اس کے بعد خداوند عالم یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے) تم اس کا تو اعتراف کرتے ہو لیکن آلِ محمدؐ کے بارے میں انکار

---

[1] نقیر مادہ نقر (بروزن فقر) سے ہے اس کا مطلب ہے کسی چیز کو اس قدر کوٹنا کہ آخر کار اس میں گڑھا اور سوراخ ہو جائے اور منقار (چونچ) کو بھی اسی لیے منقار کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نقیر بہت چھوٹا سا گودا ہوتا ہے جو کھجور کی پشت پر دکھائی دیتا ہے اور زیادہ تر بہت ہی چھوٹی چیزوں کے لیے کنایہ ہے۔



کرتے ہوئے[1]

دوسری حدیث میں ہے کہ اس آیت کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق ؑ سے سوال کیا گیا تو آپ ؑ نے فرمایا:

نحن المحسودون

ہم ہیں کہ جن پر دشمنوں نے حسد کیا[2]

تفسیر درمنثور نے ابن منذر سے اور طبرانی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ اس آیت کے بارے میں کہتے تھے:

اس آیت میں "ناس" سے مراد ہم ہیں نہ کہ اور لوگ۔

اس کے بعد قرآن اگلی آیت میں فرماتا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کا ایک گروہ اس آسمانی کتاب پر ایمان لایا جو حضرت ابراہیم ؑ پر نازل ہوئی تھی اور کچھ لوگ نہ صرف یہ کہ وہ ایمان نہیں لائے بلکہ وہ اس کی تبلیغ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ ان کے لیے جہنم کی آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ کافی ہے (فمنھم من امن بہ ومنھم من صد عنہ وکفی بجھنم سعیرا)۔ اسی طرح اس کتاب آسمانی سے جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ بھی اسی عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

حاسدانہ جرائم

حسد جسے فارسی زبان میں رشک کہتے ہیں اس کے معنی دوسروں کی نعمت کا زوال ہے، چاہے وہ نعمت حسد کرنے والے کو ملے نہ ملے۔ اس بنا پر حاسد کی آرزو اور خواہش کا مرکز ویران کرنا اور ویران ہونا ہی ہے نہ یہ کہ وہ سرمایہ یا نعمت اُسے مل جائے۔

۱۔ حاسد اپنی تمام یا زیادہ تر بدنی و فکری طاقتوں کو جنہیں اجتماعی اور معاشرتی مقاصد اور اغراض میں صرف ہونا چاہیے جو کچھ موجود ہے اسے نابود اور ویران کرنے کے لیے خرچ کر دیتا ہے۔ اس طرح اپنے وجود اور معاشرے کو تباہ و برباد کرتا ہے۔

۲۔ حسد دنیا کے بہت سے فسادات کی جڑ ہے۔ اگر قتل، چوری، ظلم و ستم اور زیادتیوں کے اصل اسباب و وجوہات کا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے ایک بڑے حصے کی علت اور بنیاد حسد ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُسے آگ کی چنگاری سے تشبیہ دی گئی ہے جو حسد کرنے والے کے وجود یا اس معاشرے کو جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے خطرے میں ڈال دے۔ ایک عالم کا قول ہے کہ حسد اور بدخواہی سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے اُسے سعادت اور نیک بختی کا بدترین دشمن سمجھنا چاہیے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایسے درس اور ادارے جن کی بنیاد حاسد اور متعصب لوگ رکھتے ہیں وہ پس ماندہ ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حاسد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو پیچھے دھکیل دے اور یہ چیز روح ترقی و کمال کے خلاف ہے۔

۳۔ ان سب باتوں کے علاوہ حسد جسم انسانی پر مضر اثرات ڈالتا ہے۔ عام طور پر حسد کرنے والے رنجیدہ دل اور اعصاب اور دوسرے مختلف اعضائے رئیسہ کے لحاظ سے زیادہ تر دکھ درد اور بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کیونکہ آج یہ حقیقت تسلیم شدہ ہے کہ جسمانی بیماریوں کے اکثر نفسیاتی اسباب و عوامل ہوتے ہیں اور دور حاضر کی ڈاکٹری میں تفصیلی مباحث روح جسمانی کی بیماریوں

---

[1] و [2] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۳۷۶ اور تفسیر روح المعانی میں بھی اسی مضمون کی ایک حدیث منقول ہے۔ (روح المعانی جلد پنجم صفحہ ۵۲)۔



کے عنوان سے نظر آتی ہیں جو اس قسم کی بیماریوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ رہبرانِ اسلام سے مروی روایات میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ ایک روایت میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

صحة الجسد من قلة الحسد

تندرستی حسد کی کمی کی وجہ سے ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

العجب لغفلة الحساد عن سلامة الاجساد.

تعجب ہے کہ حسد کرنے والے اپنے جسم کی سلامتی سے بالکل غافل ہیں۔

یہاں تک کہ بعض احادیث میں ہے کہ حسد محسود کو نقصان پہنچانے سے پہلے حاسد کو نقصان پہنچاتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے مار ڈالتا ہے۔

۴۔ حسد باطنی اور روحانی طور پر وسعت قلب و نظر کی کمی، نادانی، ایمان کی کمزوری، کوتاہ فکری اور نقص کی نشانی ہے۔ کیونکہ حاسد دراصل اپنے آپ کو محسود کے مرتبہ تک پہنچنے سے عاجز پاتا ہے۔ اس لیے وہ محسود کو پیچھے دھکیلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ عملی طور پر خداوند عالم کی حکمت پر جو ان نعمتوں کا اصل سرچشمہ ہے، اعتراض کرتا ہے اور خداوند عالم کی طرف سے نعمتیں پانے والوں پر انگلیاں اٹھاتا ہے۔ اسی لیے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

الحسد اصله من عمى القلب و الجحود لفضل الله تعالى وهما جناحان للكفر و بالحسد وقع ابن آدم فى حسرة الابد وهلك مهلكا لا ينجو منه ابدًا

حسد اور بدخواہی دل کی تاریکی اور اندھا پن ہے اور اس کا سرچشمہ خدا کی نعمتوں کا انکار ہے اور یہ دونوں (دل کا اندھا پن اور خدا کی بخشش پر اعتراض) کفر کے دو پر ہیں۔ حسد کے سبب سے فرزند آدم ہمیشہ کی حسرت میں ڈوب گیا اور ایسی ہلاکت میں گرا ہے جس سے ہرگز رہائی حاصل نہیں کر سکتا[1]

خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے:

سب سے پہلا قتل جو روئے زمین پر ہوا اس کا سبب حسد تھا[2]

حضرت امیر المومنین علیؑ سے نہج البلاغہ میں منقول ہے:

ان الحسد يأكل الايمان كما تأكل النار الحطب

حسد ایمان کو آہستہ آہستہ اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ دھیرے دھیرے لکڑیوں کو کھا جاتی ہے[3]

---

[1] مستدرک الوسائل جلد ۲ صفحہ ۳۲۷۔

[2] مائدہ - ۲۷۔

[3] نہج البلاغہ خطبہ ۸۶۔



کیونکہ حسد کرنے والے کی خدا کی حکمت اور عدالت سے بدگمانی آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور یہی بدگمانی ہے جو اُسے ایمان کی وادی سے نکال کر جہنم کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ حسد کے بہت سے روحانی، مادی، انفرادی اور اجتماعی نقصانات ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے یہ دراصل ان کی ایک فہرست ہے۔

۵۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

۵۷۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَھُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝

ترجمہ

۵۶ وہ لوگ جو ہماری آیتوں کا انکار کرتے ہیں عنقریب ہم انہیں آگ میں ڈال دیں گے۔ جب ان کی جلد جل جائے گی ہم انہیں دوسری جلدیں دیں گے تاکہ وہ سزا کا مزہ چکھتے رہیں۔ خدا توانا اور حکیم ہے (وہ گناہوں کے مطابق سزا دے گا)۔

۵۷ اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ عنقریب باغاتِ بہشت میں داخل ہوں گے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور انہیں ایسے گھنے سایوں میں لے جائیں گے جو منقطع نہ ہوں گے۔

تفسیر

گذشتہ آیتوں کے بعد ان دو آیتوں میں ایماندار اور بے ایمان کے انجام کی وضاحت کی گئی ہے۔ پہلی آیت اعلان کرتی ہے کہ ہم کافروں کو آگ میں ڈالیں گے اور جس وقت ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو دوسری کھال اگا دیں گے تاکہ وہ خداوند عالم کی سزا کا دیر تک مزا چکھیں (ان الذین کفروا بآیاتنا سوف نصلیھم نارا کلما نضجت جلودھم بدلنا ھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب)[1]۔

[1] نصلیھم "صلی" کے مادہ سے آگ میں ڈالنے اور آگ میں جلنے یا آگ سے گرم ہونے کے معنی میں ہے۔ "نضجت" "نضج" کے مادے سے پکن جانے کے معنی میں ہے۔



کھال کے تبدیل ہونے کا سبب بظاہر یہ ہے کہ ممکن ہے جلد کے جل جانے کے بعد درد کم محسوس ہو۔ مگر اس وجہ سے تاکہ سزا میں تخفیف نہ ہو بلکہ وہ پورے زور پر ہے اس کے جسم پر نئی جلد چڑھا دی جائے گی ۔ یہ حق و عدالت کو پاؤں تلے روندنے اور خدا کے حکم سے منہ موڑنے پر اصرار کا نتیجہ ہے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: خدا اس قسم کی سزا دینے پر قادر و توانا ہے اور صاحبِ حکمت بھی ہے وہ حساب کے مطابق سزا دیتا ہے (ان اللہ کان عزیزًا حکیمًا)۔

اس کے بعد میں آنے والی آیت میں ان افراد کو جو ایمان اور عمل صالح رکھنے والے ہیں وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں بہت جلد جنت کے ان باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گا جہاں ایک ابدی اور جاودانی زندگی ہوگی۔ اس کے علاوہ انہیں پاک بیویاں دی جائیں گی جو ان کی روح اور جسم کی تسکین اور آرام کا سبب ہوں گی اور وہ ایسے درختوں کے سائے میں زندگی بسر کریں گے جو اس دنیا کی وقتی چھاؤں کے خلاف ہمیشہ رہنے والے سائے ہوں گے ۔ وہاں کبھی گرمی کی لو اور سردی کی ہوا کا گزر نہ ہوگا (والذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سندخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھآ ابدًا لھم فیھآ ازواج مطھرۃ وندخلھم ظلًّا ظلیلًا)[1]۔

یہ نکتہ لائق توجہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ اور موازنہ کرنے سے رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کی جہت کا اس کے غضب سے بڑھ چڑھ کر ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلی آیت میں کفار کو سزا دینے کا وعدہ کرنے کے لیے لفظ "سوف" کا ذکر فرمایا ہے جبکہ دوسری آیت میں ایماندار افراد کے لیے "س" کے لفظ سے (سندخلھم) جزا کا وعدہ کیا ہے۔ عربی ادب میں ہے کہ "سوف" عام طور پر مستقبل بعید کے لیے اور "س" مستقبل قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ دونوں آیتیں قیامت کے دن سے متعلق ہیں اور اس دنیا میں بدکاروں کی سزا اور نیکوں کی جزا ہماری نسبت فاصلۂ زمانی کے لحاظ سے یکساں ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ خدا کی رحمت کی سرعت و وسعت اور غضب کی دوری اور اس کی حدبندی کی طرف اشارہ ہو جائے اور یہ اس کی مانند ہے جیسے ہم دعاؤں میں پڑھتے ہیں:

یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اے وہ ذات اقدس جس کی رحمت اس کے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ آیاتِ مندرجہ بالا کہتی ہیں کہ جس وقت بدکاروں کی جلد جلے گی تو ہم اس کی جگہ دوسری جلد دے دیں گے تاکہ وہ سزائے الٰہی میں گرفتار رہیں۔ گنہگار جلد کی بجائے بے گناہ نئی جلد کو سزا دینا عدالت خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔

مشہور و معروف مادہ پرست ابن ابی العوجاء نے جو حضرت امام جعفر صادقؑ کا ہم عصر تھا بالکل یہی سوال آپؑ سے کیا تھا اور

---

[1] ظلیل مادہ "ظل" سے سایہ کے معنی میں ہے اور یہاں تاکید کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ ظل ظلیل گھنے سائے کے معنی دیتا ہے اور یہ کنایہ ہے ہمیشہ رہنے والے خوشگوار گھنے سائے کے لیے۔



آیت مندرجہ بالا پڑھ کر کہا تھا:

ما ذنب الغیر

نئی جلد اور کھال کا کیا قصور ہے۔

حضرت امام صادقؑ نے اُسے مختصر لیکن پُرمعانی جواب دیا فرمایا:

ھی ھی وھی غیرھا

یعنی نئی جلد وہی پرانی جلد ہے باوجود اس کے کہ اس کی بجائے ہے۔

ابن ابی العوجا رجانتا تھا کہ اس مختصر سی عبارت میں کوئی راز پوشیدہ ہے۔ اس لیے کہنے لگا۔

مثل لی فی ذٰلک شیئا من امر الدنیا

اس سلسلے میں میرے لیے کوئی مثال دیجئے۔

امام نے فرمایا:

ارءیت لو ان رجلا اخذ لبنة فکسرھا ثم ردھا فی ملبنھا فھی ھی و ھی غیرھا

یہ اس طرح ہے کہ ایک شخص اینٹ کو توڑتا ہے اور ریزہ ریزہ کرکے دوبارہ سانچے میں ڈال دیتا ہے اور نئی اینٹ بناتا ہے۔ تو یہ دوسری اینٹ وہی پہلی اینٹ ہے باوجود اس کے کہ نئی اینٹ بھی ہے (اس کا اصلی مادہ محفوظ ہے صرف اس کی شکل بدل گئی ہے)۔ [۵]

اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئی جلد اُسی پرانی جلد سے تیار ہوگی۔ ضمناً یاد رکھیے کہ حقیقت میں سزا و جزا انسان کی روح اور قوتِ ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔ جسم تو صرف سزا و جزا کو روح کی طرف منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۵۸۔ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ○

ترجمہ

۵۸ خداوند عالم تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔ خدا تمہیں اچھی نصیحت اور وعظ کرتا ہے۔ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

---

۵ مجالس شیخ و احتجاج طبرسی۔



شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان اور دوسری اسلامی تفسیروں میں ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت پیغمبر اکرمؐ فتح مبین کے ساتھ شہر مکہ میں داخل ہوئے اور عثمان بن طلحہ کو جو خانہ کعبہ کا کلید بردار تھا طلب فرمایا اور اس سے چابی لی تاکہ خانۂ خدا کو بتوں سے پاک وصاف کریں۔ حضرت عباس نے جو حضرت رسولِ اکرمؐ کے چچا تھے، اس کام سے فراغت پانے کے بعد تقاضا کیا کہ خدا کے گھر کی چابی انہیں دے کر بیت اللہ کی کلید برداری کا منصب ان کے سپرد کر دیں۔ یہ منصب عربوں میں ایک بلند و بالا مرتبہ تھا گویا عباس چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے کے اجتماعی اور سیاسی اثر و رسوخ سے ذاتی نفع حاصل کریں، لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس تقاضا کے خلاف خانۂ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کرنے کے بعد کعبہ کا دروازہ بند کر کے یہ آیت تلاوت فرماتے ہوئے: ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا[1] چابی عثمان بن طلحہ ہی کو دے دی۔

تفسیر

دو اہم اسلامی قانون

زیرِ نظر آیت اگرچہ بہت سی دوسری آیتوں کی طرح خاص موقع اور محل پر نازل ہوئی ہے لیکن واضح ہے کہ اس سے ایک عام حکم کا پتہ چلتا ہے آیت تفصیل سے بتاتی ہے کہ خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو دے دو۔ واضح ہے کہ یہاں امانت کا لفظ ایک وسیع معنی میں ہے اور وہ ہر قسم کی مادی اور روحانی چیزوں اور امور پر محیط ہے ہر مسلمان اس آیت کے مطابق ذمہ دار ہے کہ کسی کی امانت میں (کسی استثناء کے بغیر) خیانت نہ کرے۔ صاحبِ امانت مسلمان ہو کہ غیر مسلم اور یہ حقیقت میں اسلام میں حقوقِ انسانی کا اعلان ہے جس میں تمام انسان برابر ہیں۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا شانِ نزول میں امانت صرف ایک مادی امانت نہیں تھی اور دوسرا فریق مشرک تھا۔

آیت کے دوسرے حصے میں ایک اور اہم قانون کی طرف اشارہ ہے اور وہ ہے حکومت اور قضاوت میں عدالت آیت خبردار کرتی ہے کہ خدا نے تمہیں یہ بھی حکم دیا ہے کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت کے مطابق حکم دو (واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل) اس کے بعد ان دونوں احکام کی تاکید کے طور پر فرماتا ہے: خدا تمہیں بہترین وعظ و نصیحت کرتا ہے (ان اللہ نعما یعظکم بہ) پھر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہر حالت میں خدا تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔ وہ تمہاری باتوں کو بھی سنتا ہے اور تمہارے کاموں کو بھی دیکھتا ہے (ان اللہ کان سمیعًا بصیرًا) یہ قانون بھی کلی اور عمومی ہے اور

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی اس لیے وہ مندرجہ بالا شانِ نزول کو صحیح نہیں مانتے تاہم چاہے یہ شانِ نزول درست ہو یا نہ ہو اس اہم قانون پر جو آیت سے نکلتا ہے کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔



ہر قسم کی قضاوت اور فیصلہ پر حاوی ہے۔ چاہے وہ بڑے امور سے تعلق رکھتا ہو یا چھوٹوں سے۔ یہاں تک اسلامی احادیث میں مرقوم ہے کہ ایک دن دو چھوٹے چھوٹے بچوں نے تحریر لکھی تھی اور وہ دونوں اپنا فیصلہ کرانے کے لیے حضرت امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت علیؑ نے جو اس معاملے کو دیکھ رہے تھے اپنے فرزند ارجمند سے فرمایا:

یا بنی انظر کیف تحکم فان ھذا حکم واللہ سائلك عنه یوم القیمة

میرے نورِ نظر خوب غور کر کو کیا فیصلہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی قضاوت ہے اور خدا قیامت کے دن تجھ سے اس کے بارے میں سوال کرے گا۔[1]

یہ دونوں اہم اسلامی قانون یعنی حفظِ امانت اور قضاوت میں عدالت ایک پاکیزہ انسانی معاشرے کا سنگِ میل ہیں۔ کوئی معاشرہ چاہے وہ مادی ہو کر روحانی ان ہر دو اصولوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر منظم نہیں ہو سکتا۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اموال ثروت، دفاتر کی ذمہ داریاں، انسانی سرمائے، ثقافتی اور تاریخی دستاویزات، میراث اور ترکہ سب خدائی امانتیں ہیں۔ جو معاشرے کے مختلف افراد کے سپرد ہوتی ہیں اور سب کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اپنی امانتوں کی حفاظت کریں۔ انہیں ان کے اصلی مالکوں کو دینے کی کوشش کریں اور ان میں کسی طرح خیانت نہ کریں۔

دوسرا یہ کہ ہمیشہ معاشروں میں اختلاف، تضاد اور خواہشات کا ٹکراؤ پایا جاتا ہے عادلانہ قضاوت کے ذریعے اس کا حل اور فیصلہ کرنا چاہیے تاکہ سوسائٹی اور سماج سے گروہ بندی، بے جا امتیازات اور ظلم و ستم ختم ہو جائے۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں امانت صرف ان اموال تک محدود نہیں جن کو لوگ ایک دوسرے کے سپرد کرتے ہیں۔ بلکہ علماء اور دانش مند بھی معاشرے کے امانتدار ہیں۔ جن کا یہ فریضہ ہے کہ وہ حقائق کو نہ چھپائیں یہاں تک کہ اولاد بھی انسان کے پاس خدا کی امانت ہے۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی کی جائے تو یہ بھی امانت میں خیانت ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا اپنا وجود اور ہستی اور وہ صلاحیتیں اور قابلیتیں جو خدا نے اُسے مرحمت فرمائی ہیں سب خداوند عالم کی امانتیں ہیں، جن کے بارے میں انسان ذمہ دار ہے کہ ان کی حفاظت کی کوشش کرے۔ جسم و روح کی استعداد، جوانی کی طاقت اور فکری صلاحیت کی حفاظت میں بھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے اسی لیے تو انسان خودکشی تو کیا اپنے آپ کو کسی قسم کا ضرر بھی نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں تک کہ بعض اسلامی احادیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسرار و علوم اور امامت کی امانتیں جنہیں ہر امام آنے والے امام کے سپرد کرتا ہے، وہ بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔[2]

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں امانت کی ادائیگی کو عدالت پر مقدم رکھا گیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ مسئلہ عدالت ہمیشہ فیصلہ میں خیانت کے موقع پر ضروری ہوتا ہے کیونکہ اصل اور بنیاد یہ ہے کہ سب لوگ امین ہوں لیکن اگر ایک فرد یا کئی افراد اس سے روگردانی کریں تو عدالت کی نوبت آتی ہے کہ انہیں ان کے فریضہ سے آشنا کیا جائے۔

---

[1] مجمع البیان جلد سوم صفحہ ٦٤۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ٤٩٦۔



اسلام میں امانت اور عدالت کی اہمیت

اسلامی کتب اور مصادر میں امانت اور عدالت کے بارے میں اتنی تاکید کی گئی ہے جو باقی احکام میں بہت کم نظر آتی ہے ذیل کی چند حدیثیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں ۔

۱ ۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا :

لا تنظروا الی طول رکوع الرجل و سجوده فان ذٰلك شیء اعتاده فلو ترك استوحش ولکن انظروا الی صدق حدیثه واداء امانته

کسی شخص کے صرف طویل رکوع و سجود کو نہ دیکھو ۔ کیونکہ ہوسکتا ہے وہ اس کا عادی ہو چکا ہو اور اب اُسے چھوڑنے سے اُسے وحشت ہوتی ہو البتہ بات میں اس کی سچائی اور اس کی امانت کی ادائیگی کی طرف دیکھو[1]

۲ ۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ ہی سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام نے جو مرتبہ اور مقام پیغمبر اسلامؐ کے ہاں پایا وہ بات میں سچائی اور امانت کی ادائیگی کی وجہ سے تھا[2]

۳ ۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے ایک ماننے والے سے فرمایا :

ان ضارب علی بالسیف وقاتله لو ائتمنی واستنصحنی واستشارنی ثم قبلت ذٰلك منه لادیت الیه الامانة ۔[3]

اگر حضرت امیرالمومنین علیؑ کا قاتل میرے پاس کوئی امانت رکھتا یا مجھ سے نصیحت طلب کرتا یا مجھ سے مشورہ لیتا اور میں ان امور کے لیے تیار ہو جاتا ، تو میں یقیناً حق امانت ادا کرتا ۔

۴ ۔ جو روایات شیعہ و سنی کتب میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہیں ان میں آپؐ کا یہ روشن اور عظیم فرمان بھی ہے :

اٰیة المنافق ثلاث اذا حدث کذب واذا وعد اخلف و اذا ائتمن خان

منافق کی تین نشانیاں ہیں ۱۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے ۲۔ جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور ۳۔ جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے[4]

۵ ۔ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا :

جب لڑائی جھگڑے کے طرفین تمہارے پاس آئیں تو ان کی طرف دیکھنے اور ان سے گفتگو کی مقدار اور کیفیت میں مساوات اور عدالت کو پیش نظر رکھو ۔

حدیث کی عربی عبارت یوں ہے : سوبین الخصمین فی لحظك و لفظك[5]

---

[1] ، [2] ، [3] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۹۶ ۔

[4] صحیح ترمذی و نسائی بحوالہ المنار ۔ یہی مضمون سفینۃ البحار میں ہے ۔

[5] مجمع البیان جلد سوم صفحہ ۶۴ ۔



۵۹۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ؏

ترجمہ

۵۹ اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو اور جب کسی چیز میں جھگڑو تو اگر خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے خدا اور پیغمبر کی طرف لوٹا دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام و اختتام بہت اچھا ہے۔

تفسیر

یہ آیت اور بعد کی چند آیتیں ایک اہم ترین اسلامی مسئلے یعنی مسئلہ رہبری کے بارے میں بحث کر رہی ہیں اور مسلمانوں کے مختلف دینی اور اجتماعی مسائل میں حقیقی مراجع (جن کی طرف رجوع کیا جائے) کو مشخص اور متعین کرتی ہیں سب سے پہلے ایمانداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خداوند عالم کی اطاعت کریں اور یہ بات روشن ہے کہ ایک ایماندار شخص پر واجب ہے کہ اس کی تمام اطاعتوں کی انتہا خداوند عالم کی اطاعت پر ہو اور اس کے حکم کے مطابق ہر قسم کی رہبری کا سرچشمہ اس کی ذات گرامی ہو۔ کیونکہ جہانِ ہستی کا مالک تکوینی اور حاکم اعلیٰ وہی ہے۔ اس لیے ہر قسم کی حاکمیت، مالکیت اسی کے فرمان کے مطابق ہونا چاہیے (یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ)۔

دوسرے مرحلے میں پیغمبر اکرمؐ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ رسولؐ جو معصوم ہے اور کبھی ہوا و ہوس سے بات نہیں کرتا۔ پیغمبرؐ جو لوگوں میں خدائی نمائندہ ہے جس کی بات خدا کی بات ہے، اُسے یہ مرتبہ یہ بلند مقام خداوند عالم نے مرحمت فرمایا ہے اس وجہ سے کہ خدا کی اطاعت تو اس کی ذات کی خالقیت وحاکمیت کی بنا پر ہے لیکن حضورؐ کی اطاعت فرمانِ پروردگار کی وجہ سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا بالذات واجب الاطاعت ہے اور پیغمبرؐ بالغیر واجب الاطاعت ہیں۔ شاید آیت میں اطیعوا کا تکرار اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دونوں اطاعتوں میں یہ فرق ہے (واطیعوا الرسول)۔

تیسرے مرحلے میں اولوا الامر کی اطاعت کا حکم ہے جو اسلامی معاشرے میں سے ہو اور لوگوں کے دین و دنیا کی حفاظت کرے۔

اولوا الامر کون ہیں؟

اس بارے میں مفسرین اسلام میں بہت اختلاف ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے:



۱ - اہل سنت کے کچھ مفسرین کا نظریہ ہے کہ اولوالامر سے مراد ہر زمانے اور ہر ماحول سے تعلق رکھنے والے بادشاہ اور صاحبان اقتدار ہیں۔ وہ اس میں کسی استثنا کے قائل نہیں ہیں۔ اس نظریے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر حکومت کی چاہے وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو پیروی کریں۔ چاہے وہ تاتاریوں کی حکومت کیوں نہ ہو۔

۲ - بعض دوسرے مفسرین مثلاً صاحب تفسیر المنار و صاحب تفسیر ظلال القرآن وغیرہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد عام طبقات کے نمائندے، سربراہ، حکام، علماء اور کوائفِ زندگی کے تمام عہدہ دار ہیں لیکن مطلق طور پر نہیں اور کسی شرط، قید اور پابندی کے بغیر نہیں بلکہ ان کی اطاعت کے لیے یہ پابندی اور شرط ہے کہ ان کے احکام اسلام کے مقرر کردہ احکام کے خلاف نہ ہوں۔

۳ - بعض دوسرے مفسرین کا اعتقاد ہے کہ اولوالامر سے مراد وہ معنوی اور فکری رہنما یعنی علماء ہیں جو عادل ہوں اور کتاب و سنت سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں۔

۴ - بعض اہلِ سنت کے مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اس لفظ سے مراد پہلے چار خلفاء ہیں اور یہ لفظ انہی تک محدود ہے اس وجہ سے دوسرے زمانوں میں اولوالامر نہ ہوگا۔

۵ - بعض مفسرین اولوالامر سے مراد اصحاب پیغمبر لیتے ہیں۔

۶ - اولوالامر کی تفسیر میں ایک اور احتمال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اسلامی لشکروں کے سپہ سالار ہیں۔

۷ - تمام شیعہ مفسرین اس سلسلے میں ایک متفق نظریہ رکھتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد ائمہ معصومین ہیں۔ جن کو تمام امورِ زندگی میں اسلامی معاشرے کی مادی اور روحانی رہنمائی خدا اور پیغمبر کی طرف سے سپرد کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ یہ لفظ کسی پر صادق نہیں آتا۔ البتہ ایسے لوگ جو ان کی طرف سے کسی مرتبے یا عہدے کے لیے مقرر کیے جائیں اور اسلامی معاشرے کے کسی عہدہ پر فائز ہوں تو معینہ شرائط کے ساتھ ان کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ اولوالامر ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اولوالامر کے نمائندے ہیں۔ اب مندرجہ بالا تفاسیر کی تحقیق اور مطالعے کے لیے پوری تن دہی سے توجہ دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پہلی تفسیر کسی طرح بھی مفہوم آیت اور تعلیمات اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتی ممکن نہیں ہے ہر حکومت کی اطاعت و پیروی کسی قید و شرط کے بغیر خدا و رسول کی اطاعت کے ساتھ ملا دی جائے۔ اسی بنا پر شیعہ مفسرین کے علاوہ اہلِ سنت کے بڑے بڑے مفسرین نے بھی اس کی نفی کی ہے۔

دوسری تفسیر بھی آیت کے معانی و مفہوم کے ساتھ سازگار نہیں کیونکہ آیت اولوالامر کی اطاعت کو بغیر کسی قید و شرط کے لازم اور واجب قرار دیتی ہے۔

تیسری تفسیر یعنی اولوالامر کی تفسیر کتاب و سنت سے آگاہ علماءِ عادل کے ساتھ کرنا بھی آیت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ علماء کی اطاعت بھی کچھ شرائط سے مشروط ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی بات کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ اس وجہ سے اگر وہ اشتباہ میں پڑ جائیں (چونکہ وہ معصوم نہیں ہیں اس لیے انہیں اشتباہ ہو سکتا ہے) یا اور کسی وجہ سے حق سے منہ موڑ لیں تو



اس صورت میں ان کی اطاعت ضروری نہیں ہوگی جبکہ آیت اولوا الامر کی اطاعت مطلق اطاعتِ پیغمبر کی طرح لازم قرار دے رہی ہے علاوہ ازیں علماء کی اطاعت تو ان احکام میں ہے جن کا وہ کتاب وسنت سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی اطاعت خدا تعالیٰ اور پیغمبرؐ کی اطاعت کے علاوہ اور کچھ نہیں اس لیے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

چوتھی تفسیر اولوا الامر (کو پہلے چار خلفاء تک محدود کردینا) تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ آج دنیائے اسلام میں لفظ اولوا الامر کا کوئی مصداق نہیں ہے علاوہ ازیں اس تخصیص کے بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

پانچویں اور چھٹی تفسیر میں اس کو صحابہ یا افسرانِ لشکر کے ساتھ مخصوص کرنا، اس پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

اہلِ سنت کے بعض مفسرین جیسے مصر کے مشہور عالم محمد عبدہ اور معروف مفسر فخرالدین کی بعض باتوں کے مطابق اولوا الامر کے معنیٰ میں جنہیں دوسرے نمبر پر بیان کیا گیا ہے۔ ان کی نظر میں اس کے مجموعی مفہوم میں اسلامی معاشرے کے مختلف طبقوں کے نمائندے وہ عالم ہوں یا حاکم اور دوسرے طبقوں کے نمائندے شامل ہیں۔ وہ انہیں کچھ شرطوں اور پابندیوں کے ساتھ اولوا الامر مانتے ہیں اور ان شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ جیسا کہ "منکم" سے معلوم ہوتا ہے، ان کا حکم کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو، وہ اپنے اختیار سے حکم دیں نہ کہ مجبوری سے، وہ مسلمانوں کے مصالح کے مطابق حکم دیں اور صرف انہی مسائل کا حکم دے سکتے ہیں جن میں دخالت کا انہیں حق ہے نہ کہ عبادات اور ان چیزوں کا جو کہ اسلام نے مقرر اور معین کردی ہیں۔ وہ اس مسئلہ کا حکم دینے کا حق رکھتے ہیں جس کے بارے میں نص شرعی نہ ہو ان سب چیزوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سب متفقہ طور پر اپنا نظریہ پیش کریں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تمام امت یا ان کے سب نمائندے مل کر غلطی نہیں کرسکتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ امت اجتماعی طور پر معصوم ہے۔ ان شرطوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قسم کے حکم کی اطاعت مطلق طور پر ہر قسم کی پابندی کے بغیر رسول اکرمؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہوگی (اس گفتگو کا نچوڑ یہ ہے کہ اجماعِ امت حجت ہے) لیکن غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر میں بھی کئی اشکالات موجود ہیں، کیونکہ اوّل تو اجتماعی مسائل میں فکر ونظر کا اتفاق بہت ہی کم مواقع پر ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے زیادہ تر حالات و واقعات میں ہمیشہ بے چینی اور بے اطمینانی رہے گی۔ اگر وہ اکثریت کے نظریہ کو قبول بھی کرنا چاہیں تو پھر یہ اشکال سامنے آئے گا کہ اکثریت کبھی معصوم نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی اطاعت مطلق ہونے کی حیثیت سے لازمی نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم اصول میں یہ امر ثابت ہوچکا ہے کہ امام معصوم کو نکال کر تمام امت کے معصوم ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس تفسیر کے طرفداروں نے ایک شرط کا ذکر کیا ہے جو یہ ہے کہ ان کا حکم کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بات کی تشخیص کہ یہ حکم کتاب وسنت کے مطابق ہے کہ مخالف، کون کرے گا یقیناً مجتہدین اور کتاب وسنت سے آگاہ علماء ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ تو اس تحریر کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجتہدین اور علماء کی اجازت کے بغیر اولوا الامر کی اطاعت جائز نہیں کیونکہ اہلِ علم کی اطاعت تو اولوا الامر کی اطاعت سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے اور یہ مفہوم ظاہر بظاہر آیت شریفہ کے مطابق نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے علماء کو بھی اولوا الامر کا جزو قرار دیا ہے لیکن حقیقت میں اس تفسیر کے مطابق اہل علم باقی طبقاتی نمائندوں کی نسبت مرجع عالی تر اور ناظر کی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ دوسرے کیونکہ علماء اور دانشمند دوسروں کی نسبت یہ بہتر جانتے ہیں کہ کوئی چیز



کتاب وسنت کی نظر سے درست ہے یا نہیں۔ اس بنا پر وہ مرجع اعلیٰ ہوں گے۔ اور یہ مندرجہ بالا تفسیر کے ساتھ موافق نہیں ہے اس بنا پر مذکور تفسیر کئی پہلوؤں سے اشکالات کا سامنا ہے واحد تفسیر جو مذکورہ اعتراضات کی زد میں نہیں آسکتی وہ ساتویں تفسیر ہی ہے (یعنی اولوا الامر سے مراد معصوم رہبر اور آئمہ ہیں) کیونکہ یہ تفسیر اس وجوبِ اطاعت کے اطلاق کے ساتھ ہے جس کا مندرجہ بالا آیت سے پتہ چلتا ہے۔ اور یہ اس کے ساتھ سو فی صد موافقت رکھتی ہے کیونکہ مقام "عصمت" ایسے امام کے ہر خطا، گناہ اور اشتباہ سے محفوظ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ اس لیے اس کا ہر حکم فرمانِ پیغمبرؐ کی طرح کسی قید و شرط کے بغیر واجب الاطاعت ہے اور یہ اس امر کی استعداد رکھتا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت کا ہم ردیف اور ہم پلہ قرار پائے۔ یہاں تک کہ "اطیعوا" کی تکرار کے بغیر اس کا عطف رسولؐ پر ہو۔

ایک قابلِ توجہ بات

بعض مشہور علمائے اہلِ سنت نے بھی جن میں سے مشہور و معروف مفسر فخر الدین رازی بھی ہیں اس آیت کے بارے میں اپنی تحریر کے شروع میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں خداوند عالم جس شخص کی اطاعت کو قطعی طور پر بے چون و چرا لازم قرار دے یقیناً اُسے معصوم ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ معصوم عن الخطا نہ ہوگا تو وہ خطا کرے گا اور خدا تعالےٰ نے اس کی اطاعت لازم قرار دی ہے اور اس کی پیروی خطا کے باوجود ضروری بھی ہے تو اس سے خود حکم خداوند عالم میں تضاد پیدا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو اس عمل کا کرنا حرام ہے اور دوسری طرف اولوا الامر کی اطاعت واجب ہے۔ اس طرح یہ حکم خدا امر و نہی کے اجتماع کا سبب بن جاتا ہے اس لیے کہ ایک طرف تو خداوند عالم نے اولوا الامر کے حکم کی اطاعت کسی شرط اور پابندی کے بغیر واجب قرار دی ہے۔ دوسری طرف اگر اولوا الامر معصوم نہ ہو تو اس قسم کا حکم از روئے عقلِ سلیم ممکن نہیں ہے۔ اس مقدمہ اور تمہید سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں جن اولوا الامر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے انہیں یقیناً معصوم ہونا چاہیے[1]

فخر الدین رازی اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ معصوم یا تو تمام امت ہے یا اس میں سے چند لوگ۔ یہ دوسرے معنی بھی قابلِ قبول نہیں ہیں کیونکہ ضروری ہے کہ ہم ان چند لوگوں کو پہچانیں اور ان تک پہنچ سکتے ہوں جب کہ ایسا نہیں ہے۔ جب یہ احتمال یا شک دور ہو جاتا ہے تو پہلا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ تمام امت معصوم ہے اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اجماع و اتفاقِ امت حجت اور قابلِ قبول ہے اور یہ معتبر اور قابلِ اعتماد دلائل میں شمار کیا جاتا ہے[2]

ہم دیکھ رہے ہیں کہ باوجود اس کے کہ فخر رازی علمی مسائل میں اشکال تراشی کے لیے مشہور ہیں لیکن انہوں نے اس آیت کی اس دلالت کو کہ امام معصوم ہونا چاہیے، بسر و چشم قبول کیا ہے۔ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ مکتب اہلِ بیتؑ اور اس کے معصوم اماموں اور رہبروں سے ناواقف تھے اس لیے انہوں نے اس بات کو قبول نہیں کیا کہ اولوا الامر خدا کے مقرر کیے ہوئے افراد ہونے چاہئیں بلکہ وہ مجبور ہو گئے کہ اولوا الامر تمام امت یا مسلمانوں کے تمام طبقات کے نمائندوں کو قرار دیں حالانکہ یہ معنی کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں کہ اولوا الامر تو وہ ہوگا جو اسلامی معاشرے کا رہبر ہو

---

[1] و [2] تفسیر کبیر از فخر الدین رازی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۴۴، طبع مصر، ۱۳۵۷ھ



تاکہ اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی گوناگوں مشکلات اس کے ناخن تدبیر سے حل ہوتی رہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تمام آراء کا حکومت یہاں تک کہ اس کے نمائندوں کا بھی عملی طور پر اتفاق نہیں ہوسکتا کیونکہ مختلف اجتماعی، سیاسی، ثقافتی، اخلاقی اور اقتصادی مسائل جن سے مسلمانوں کو سابقہ پڑتا ہے ان میں اکثر اوقات تمام امت کا یا ان کے نمائندوں کے اتفاق رائے کا حصول ممکن نہیں ہے اور اکثریت کی پیروی اولوالامر کی پیروی نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس بنا پر فخر رازی اور ہمارے معاصر علماء جو اس کے عقیدے کے پیرو ہیں ان کی گفتگو کا عملی مقصد یہ ہے کہ اولوالامر کی اطاعت عملاً معطل رہے یا ایک استثنائی حیثیت سے باقی رہے۔ ہم مندرجہ بالا تمام بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ صرف اور صرف معصوم پیشواؤں کی رہبری ثابت کرتی ہے جو امت کی چند خاص ہستیوں پر مشتمل ہیں (غور فرمایئے گا)۔

چند سوالات کا جواب

اس موقع پر مندرجہ بالا تفسیر پر کچھ اعتراض ہوئے ہیں۔ بحث میں غیر جانبداری کا خیال رکھتے ہوئے انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اگر اولوالامر سے مراد معصوم امام ہیں تو یہ مفہوم لفظ "اولی" کے ساتھ جو جمع ہے، کوئی مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ اس مفہوم کی صورت میں ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہ ہوگا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہر زمانے میں ایک سے زیادہ معصوم امام نہیں ہوتا لیکن وہ تمام زمانوں میں بہت سے افراد کی تشکیل سیرت اور تعمیر کردار کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آیت ایک زمانے کی ذمہ داری کا تعین نہیں کر رہی ہے۔

۲۔ اولوالامر اس معنی کے مطابق تو پیغمبرؐ کے زمانے میں موجود نہیں تھا تو اس صورت میں اس کی اطاعت کا حکم کس طرح دیا گیا ہے۔ اس کا جواب بھی گذشتہ جواب سے واضح ہوجاتا ہے کیونکہ آیت کسی معین زمانے کے لیے محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کے فرائض کو ہر زمانے کے لیے واضح کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں حضورؐ خود اولوالامر تھے کیونکہ حضرت رسولِ اکرمؐ دو منصب رکھتے تھے ایک منصب رسالت اور تبلیغ احکام جو آیت میں اطیعوا الرسول کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے اور دوسرا منصب امت اسلامی کی رہبری اور سربراہی جس کا ذکر قرآن نے اولوالامر کے نام سے کیا ہے۔ اس لیے پیغمبرؐ کے زمانے میں خود پیغمبر معصوم رہبر و پیشوا تھے اور شاید لفظ "اطیعوا" کا عدم تکرار رسول اور اولوالامر کے درمیان اسی معنی کی طرف اشارے سے خالی نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں منصب رسالت اور منصب اولوالامر مختلف منصب ہیں۔ جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود میں ایک جگہ جمع ہیں لیکن یہ امام میں جا کر الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ اور امام صرف دوسرا (اولوالامر کا) منصب رکھتے ہیں۔

۳۔ اگر واقعی اولوالامر سے مراد معصوم امام اور رہبر ہیں تو پھر کیوں مسلمانوں کے اختلاف اور جھگڑے کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ذٰلک خیر واحسن تاویلا



اگر کسی چیز میں اختلاف پڑ جائے تو اُسے خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو۔ اگر تم خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت ہی اچھا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اولوالامر کا ذکر نہیں ہے اور اختلاف کو دور کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ خدا کی کتاب اور حضرت رسول اکرمؐ کی سنت ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض صرف شیعہ علماء کی تفسیر پر نہیں ہے بلکہ ادنیٰ تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تفاسیر پر بھی اس کی زد پڑتی ہے یعنی یہ اعتراض اہلِ سنت کی تفاسیر پر بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں شک نہیں کہ مندرجہ بالا جملے میں اختلاف و تنازع سے مراد احکام میں اختلاف ہے نہ کہ ان مسائل سے جن کا تعلق حکومت و رہبری کی جزئیات سے ہے کیونکہ ان مسائل میں تو لازماً اولوالامر کی اطاعت کرنا ہوگی جیسا کہ آیت کے پہلے جملے میں وضاحت ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اس اختلاف سے مراد اسلام کے احکام اور قوانین کلی کا اختلاف ہے جن کی تشریع خدا اور پیغمبرؐ سے متعلق ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امام تو احکام جاری کرنے والے ہیں نہ کہ قانون وضع کرنے اور منسوخ کرنے والے۔ امام تو ہمیشہ خدا کے احکام اور سنتِ رسولؐ کے اجرا کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اسی لیے احادیث اہل بیتؑ میں ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص کوئی بات کتاب خدا اور حدیث پیغمبرؐ کے خلاف نقل کرے تو اُسے ہرگز قبول نہ کرو کیونکہ یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم کتابِ خدا اور سنتِ پیغمبرؐ کے خلاف کچھ کہیں۔ اسی لیے احکام و قوانینِ اسلامی میں لوگوں کے اختلافات دور کرنے کا پہلا مرجع خدا اور حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن پر وحی خدا نازل ہوتی ہے۔ اب اگر ائمہ معصومین احکام بیان کرتے ہیں تو وہ خود ان کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ وہ کتاب خدا یا اس علم سے ہیں جو حضرت رسالت مآبؐ کی طرف سے ان تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوالامر کا لفظ اختلافی احکام و مسائل کے حل کرنے والوں میں شامل نہیں ہے[1]

احادیث کی گواہی

اسلامی کتب اور مصادر میں کچھ احادیث موجود ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتی ہے کہ لفظ اولوالامر سے مراد ائمہ اہل بیت ہی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ مشہور اسلامی مفسر ابوحیان اندلسی مغربی (متوفی ۷۵۶ھ) تفسیر بحرالمحیط میں لکھتا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ اور ائمہ اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے[2]

۲۔ عالم اہلِ سنت ابوبکر بن مومن شیرازی رسالۂ اعتقاد میں (مناقب کاشی کے مطابق) ابن عباس سے نقل کرتا ہے کہ آیت مندرجہ بالا

---

[1] اگر اس سورہ کی آیت ۸۳ میں بعض مشکلات کو حل کرنے کے لیے اولوالامر کو مرجع قرار دیا گیا ہے تو اس سے مراد شریعت کے کلی احکام و قوانین کا اختلاف نہیں ہے بلکہ جیسا کہ آیت مذکورہ کی تفسیر میں آئے گا یہ ان مسائل کے بارے میں ہے جو احکام جاری کرنے کے طریقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

[2] بحرالمحیط جلد سوم طبع مصر صفحہ ۲۷۸



حضرت علیؑ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اسلامؐ نے انہیں جنگِ تبوک کے موقع پر اپنی جگہ مدینہ منورہ میں چھوڑا تھا اور حضرت علیؑ نے عرض کیا تھا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں کی طرح شہر میں چھوڑے جاتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا:

"اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ حین قال اخلفنی فی قومی واصلح فقال عزوجل اولی الامر منکم"

"کیا تم پسند نہیں کرتے کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ (برادرِ موسیٰؑ) کو موسیٰؑ سے تھی جبکہ موسیٰؑ نے ان سے کہا تھا کہ تم بنی اسرائیل میں میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کرو۔ اس کے بعد خداوند عالم نے فرمایا: واولی الامر منکم [1]

شیخ سلیمان حنفی قندوزی جو اہلِ سنت کے مشہور عالم ہیں ینابیع المودۃ میں کتاب مناقب میں سلیم بن قیس ہلالی سے نقل کرتے ہیں:

ایک دن ایک شخص حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے پوچھا: کم از کم وہ کونسی چیز ہے جس کے ذریعے انسان مومنین کی صف میں شامل ہو سکتا ہے اور کم از کم وہ کونسی چیز ہے جس سے انسان کافروں یا گمراہ لوگوں میں شمار ہو جاتا ہے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: کم از کم وہ چیز جس کی وجہ سے انسان گمراہوں میں شامل ہو جاتا ہے یہ ہے کہ وہ خدا کی حجت اور نمائندے اور اس کے شاہد و گواہ کو جس کی اطاعت و ولایت ضروری ہے نہ پہچانے۔ اس شخص نے کہا: اے امیر المومنینؑ مجھے ان کا تعارف کرائیے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: وہ وہی ہیں جنہیں خدا نے اپنے پیغمبرؐ کے برابر قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے:

یاایها الذین اٰمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اس شخص نے عرض کیا: میں آپ کے قربان جاؤں مزید وضاحت فرمائیے۔ امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا: جن کا رسول اللہؐ نے مختلف موقعوں پر اور اپنی زندگی کے آخری دن کے خطبہ میں تذکرہ کیا اور فرمایا:

انی ترکت فیکم امرین لن تضلوا بعدی ان تمسکتم بهما کتاب الله وعترتی اهل بیتی

میں تمہارے درمیان دو چیزیں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں اگر تم ان سے تمسک کرو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے خدا کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلِ بیت ہیں [2]

۴۔ نیز یہی عالم کتاب "ینابیع المودۃ" میں لکھتے ہیں کہ صاحب کتاب مناقب نے تفسیر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی [3]

۵ شیعہ کتب کی متعدد روایات جو کافی، تفسیر عیاشی، کتب صدوق وغیرہ میں منقول ہیں، سب کی سب یہ گواہی دیتی ہیں کہ اولوالامر

---

[1] احقاق الحق جلد سوم صفحہ ۴۷۸۔

[2] ینابیع المودۃ طبع استنبول صفحہ ۱۱۷۔

[3] ینابیع المودۃ طبع استنبول صفحہ ۱۱۴۔



سے مراد ائمہ معصومینؑ ہیں۔ یہاں تک کہ بعض میں تو ہر ایک امام کا نام صراحت کے ساتھ مذکور ہے[1]

۶۰۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ○

ترجمہ

۶۰۔ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان (کتبِ آسمانی) پر جو تم پر اور تم سے پہلے نازل ہوئی ہیں ایمان لے آئے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت اور حکام باطل سے فیصلہ کرائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بری طرح گمراہ کردے اور (انہیں گمراہی کے دور دراز راستوں میں پھینک دے)۔

شانِ نزول

مدینۂ منورہ کے ایک یہودی کو ایک منافق سے کسی چیز میں اختلاف تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک شخص کو قاضی کے طور پر چن لیں۔ یہودی چونکہ پیغمبرِ اسلامؐ کی عدالت اور غیر جانبداری پر مطمئن تھا اس لیے اس نے کہا کہ میں تمہارے پیغمبرؐ کے فیصلہ پر رضامند ہوں لیکن منافق نے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی کعب بن اشرف کو چنا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رشوت دے کر اس کی رائے کو اپنی طرف پھیرے گا۔ غرض اس نے اس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کرنے کی مخالفت کی اس پر یہ آیہ شریفہ نازل ہوئی جس میں ایسے افراد کی شدید مذمت کی گئی ہے[2]

بعض مفسرین نے اس آیت کی دوسری شانِ نزول بھی نقل کی ہے اور وہ یہ کہ بعض نو مسلم زمانۂ جاہلیت کی عادت کے مطابق اسلام کی ابتدا میں اپنے مقدمے یہودی علماء یا کاہنوں کے پاس لے جاتے تھے۔ اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں سختی سے منع کیا[3]

---

[1] تفسیر برہان جلد اول آیۂ مذکورہ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

[2] تفسیر مجمع البیان اور اکثر مفسرین نے بھی یہی شانِ نزول نقل کی ہے۔

[3] المنار جلد ۵ صفحہ ۲۲۲۔



تفسیر

طاغوت کا فیصلہ

زیر نظر آیت درحقیقت گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے۔ کیونکہ گذشتہ آیت مومنین کو خدا تعالیٰ، پیغمبر اور اولوالامر کی اطاعت اور کتاب وسنت سے فیصلہ کرانے کی دعوت دیتی ہے اور یہ آیت طاغوت کی اطاعت، پیروی اور اس سے فیصلہ کروانے سے منع کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ طاغوت "طغیان" کے مادہ سے ہے اور یہ لفظ اپنے تمام مشتقات کے ساتھ سرکشی حدود وقیود توڑنے یا ہر اس چیز کے معنی میں جو بغاوت اور سرکشی کا سبب بنے استعمال ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو باطل کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں وہ طاغوت ہیں، کیونکہ انہوں نے حق وعدالت کی خدائی حدود کو توڑ ڈالا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الطاغوت کل من یتحاکم الیہ ممن یحکم بغیر الحق

یعنی جو شخص حق کے خلاف فیصلہ کرے اور لوگ اس کے پاس فیصلہ کرانے کے لیے جائیں وہ طاغوت ہے۔

مندرجہ بالا آیت ان مسلمانوں کو جو اپنے فیصلے کروانے کے لیے ایسے حکام کے پاس جاتے تھے ملامت کرتے ہوئے کہتی ہے: اے رسول! کیا آپ ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمام کتابوں پر جو آپ پر اور آپ سے پہلے نبیوں پر نازل ہوئی ہیں ایمان لے آئے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے جھگڑوں کا فیصلہ طاغوت سے کرواتے ہیں جبکہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہرگز طاغوت کا حکم نہ مانیں (الم تر الی الذین یزعمون انھم اٰمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ) اس کے بعد قرآن مزید اعلان کرتا ہے کہ طاغوت کی طرف توجہ ایک ایسا شیطانی جال ہے جو چاہتا ہے کہ لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹا کر دور دراز کے گمراہی کے راستوں میں پھینک دے (ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالاً بعیدا)۔

واضح ہے کہ مندرجہ بالا آیت دوسری قرآنی آیتوں کی طرح تمام مسلمانوں کو سب زمانوں کے لیے خبردار کرتی ہے کہ حکام باطل کی طرف نہ جاؤ اور طاغوت سے فیصلہ کروانا خدا اور کتب آسمانی پر ایمان لانے کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام سیدھی راہ سے ہٹا کر ٹیڑھے راستوں پر ڈال دیتا ہے جو حق کے راستے سے بہت دور ہیں۔ ایسے فیصلوں کی برائیاں اور خرابیاں انسانوں کے اجتماعی معاملات کو تباہ وبرباد کرنے کے لحاظ سے کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ معاشروں کی پس ماندگی کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے۔

۶۱۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۚ



۶۲۔ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ○

۶۳۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ○

ترجمہ

۶۱ جب ان سے کہا جائے کہ جو خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور پیغمبر کی جانب آؤ تو تم دیکھو گے کہ منافق تمہاری دعوت قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔

۶۲ جب وہ اپنے اعمالوں کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو پھر کیوں تمہارے پاس آکر قسم کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد (دوسروں کے پاس فیصلے جانے سے) نیکی کرنے (اور طرفین نزاع میں) موافقت کروانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

۶۳ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے خدا اُسے جانتا ہے۔ انہیں (سزا دینے سے) نظر انداز کرو اور انہیں وعظ و نصیحت کرو اور عمدہ بیان کے ساتھ ان کے اعمال ان کے گوش گزار کرو۔

تفسیر

طاغوت کے فیصلے کا نتیجہ

طاغوت اور ظالم و جابر فیصلہ کرنے والوں کی طرف جانے سے منع کرنے کے بعد جس کا ذکر گذشتہ آیت میں آچکا ہے اب ان تین آیتوں میں اسی طرح کے فیصلوں کے نتیجے اور وہ حیلے جن سے منافق سہارا لیتے تھے، ان پر تحقیق اور بحث کی گئی ہے چنانچہ خداوند عالم پہلی آیت میں فرماتا ہے: اس قسم کے مسلمان نما لوگ نہ صرف یہ کہ اپنا فیصلہ کروانے کے لیے طاغوت کے پاس جاتے ہیں بلکہ جب انہیں یاد دہانی کروائی جاتی ہے کہ حکم خدا کی طرف پلٹ آؤ اور پیغمبر کا فیصلہ قبول کرو تو وہ پیغمبر کی دعوت سے ڈٹ کر روگردانی کرتے ہیں اور اس کام کو کرنے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ حقیقت میں ان کا طاغوت کی طرف لوٹنا وقتی اور ہنگامی نہیں تھا کہ اس کی یاد دہانی سے اصلاح ہو جاتی بلکہ ان



کا مخالفت کرنا اور اس کام میں ڈٹ جانا ان میں روحِ نفاق کی کار فرمائی اور ایمان کی کمزوری پر روشنی ڈالتا ہے ورنہ وہ پیغمبرؐ کی دعوت سے بیدار ہو جاتے اور اپنی غلطی مان لیتے (واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللّٰہ والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنک صدودًا)۔

اس کے بعد کی آیت میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہی منافق افراد جب اپنے اعمال کے نتیجے میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تو پھر بادلِ ناخواستہ آپ کے پاس آتے ہیں (فکیف اذا اصابتھم مصیبۃ بما قدمت ایدیھم ثم جاؤک)۔

پھر اس موقع پر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا دوسروں کے پاس مقدمے لے جانے سے مقصد نیکی کے سوا اور دعویٰ کرنے والوں کے درمیان موافقت اور صلح کروانے کے کچھ نہیں تھا (یحلفون باللّٰہ ان اردنا الا احسانًا و توفیقًا)۔

یہاں دو نکتوں کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔

پہلا یہ کہ اس مصیبت سے کیا مراد ہے جو انہیں دامن گیر تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ اس سے مراد پریشانیاں، بدبختیاں اور عام مصیبتیں ہوں جو طاغوت سے فیصلہ کروانے کے نتیجے میں انہیں پیش آتی تھیں کیونکہ اس میں شک نہیں کہ اگر جابر اور ظالم لوگوں کے فیصلے سے کوئی فوری فائدہ طرفین میں سے کسی کو ہو جائے تو زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ اس قسم کے فیصلوں کی بقا ظلم اور فساد پھیلنے کا سبب بن جاتی ہے اور اس وجہ سے معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ غرض اس سے لوگ بہت جلد اپنے کاموں کے نتیجوں کو دیکھ لیتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مصیبت سے مراد لوگوں میں منافقوں کی رسوائی اور ذلت ہے یا وہ مصائب ہیں جو خدا کے حکم سے آتے ہیں (مثلاً رنج و غم اور غیر متوقع نقصانات)۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا احسان اور نیکی کرنے سے منافقین کا مقصد فریقِ دعویٰ کے ساتھ نیکی اور احسان ہے یا پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ حسنِ سلوک ممکن ہے کہ ان کی مراد یہ دونوں باتیں ہوں۔

انہوں نے غیروں کے پاس مقدمہ لے جانے کے مضحکہ خیز بہانے بنا رکھے تھے۔ وہ کبھی کہتے تھے کہ پیغمبرؐ کے پاس مقدمہ لے جانا آنحضرتؐ کی شان کے خلاف ہے کیونکہ اکثر طرفین دعویٰ شور و غل مچاتے ہیں اور یہ چیز مقامِ پیغمبرؐ کے سراسر خلاف ہے۔ علاوہ ازیں فیصلہ ہمیشہ ایک طرف کے نقصان پر ہوتا ہے اور یہ فطری طور پر لوگوں کو دشمن بنانے کے مترادف ہے گویا وہ یہ حیلے بہانے کر کے اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا مقصد تو صرف پیغمبر اکرمؐ کی اور طرفین دعویٰ کی خدمت تھی یا یہ کہ اصولی طور پر ہمارا نظریہ تضاد سے نہ تھا بلکہ ہماری نظر تو طرفینِ نزاع میں صلح و صفائی پر تھی۔

لیکن خدا تیسری آیت میں ان کے چہروں سے نقاب اٹھا دیتا ہے اور اس قسم کے جھوٹے بہانوں کو باطل قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے دل کے بھیدوں کو خدا خوب جانتا ہے (اولئک الذین یعلم اللّٰہ ما فی قلوبھم) خداوند عالم اس کے باوجود پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیتا ہے کہ انہیں سزا دینے سے چشم پوشی فرمایئے (فاعرض عنھم) اسی لیے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے پر جہاں تک ممکن تھا نرمی فرماتے تھے کیونکہ آپؐ ظاہر پر مامور تھے اور انہیں غیر معمولی جرم کے سوا سزا نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی صفوں میں دکھائی دیتے تھے اور ممکن تھا



کہ ان کو سزا ایک قسم کا انتقام سمجھی جائے۔ اس کے بعد حکم دیتا ہے کہ انہیں وعظ و نصیحت کیجئے اور عمدہ بیان سے ان کے دلوں پر اثر ڈالیے اور ان کے اچھے اعمال کے خوشگوار نتائج ان کو بتائیے (وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولا بلیغا)۔

۶۴۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ○

ترجمہ

۶۴۔ ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ حکم خدا سے اس کی اطاعت کی جائے اگر یہ مخالفت کرنے والے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں (خدا کے حکم کو پاؤں تلے روندتے ہیں) آپ کے پاس آتے اور خدا سے مغفرت مانگتے اور پیغمبر بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو وہ خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

تفسیر

قرآن نے گذشتہ آیات میں ظالم حکام اور قاضیوں کی طرف جانے کی مذمت کی ہے۔ اس آیت میں تاکید کے طور یہ فرمایا ہے کہ جن پیغمبروں کو ہم بھیجتے ہیں وہ سب کے سب اس لیے ہیں تاکہ حکم خدا سے ان کی اطاعت کی جائے اور ان کی کسی قسم کی مخالفت نہ ہونے پائے (وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله) کیونکہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور حکومت الٰہیہ کے رئیس بھی تھے اس لیے لوگوں کا فرض تھا کہ وہ خدا کے احکام کے بیان اور ان کی تکمیل میں ان کی پیروی کریں اور صرف ایمان کا دعویٰ کرنے پر قناعت نہ کریں۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ سب لوگ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ اگر بعض لوگوں نے اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اطاعت نہیں کی تو یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے۔

بنا بریں مندرجہ بالا آیت جبریوں کے اس عقیدے کی نفی کرتی ہے کہ کچھ لوگ شروع سے ہی اطاعت پر اور بعض عصیان و نافرمانی پر مامور تھے۔

ضمنی طور پر باذن اللہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ خدا کے پیغمبروں کے پاس تھا وہ خداوند عالم کی طرف سے تھا یعنی ان کی اطاعت کا وجوب بالذات نہیں ہے بلکہ وہ خداوند عالم کے فرمان سے اور اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں گنہگاروں اور ان لوگوں کے لیے جو طاغوت کی طرف آتے جاتے ہیں یا اور کسی صورت میں گناہ کر چکے ہیں، واپسی کی راہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے: جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا اگر وہ آپ کے پاس آجاتے اور خدا سے بخشش طلب کرتے اور پیغمبر بھی ان



کے لیے طلبِ مغفرت کرتے تو خداوند عالم کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاءوك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ بجائے اس کے کہ قرآن کہتا کہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور ظالم حاکموں کی طرف گئے ہیں فرماتا ہے: اذ ظلموا انفسهم۔ یعنی جب انہوں نے اپنے پر ظلم کیا۔ مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم اور پیغمبر کی اطاعت میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے اور ان کی مخالفت اپنے آپ پر ہی ظلم ہے کیونکہ یہ تمہاری مادی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے اور حقیقت میں معنوی طور پر تمہاری پس ماندگی کا سبب ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کے لیے بھی واضح جواب ہے جو پیغمبرؐ اور امامؑ کے وسیلے کو ایک قسم کا شرک جانتے ہیں کیونکہ یہ آیت صراحت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ بارگاہِ پیغمبر میں آنا اور انہیں بارگاہ رب العزت میں شفیع قرار دینا اور ان کے وسیلہ اور ان کی جانب سے دعائے مغفرت توبہ کی قبولیت اور رحمت الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ اگر پیغمبرؐ کا واسطہ، دعا، استغفار اور شفاعت شرک ہوتے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ خدا گناہگاروں کو اس طرح کا حکم دیتا۔ البتہ گناہگاروں کو چاہیے کہ وہ پہلے توبہ کریں اور گناہوں کو ترک کر دیں اس کے بعد اپنی توبہ کی قبولیت کے لیے رسول اکرمؐ سے فیض حاصل کریں۔

واضح ہے کہ پیغمبر خود گناہ معاف نہیں کرتے بلکہ وہ صرف خدا سے مغفرت طلب فرماتے ہیں اور یہ آیت ان لوگوں کے اعتراض کا دندان شکن جواب ہے جو اس قسم کی وساطت اور وسیلے کا انکار کرتے ہیں (غور فرمائیے گا) یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں فرماتا کہ تم ان کے لیے طلبِ مغفرت کرو بلکہ کہتا ہے کہ رسولؐ ان کے لیے استغفار کریں۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسول اکرمؐ اپنے مقام اور مرتبے سے انہیں فائدہ پہنچائیں اور توبہ کرنے والے گناہگاروں کے لیے طلبِ مغفرت فرمائیں۔ یہ معنی (یعنی پیغمبر کی طلبِ مغفرت کا مومنین کے لیے کارگر ہونا) قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے مثلاً سورۂ محمدؐ کی آیت ۱۹، سورۂ منافقون کی آیت ۵ اور سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۴۔

حضرت ابراہیمؑ کے اپنے چچا کے لیے استغفار کرنے کے متعلق اور دیگر آیات جو مشرکوں کے لیے استغفار سے منع کرتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ مومنین کے لیے استغفار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نیز بعض آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض گناہگار مومنین کے لیے فرشتے بھی بارگاہِ رب العزت میں طلبِ مغفرت کرتے ہیں مثلاً سورۂ غافر آیت ، اور سورۂ شوریٰ آیت ۵۔

غرضیکہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس مفہوم و معانی کا تذکرہ کرتی ہیں کہ پیغمبر، فرشتے یا پاکدل مومن بعض گناہگاروں کے لیے استغفار کرتے ہیں اور ان کی دعا بارگاہ خدا میں اثر رکھتی ہے۔ یہ بات پیغمبر، ملائکہ اور پاک دل مومنین کی طرف سے گناہگاروں کی شفاعت کا معنی بھی دیتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایسی شفاعت کے لیے خطا کاروں میں خود بھی قابلیت اور استعداد ہونا چاہیے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ کچھ مفسرین کے بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ آیتِ مندرجہ بالا میں پیغمبر اکرمؐ کے استغفار کو آپؐ کی ذات تک محدود رکھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم و ستم کیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ ان کی رضامندی حاصل کریں۔ تاکہ خدا تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے۔ لیکن واضح ہے کہ پیغمبرؐ کے غیر سے فیصلہ کروانا

صرف پیغمبرؐ پر ظلم نہیں ہے بلکہ اس کے خاص منصب کی مخالفت بھی ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا کے فرمان کی مخالفت ہے اگر یہ فرض کرلیں کہ یہ ذات پیغمبرؐ پر ظلم تھا تب بھی قرآن نے اس کا سہارا نہیں لیا بلکہ قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ ان کا طرزِ عمل فرمانِ خدا کے خلاف تھا۔

علاوہ ازیں اگر ہم کسی پر ظلم کریں تو اس کا رضامند ہو جانا کافی ہے اور بارگاہِ خداوندی میں استغفار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بالفرض اگر آیت کی یہ تفسیر کریں تو باقی ان سب آیتوں کے بارے میں جو پیغمبرؐ، فرشتوں اور مومنین کے استغفار کو گناہگاروں کے حق میں موثر قرار دیتی ہیں کیا کہیں گے۔ کیا وہاں بھی شخصی حقوق تھے۔

۶۵۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○

ترجمہ

۶۵ تیرے پروردگار کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ کو حکم اور فیصلہ کرنے والا مانیں اور پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضگی محسوس نہ کریں بلکہ اسے مکمل طور پر تسلیم کرلیں۔

شانِ نزول

زبیر بن عوام جو مہاجرین میں سے تھے ان کا ایک انصاری کے ساتھ (جو مدینہ کے مسلمانوں میں سے تھا) ان باغوں کے سیراب کرنے کے متعلق جو ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے اختلاف ہو گیا۔ دونوں حضرات اپنے جھگڑے کا فیصلہ کروانے کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ زبیر کا باغ نہر کے بلند حصّہ کی طرف تھا اور انصاری کا باغ نشیب میں تھا۔ اس لیے حضرت رسول اکرمؐ نے زبیر کو حکم دیا کہ پہلے تم اپنے باغ کو پانی دے لو اور اس کے بعد یہ انصاری مسلمان پانی دے (یہ اس رواج کے مطابق تھا۔ جو ایک دوسرے کے قریب باغوں کے بارے میں تھا) لیکن وہ انصاری جو بظاہر مسلمان تھا پیغمبر اکرمؐ کے عادلانہ فیصلے سے ناراض ہو کر کہنے لگا: کیا آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ زبیر آپ کی پھوپھی کا بیٹا ہے؟ حضورؐ کو اس کی اس گفتگو سے تکلیف پہنچی یہاں تک کہ آپ کے چہرے کا رنگ دگرگوں ہو گیا۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس میں ایسے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی۔

بعض دوسری اسلامی تفسیروں میں اس کے علاوہ اور شانِ نزول کا بھی ذکر ہے۔ جو بیان کی گئی شانِ نزول سے تھوڑے بہت ملتے جلتے ہیں [1]

---

[1] تفسیر تبیان، طبری اور المنار۔



اگر ایک گروہ خدا کی عبادت کرے نماز پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے لیکن ان کاموں کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیے ہیں بُرا سمجھے یا یوں کہے کہ اگر فلاں کام نہ کیا ہوتا تو بہتر تھا، وہ دراصل حقیقی مومن نہیں ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

تم پر لازم ہے کہ خدا اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔

آیت مندرجہ بالا سے ضمنی طور پر دو اہم مطلب معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ یہ آیت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام احکامات کی گفتار و کردار میں مطلق اور کامل طور پر پذیرائی یہاں تک کہ دلی طور پر ان کے آگے جھکنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو احکام خداوندی اور اپنے فیصلوں میں نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور نہ آپ جان بوجھ کر خلاف حق کہتے یا کرتے ہیں۔ لہٰذا آپؐ خطا سے بھی معصوم ہیں اور گناہ سے بھی۔

۲۔ آیت مندرجہ بالا نصِ پیغمبرؐ کے مقابلے میں اجتہاد اور ایسے مسائل میں جن کے بارے میں خدا و رسولؐ کی طرف سے حکم صریح ہو، اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کی نفی کرتی ہے۔ لہٰذا اگر تاریخ اسلام ہمیں یہ بتائے کہ بعض لوگ خدا و پیغمبر کے حکم کے مقابلے میں اجتہاد، اظہار رائے اور اظہار عقیدہ کیا کرتے تھے مثلاً یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے اس طرح کہا ہے اور میں یہ کہتا ہوں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان کا عمل مندرجہ بالا آیت کی صراحت کے بالکل خلاف ہے۔

۶۶۔ وَلَوْ أَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ أَوِ اخْرُجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ ۖ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا مَا يُوعَظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيتًا ۝

۶۷۔ وَإِذًا لَآتَيْنَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۝

۶۸۔ وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝

ترجمہ

۶۶۔ (ہم نے کوئی مشکل فرض ان کے کاندھوں پر نہیں ڈالا) اگر (بعض گذشتہ امتوں کی طرح) انہیں بھی ہم حکم دیتے کہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنے وطن سے نکل جائیں تو بہت تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے اور اگر وہ ان نصیحتوں پر چلتے تو ان کے فائدہ میں تھا کیونکہ ایسا کرنا ان کے ایمان کی تقویت کا سبب بنتا۔



٦٧ اور اس صورت میں ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑی جزا اور ثواب عطا فرماتے۔

٦٨ اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت کرتے۔

تفسیر

یہاں گذشتہ بحث کی تکمیل کی گئی ہے جو ان لوگوں کے متعلق تھی جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عادلانہ فیصلوں پر چیں بر جبیں ہوتے تھے۔ گذشتہ امتوں کے تکلیف دہ اور سخت احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے کوئی مشکل فرض ان کے کندھوں پر نہیں رکھا۔ اگر ہم گذشتہ امتوں کی طرح (مثلاً یہودی کہ جنہیں ان کی بت پرستی اور گوسالہ پرستی کے بعد یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس عظیم گناہ کے کفارہ میں ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنے عزیز وطن کو چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں) انہیں بھی اس قسم کا سخت حکم دیتے تو اس کو کس طرح بجا لاتے یہ تو ایک باغ کی آبیاری کے بارے میں بھی پیغمبر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو پھر یہ دوسری آزمائشوں پر کس طرح پورا اتر سکتے ہیں مسلم ہے کہ اگر انہیں اس قسم کا حکم دیتے کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا وطن چھوڑ دیں تو بہت کم لوگ اس پر عمل کرتے (ولو کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم)۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ قتل کے لیے آمادگی اور وطن سے نکلنے کی تیاری کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں کیونکہ بدن انسانی روح کا وطن ہے اور ایک اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح وہ ملک کہ جس میں ہم رہتے ہیں جسم انسانی کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے جسم کے وطن کو چھوڑنا انسان کے لیے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ انسان کی پیدائش اور رہنے کی جگہ ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: اگر وہ خدا و رسولؐ کے پند و نصائح قبول کرلیں تو اس میں خود ان کا بھی فائدہ ہے اور ان کے ایمان کی تقویت کا سبب بھی ہے (ولو انھم فعلوا ما یوعظون بہ لکان خیرا لھم واشد تثبیتا)۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہاں خداوند عالم کے احکام کو وعظ و نصیحت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ احکام ایسے نہیں ہیں جن سے حکم دینے والے (خداوند عالم) کو ذرہ بھر فائدہ پہنچے۔ بلکہ حقیقت میں وہ ایسی نصیحتیں ہیں جو خود تمہارے نفع میں ہیں اس لیے بلا فاصلہ فرماتا ہے: ان کی اطاعت بھی تمہارے لیے منفعت بخش ہے اور تمہارے ایمان کی تقویت کا موجب بھی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ آیت کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ جس قدر انسان خدا کے حکم کی اطاعت کی راہ میں قدم بڑھائے اس قدر اس میں ثبات اور استقامت پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں خدا کے فرمان کی اطاعت ایک روحانی ورزش ہے جس کا لگاتار عمل جسمانی ورزش کی طرح روز بروز قوت، قدرت، ثبات اور استحکام میں اضافہ کرتا رہتا ہے اس طرح آہستہ آہستہ انسان ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ کوئی طاقت اس کے ایمان کی قوت پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتی اور نہ اُسے دھوکا دے سکتی ہے۔

اس کے بعد والی آیت میں خدا کے سامنے تسلیم و اطاعت کا تیسرا فائدہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: اس وقت (علاوہ اس کے جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے) انہیں عظیم اجر و ثواب بھی دیں گے (و اذا لاٰتیناھم من لدنا اجرا عظیما)۔

زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں چوتھے فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم انہیں سیدھی راہ کی ہدایت



کریں گے (لھدیناھم صراطا مستقیما)۔

واضح ہے کہ اس ہدایت سے مراد اصل دین وآئین کی ہدایت نہیں ہے بلکہ یہ نئے الطافِ الہٰی ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے ہدایت ثانوی کی صورت میں اور اجر و ثواب کے طور پر ایسے اہل افراد کو دیئے جائیں گے یہ اس طرح ہے جیسے سورۂ محمد کی آیت، میں اشارہ کیا گیا ہے:

"والذین اھتدوا زادھم ھدی"

جو ہدایت کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں خداوند عالم ان کی زیادہ ہدایت کرتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب آیت ولوانا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم نازل ہوئی تو ایک مومن نے کہا: خدا کی قسم اگر اس قسم کے سخت حکم ہمیں دیئے جاتے تو ہم یقیناً ان کی تعمیل کرتے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس قسم کے احکام سے اس نے معاف رکھا۔ جب یہ گفتگو پیغمبر اکرمؐ تک پہنچی تو حضورؐ نے فرمایا:

"ان من امتی لرجالا الایمان اثبت فی قلوبھم من الجبال الرواسی"

میری امت کے بعض لوگ ایسے ہیں کہ جن کے دلوں میں ایمان مستحکم و مضبوط پہاڑوں سے زیادہ راسخ ہے[1]

۶۹۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ○

۷۰۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ○

ترجمہ

۶۹ جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (قیامت کے دن) ایسے لوگوں کا ساتھی ہوگا جن پر خدا نے اپنی نعمت تمام کردی ہے اور وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صلحاء میں سے ہیں اور وہ بہترین رفیق ہیں۔

۷۰ یہ خداوند عالم کا فضل و کرم ہے اور یہ بات کافی ہے کہ وہ (بندوں کے حالات، نیتوں اور اعمال سے) آگاہ ہے۔

شانِ نزول

ثوبان رسول اللہ کا ایک صحابی تھا وہ حضورؐ سے بہت الفت و محبت رکھتا تھا۔ ایک دن نہایت پریشانی کے عالم میں آپ

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۲ صفحہ ۴۹۴۔



کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس سے پریشانی کا سبب دریافت فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ جب میں آپ سے جدا ہوتا ہوں اور آپ کو نہیں دیکھتا تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ آج میں اس فکر میں غوطہ زن تھا کہ کل قیامت کے دن اگر میں اہلِ بہشت میں سے ہوا تو یہ مسلم ہے کہ میں آپ کے درجے میں تو نہیں ہوں گا اس وجہ سے آپ کو تو کبھی نہ دیکھ سکوں گا اور اگر اہلِ جنت میں سے نہ ہوا تو پھر بھی زیارت سے محروم رہوں گا بنا بریں ہر دو صورت میں آپ کی حضوری کے شرف سے مشرف نہ ہو سکوں گا۔ پھر ان حالات میں میں کیسے پریشان نہ ہوں۔ اس وقت مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسے لوگوں کو بشارت دی گئی کہ مطیع اور فرمانبردار افراد جنت میں بھی انبیاء اور بزرگانِ دین کے ساتھی ہوں گے۔ اس کے بعد حضرت رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم کسی مسلمان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات، ماں باپ اور تمام رشتہ داروں سے زیادہ دوست نہ رکھے اور میری بات کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے۔

تفسیر

جنت کے ساتھی

اس آیت میں ان لوگوں کا ایک اور افتخار و اعزاز بیان کیا گیا ہے جو خداوند عالم اور اس کے رسول کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور حقیقت میں ان خصوصیات و امتیازات کی تکمیل کرتا ہے جن کا ذکر گزشتہ آیتوں میں ہو چکا ہے۔

(ومن یطع اللّٰہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم ......)

جیسا کہ سورۂ الحمد کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ جو لوگ اس نعمت کے حامل ہیں وہ ہمیشہ صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے ہیں اور کم سے کم گمراہی اور روگردانی بھی نہیں کرتے۔ اس کے بعد خداوند عالم نے اس جملہ کی وضاحت اور ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل فرمائی ہے چار قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو حقیقتاً اس موضوع کے چار رکن ہیں۔

۱۔ خدا کے مخصوص بھیجے ہوئے انبیاء جو لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے صراطِ مستقیم کی طرف سب سے پہلے اپنا قدم بڑھاتے ہیں (من النبیین)۔

۲۔ "سچ بولنے والے" وہ لوگ جو بات کے سچے ہوتے ہیں اور اپنے عمل اور کردار سے اپنی بات کی سچائی کو ثابت بھی کرتے ہیں اور اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ ایمان کے دعوئ دار ہی نہیں ہیں بلکہ واقعی خدا کے احکام پر ایمان بھی رکھتے ہیں (والصدیقین)۔

اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ مقامِ نبوت کے بعد صدق و راست گوئی سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں ہے صرف گفتار کی سچائی نہیں بلکہ عمل و کردار کی پاکبازی بھی جس میں امانت و اخلاص بھی شامل ہیں کیونکہ امانت دراصل عمل میں صداقت کا دوسرا نام ہے جیسا کہ راست گوئی گفتار میں امانت ہے اسی طرح کوئی برائی کفر کے بعد جھوٹ، نفاق اور سخن و عمل میں خیانت سے بدتر نہیں ہے (یاد رکھیے کہ صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں سراپا راستی اور درستی)۔ بعض روایتوں میں صدیق سے حضرت امیر المومنین اور ائمہ اہلِ بیتؑ مراد لیے گئے ہیں جیسا کہ ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی تفسیر آیات کے روشن اور عالی مصادیق



بیان کرتی ہے نہ کہ آیت کا مفہوم اس میں منحصر ہے۔

۳۔ "شہدا" پاکیزہ الٰہی عقیدہ اور مقصد کی راہ میں قتل ہونے والے یا منتخب نیک لوگ جو قیامت کے دن انسانوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے (والشھداء)[1]

۴۔ "صالحین" علم و عمل کے لحاظ سے لائق اور شائستہ افراد جو مثبت اصلاحی اور مفید کام کرنے کی وجہ سے اور انبیاء کے احکام کی پیروی کرکے بلند مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں (والصالحین)۔

اسی بنا پر شیعہ روایات میں لفظ صالحین کی تفسیر ائمہ معصومین کے برگزیدہ اصحاب کے ساتھ کی گئی ہے اور یہ بھی جیسا کہ "صدیقین" کے بارے میں گزر چکا ہے نیک اور لائق افراد کی ایک مثال ہیں۔ جس نکتے کو اس مقام پر یاد دلانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان چاروں مرحلوں کا ذکر اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک صحیح و سالم اور شائستہ انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے سب سے پہلے رہبران حق اور انبیاء میدانِ عمل میں آئیں اور ان کے پیچھے پیچھے مبلغ جن کا قول و عمل ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور اپنے مقاصد کی ہر جگہ نشر و اشاعت کریں۔ اس فکری اصلاح کے دور کے بعد ایک گروہ برے لوگوں خصوصاً ان لوگوں کے مقابلے کے لیے نکلے جو خدا کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ گروہ راہ حق میں قربانی دے اور شہادت پیش کرے۔ انہی کی کوششوں اور جد و جہد کے نتیجہ میں صالحین اور پاک و شائستہ افراد پر مشتمل معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔ واضح ہے کہ صالحین بھی آئندہ نسلوں کے لیے مشعل حق روشن رکھنے کے لیے یہ تینوں فرائض انجام دیں گے رہبری اور تبلیغ کریں گے نیز قربانی دیں گے۔

ان آیتوں سے ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی خوب واضح ہوتی ہے کہ اچھی معاشرت رکھنے والے بے مثل ساتھی اس قدر اہم ہیں کہ عالم آخرت میں بھی جنت کی نعمتوں کی تکمیل کے لیے اطاعت گزاروں کو اس عظیم نعمت سے نوازا جائے گا دوسرے افتخارات اور اعزازات کے علاوہ وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی رفاقت بھی حاصل کریں گے۔

اطاعت گزاروں کے ان چاروں گروہوں سے میل جول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مقام و مرتبہ میں ان کے برابر ہوں گے بلکہ ایک دوسرے سے معاشرت رکھنے کے باوجود ان میں سے ہر ایک اپنے مرتبہ کے مطابق خداوند عالم کے فضل و کرم کا مستحق ہوگا جیسے درخت، پھول اور سبزہ اگرچہ ایک دوسرے کے آس پاس ہوتے ہیں اور سورج کی روشنی اور بارش سے فیض یاب ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا مستفید ہونا ان کی قدر و قیمت اور استعداد کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتا۔

آیت میں اس امتیازِ عظیم (منتخب افراد کی ہم نشینی) کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ خداوند عالم کا خاص فضل و کرم ہے اور وہ بندوں کی حالتوں، نیتوں، لیاقتوں اور قابلیتوں سے خوب آگاہ ہے (ذٰلک الفضل من اللہ وکفٰی باللہ علیما)۔ البتہ "ذٰلک" جو بعید کا اسم اشارہ ہے اس قسم کے مقامات پر اہمیت اور مرتبہ کی بلندی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہم آیت مندرجہ بالا سے نیک فال سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ سپاس بے قیاس اس پروردگار کے لیے ہے کہ باوجود ان تمام

---

[1] شہید اصل میں گواہ کے معنی میں ہے۔ البتہ کبھی انسان صرف زبان سے حق کی گواہی دیتا ہے اور کبھی عملی طور پر بلند اور پاکیزہ مقاصد کی راہ میں جان دے کر گواہی دیتا ہے۔



رکاوٹوں کے جو نیک کام کرنے والوں کے راستہ میں حائل ہوا کرتی ہیں، خاص لطفِ الٰہی سے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد بأحسن اس مقام اختتام کو پہنچ گئی ہے۔

ذلك الفضل من الله وكفى بالله عليما۔

خدایا بطفیل محمد وآلِ محمد ہماری نیتوں کو پاک اور ہمارے اعمال کو پر خلوص بنادے۔

تفسیر نمونہ جلد سوم ختم ہوئی



اصول و عقائد

احکام







شخصیات



علماء و دانشور

کتب سماوی

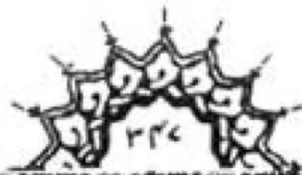
کتب سیر، تاریخ و تفاسیر



لغاتِ قرآن

۱ آناء در اصل انا (بروزن وفا) کی جمع ہے





انسان پر ملال ہو — ۲۴۰

خ خبال۔ کسی چیز کا نیست و نابود ہونا — ۶۴

د درک۔ بروزن "مرگ" نیچے کی طرف جانے والی سیڑھیاں — ۱۲۰

ذ ذرہ۔ جسم کا بہت ہی چھوٹا حصہ۔ ایٹم، مسالہ — ۲۸۱

ر رابطو۔ مادہ "رباط" کسی چیز کو کسی مکان میں باندھنا۔ اسی لیے سرائے کو رباط کہتے ہیں — ۱۶۴

راعنا۔ مادہ "رعی" ہم سے مراعات کیجئے۔ مادہ "رعونت" ہمیں بے وقوف بنایئے — ۲۹۱

ربیون۔ ربی (بروزن ملی) کی جمع ہے اور ربی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا خدا سے مضبوط اتصال ہو — ۹۸

رقیب۔ بلند جگہ سے حالات کا جائزہ لینے والا۔ محافظ و نگہبان — ۱۸۴

ز زناشوئی۔ ازدواج — ۲۵۰

س سارعوا۔ سارعت سے ہے مقصد تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنا — ۸۰

سعیر۔ بھڑکتی ہوئی آگ — ۲۰۷

سفیہ۔ سفہ (بروزن تبہ) بدن کا ہلکا ہونا۔ توازن برقرار نہ رہنا — ۱۹۷

سیصلی۔ مادہ "صلی" (بروزن درد) آگ میں داخل ہونا۔ جلنا — ۲۰۷

ش شجر۔ درخت — ۳۲۹

شہداء۔ سے مراد گواہ بھی ہے — ۹۲

شہید۔ بمعنی گواہ۔ کبھی زبان سے شہادت دیتا ہے اور کبھی جان دے کر حق کی گواہی دیتا ہے۔ — ۳۲۱

ص صابروا۔ مصابرہ مفاعلہ کے باب سے ہے۔ دوسروں کے صبر کے مقابلہ میں صبر و استقامت دکھانا — ۱۷۳

صبر۔ استقامت — ۹۹

صدقاتھن۔ صداق کی جمع۔ صداق بمعنی مہر — ۱۹۴

صر۔ ہوا کی شدت و سختی۔ خواہ ہوا گرم ہو یا سرد — ۶۲

صلی (بروزن مرد) جھلسنا۔ جلنا — ۲۵۸

ط طاغوت۔ بت۔ جابر و متکبر حاکم — ۳۰۱

طمس۔ کسی چیز کے آثار کو مٹا دینا۔ عمارت کو چٹیل میدان بنا دینا۔ کنایۃً ایسی چیز جس کا اثر و خاصیت ختم ہو جائے — ۲۹۳

طول۔ توانائی۔ رسائی۔ مالی وسائل (بروزن نوع) — ۲۵۱

ظ ظلیل۔ مادہ ظل بمعنی سایہ — ۳۰۷

ظہارہ۔ اوپر کا لباس۔ لباس ظاہری — ۶۴

ع عرق النساء۔ ایک اعصابی بیماری جس میں کمر اور پاؤں کی تکلیف کے باعث چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی ہے — ۲۸

عزم۔ پختہ ارادہ، محکم و مضبوط چیز کو بھی عزم کہتے ہیں — ۱۵۳

عفت۔ (بروزن سند) ٹوٹی ہوئی ہڈی کے جوڑ کا پھر سے ٹوٹنا۔ مراد سخت تکلیف و اذیت — ۲۵۳

عول۔ زیادتی اور بلندی۔ وراثتی حصے بڑھ جانے کی صورت میں حصوں میں کمی کرنا — ۲۲۳

ف فاحشہ۔ فحش یا فحشاء سے ہے بہت ہی برا عمل — ۸۵

فتیل۔ مادہ "فتل" بہت ہی باریک دھاگہ جو کھجور کی گٹھلی میں دکھائی دیتا ہے — ۲۹۷

فخور۔ مادہ فخر بمعنی غرور گھمنڈ — ۲۷۷

فور۔ دیگ کا ابال۔ تیزی سے انجام پانے والا





متفرق موضوعات





کامیابی کا ایک راستہ

کفر

گزشتہ تاریخ

گناہ کبیرہ وصغیرہ

مشورہ

موت

یتامے



مقامات

مقربین - بارگاہِ خدا

